زن، زر اور زمین کے تنازعوں میں جنم لینے والے مقدمات

# آئینہ خانہ

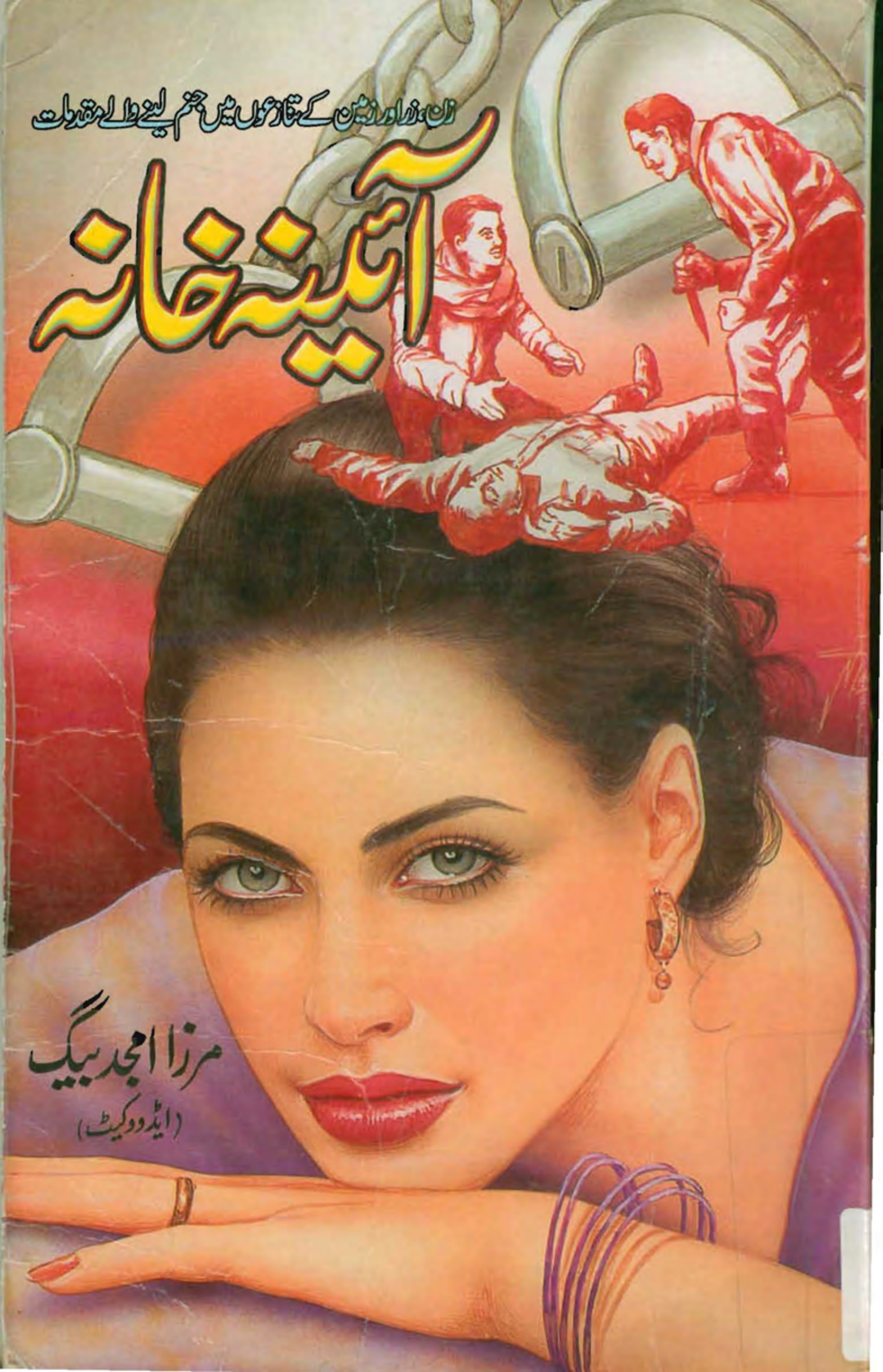

مرزا امجد بیگ
(ایڈووکیٹ)

قانونی پیچیدگیاں، عدالتی کارروائی کے اہم رموز و نکات
زن، زر اور زمین کے تنازعوں میں جنم لینے والے مقدمات

# آئینہ خانہ

ون اردو ڈاٹ کام

راوی: مرزا امجد بیگ
تحریر: حسام بٹ

اسٹاکسٹ:-
مکتبہ القریش ◎ سرکلر روڈ
اردو بازار۔ لاہور۔ فون: 7668958
E.mail: al_quraish@hotmail.com

# صبح کا بھولا

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ دولت سے ہر چیز خریدی جا سکتی ہے۔ گواہ، وکیل اور جج سب بکاؤ مال ہیں۔ سب کا اپنا اپنا نرخ ہے۔ آپ جسے چاہیں خرید سکتے ہیں اور اپنی مرضی کے مطابق ان سے کام نکلوا سکتے ہیں۔ وکیل کو اس کے مطالبے کے مطابق رقم ادا کر کے آپ جھوٹ کو سچ اور سچ کو جھوٹ ثابت کر سکتے ہیں۔ اسی طرح جج کو تگڑی رقم کا نذرانہ پیش کر کے آپ اپنی خواہش کے مطابق فیصلہ لے سکتے ہیں۔ گواہوں کی تو خیر بات ہی چھوڑیں۔ بیس تیس روپے میں کسی بھی ضمیر فروش شخص سے جھوٹی گواہی دلوا لیں۔ پولیس والوں کے بارے میں بھی لوگوں کی اکثریت کم و بیش اسی قسم کے خیالات رکھتی ہے۔

پولیس والوں کی تو پولیس والے ہی جانیں مگر وکیلوں اور ججوں کے بارے میں لوگوں کی اس رائے سے میں اختلاف کرتا ہوں۔ یہ رائے کسی بھی طور صحت مند کہلائے جانے کے قابل نہیں ہے۔ ممکن ہے ایک آدھ کیس میں اس قسم کی صورت حال پیش آ جاتی ہو مگر عموماً اس کا کوئی وجود نہیں ہے۔ اس طرح کی لغو باتیں وہی لوگ کرتے ہیں جو قانون کی پیچیدگیوں اور انصاف کے تقاضوں سے واقف نہیں ہوتے۔ کسی بھی معاملے کی تہ میں اتر کر حقیقت حال جاننے کے بجائے وہ ظاہری اور فروعی باتوں کو ہی سب کچھ سمجھ لیتے ہیں اور نہ صرف خود، خواہ مخواہ بدگمانی کا شکار ہو جاتے ہیں بلکہ دوسروں کو بھی بدگمان کرتے ہیں۔

قانون پیچیدہ ضرور ہے مگر اندھا، بہرا اور گونگا نہیں ہے۔ انصاف کے تقاضے پورے ہونے میں دیر تو لگ سکتی ہے لیکن اس کی بھی متعدد وجوہات ہوتی ہیں۔ خصوصاً

دیوانی مقدمات میں انصاف کے حصول کیلئے جوان بوڑھے اور بوڑھے مرحوم ہو جاتے ہیں لیکن مقدمہ ختم ہونے کا نام نہیں لیتا۔ اسی طرح فوج داری مقدمات میں بھی بعض اوقات ایسی پیچیدگیاں پیدا ہو جاتی ہیں کہ بظاہر سیدھا سادھا نظر آنے والا مقدمہ سالوں کھنچ جاتا ہے۔

اس طویل تمہید کے بعد میں اصل واقعے کی طرف آتا ہوں۔

ایک روز میں عدالت سے ذرا جلدی فارغ ہو گیا تھا۔ جب میں دفتر پہنچا تو بارہ ساڑھے بارہ بجے کا وقت تھا۔ وہ گرمیوں کا موسم تھا اور اس وقت اچھی خاصی دھوپ ہو رہی تھی۔ انتظار گاہ میں اس وقت صرف ایک "ہیوی ڈیوٹی" قسم کی خاتون براجمان تھی۔ میں اپنے چیمبر میں جا کر بیٹھا ہی تھا کہ میری سیکریٹری شیریں نے منتظر خاتون کو اندر بھیج دیا۔

اس کی عمر لگ بھگ چونتیس پینتیس سال تھی۔ اس کے گھونگریالے بال شانوں تک کٹے ہوئے تھے۔ واللہ اعلم' اس کے بال قدرتی گھونگریالے تھے یا کسی بیوٹر پارلر کا کمال تھا۔ اس نے ایک قیمتی بنارسی ساڑھی زیب تن کر رکھی تھی جو اس کے بے کراں وجود پر کسی بھی طور سوٹ نہیں کر رہی تھی۔ یوں دکھائی دیتا تھا جیسے کسی بہت بڑے ڈھول کو قیمتی چمک دار کپڑے میں لپیٹ دیا گیا ہو۔ اس کا رنگ خطرناک حد تک سیاہ تھا' چہرے کے نقوش بھی غیر متناسب تھے۔ آپ اسے ماضی کی پاکستانی اداکارہ چن چن کا تازہ ایڈیشن سمجھ لیجئے۔

تاہم اس کا رکھ رکھاؤ ظاہر کرتا تھا کہ وہ کسی کھاتے پیتے خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔ مجھے اس کے سراپا میں کوئی غیر معمولی بات محسوس ہوئی تھی۔ یہ ایک فوری تاثر تھا جو میرے دل میں بیدار ہوا تھا۔ اس وقت چونکہ میرا ذہن بہت مصروف تھا لہٰذا میں اس طرف زیادہ دھیان نہیں دے سکا۔

اس نے اپنا ہینڈ بیگ اور چابیوں کا گچھا میز پر رکھا اور ایک کرسی کھینچ کر بے تکلفی سے بیٹھ گئی پھر اپنے خوب صورت چمک دار دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے بولی۔ "مجھے جنت کہتے ہیں۔"

سیاہ چہرے پر موتیوں ایسے دانت کچھ ایسا تاثر پیدا کر رہے تھے جیسے کوئلے کی کسی

کان میں بیک وقت کئی ہیرے دمکنے لگے ہوں۔

میں نے بھی جواباً مسکراتے ہوئے کہا۔ "میں جنت کو اپنے دفتر میں خوش آمدید کہتا ہوں۔ زہے نصیب۔"

وہ دھیرے سے مسکرائی۔ ادھ کھلے ہونٹوں میں سفید موتیوں کی ایک جھلک دکھائی دی۔ سیاہ ہونٹوں کی وجہ سے اس کے دانت غیر عمولی طور پر سفید نظر آ رہے تھے۔ ممکن ہے' حقیقت میں وہ اتنے سفید نہ ہوں۔ کلر کنٹراسٹ نے انہیں بڑھا چڑھا کر پیش کیا ہو۔ اس نے میز پر سے چابیوں کا گچھا اٹھا لیا اور رنگ میں انگلی ڈال کر اسے گھماتے ہوئے بولی۔ "اور سنائیں بیگ صاحب! آج کل پریکٹس کیسی چل رہی ہے؟"

"اللہ کا شکر ہے۔"

"اللہ کا کرم کہئے۔" اس نے ایک صحت مند قہقہہ لگایا۔ "بلکہ اللہ کا فضل کہیں تو زیادہ مناسب ہو گا۔ آج کل آپ بہت اونچا اڑ رہے ہیں۔ مال بھی خوب کما رہے ہیں اور شہرت بھی۔"

وہ ایسے بے تکلف انداز میں گفتگو کر رہی تھی جیسے مجھ سے برسوں کی شناسائی ہو لیکن میں نے آج سے پہلے اسے کہیں دیکھا نہیں تھا۔ اگر بالفرض کبھی دیکھا بھی تھا تو اس وقت مجھے یاد نہیں آ رہا تھا۔ میرے چہرے پر حیرت آمیز الجھن کے تاثرات ابھرتے ہوئے دیکھ کر اس نے کہا۔ "آپ بھی حیران ہو رہے ہوں گے کہ میں کون ہوں جو اتنی بے تکلفی سے آپ سے بات کر رہی ہوں' کیوں؟"

"آپ کا اندازہ درست ہے۔" میں نے کہا۔ "میں نے واقعی آپ کو پہچانا نہیں۔"

وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ "آپ پہچان بھی کیسے سکتے ہیں۔ ہم زندگی میں آج پہلی بار مل رہے ہیں۔"

اپنی بات ختم کرتے ہی اس نے ایک بھرپور قہقہہ لگایا۔ خاصی زندہ دل عورت معلوم ہوتی تھی۔ اس دوران میں وہ چابیوں والے چھلے کو مسلسل اپنی انگلی میں گردش دے رہی تھی۔ میں نے ان چابیوں کو دیکھتے ہی اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ کسی کار کی چابیاں تھیں کیونکہ ان پر مزدا کا مخصوص مونوگرام واضح طور پر نظر آ رہا تھا۔

"مجھے مرزا امجد بیگ ایڈووکیٹ کہتے ہیں۔" میں نے اپنا تعارف کرانا چاہا۔ حالانکہ

اس تعارف کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ اس وقت میرے دفتر میں موجود تھی اور ایک مرتبہ مجھے بیگ صاحب کہہ کر مخاطب بھی کر چکی تھی اور میری پریکٹس کا حال احوال دریافت کر چکی تھی لیکن اپنے تعارف سے میرا مقصد صرف یہ تھا کہ وہ اپنی آمد کے بارے میں بتائے مگر اس نے مجھے اپنی بات پوری نہیں کرنے دی تھی اور بیچ میں بول پڑی۔

"آپ کو پورا شہر جانتا ہے اور میں بھی اسی شہر میں رہتی ہوں۔"

"میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟"

"آپ مجھے شرمندہ کر رہے ہیں بیگ صاحب!" اس نے عجیب سے لہجے میں کہا۔ "خدمت تو آپ کی میں کروں گی، آپ جو کہیں گے۔ بس آپ مجھ پر ایک احسان کر دیں۔"

میں نے سوالیہ نظروں سے اس کی جانب دیکھا۔ "کیسا احسان؟"

میرے سوال کا جواب دینے کی بجائے اس نے چابیوں والا گچھا میز پر رکھ دیا پھر اپنا ہینڈ بیگ کھول کر اس میں کچھ تلاش کرنے لگی۔ وہ اپنے انداز اور لب و لہجے سے مجھے خاصی مہذب اور باوقار عورت نظر آئی تھی۔ خوش اخلاقی اس میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ اس طبقے کی بیگمات میں جو رعونت اور طنطنہ پایا جاتا ہے وہ جنت میں دور دور تک نظر نہیں آتا تھا۔ ایک منٹ کی تلاش کے بعد اس نے اپنے بیگ میں سے ایک پوسٹ کارڈ سائز تصویر نکال کر میری جانب بڑھا دی۔

میں نے تصویر کو اپنے ہاتھ میں لے کر دیکھا۔ وہ چالیس بیالیس سالہ ایک شخص کی تصویر تھی۔ تصویر میں وہ خاصا ہینڈسم اور باوقار شخصیت کا مالک نظر آتا تھا۔ وہ بلاشبہ ایک خوب رو، متین، سنجیدہ اور آئیڈیل شخص تھا۔ میں نے تصویر کا سرسری جائزہ لینے کے بعد سوالیہ نظروں سے جنت کی جانب دیکھا۔ وہ میری نظروں کا مفہوم سمجھتے ہوئے بولی۔ "یہ حیات یزدانی کی حالیہ تصویر ہے۔"

میں نے کوئی بات نہیں کی۔ خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ اس نے بات آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ "حیات یزدانی میرا شوہر ہے۔"

مجھے حیرت کا ایک جھٹکا لگا۔ اس نے میرے چہرے پر نمودار ہونے والی تبدیلی کو بھانپ لیا، جلدی سے بولی۔ "میں اپنے شوہر کے بارے میں بہت پریشان ہوں۔ اسی سلسلے میں آپ کے پاس آئی ہوں۔"

میں نے غیر جذباتی لہجے میں کہا۔ "دیکھیں خاتون! جب تک آپ مجھے ہر بات واضح طور پر نہیں بتائیں گی اس وقت تک میں نہ تو آپ کی پریشانی کو سمجھ سکوں گا اور نہ ہی اس سلسلے میں آپ کی کوئی مدد کر سکوں گا۔"

"میرا شوہر کھو گیا ہے۔" اس نے بتایا۔ "میں اسے واپس لانا چاہتی ہوں۔ بس اتنا سا میرا مسئلہ ہے۔"

میں نے کہا۔ "اگر آپ کا شوہر کہیں کھو گیا ہے تو آپ تھانے میں جا کر رپورٹ درج کرائیں۔ میرے پاس کیوں آئی ہیں؟"

"تھانے والے اس سلسلے کچھ نہیں کر سکتے۔"

میں نے بے زاری سے کہا۔ "آپ کی باتیں میری سمجھ سے بالاتر ہیں۔"

"دراصل بات یہ ہے کہ حیات پر ایک چڑیل نے قبضہ کر لیا ہے۔" وہ سنجیدگی سے بولی۔ "میں چاہتی ہوں کہ آپ میرے شوہر کو اس چڑیل کے چنگل سے آزاد کرا دیں۔ کوئی ایسا داؤ چلیں کہ وہ چڑیل منہ پیٹتی رہ جائے اور--- حیات بھی مجھے واپس مل جائے۔"

میں نے اس سے یہ نہیں کہا کہ اگر اس کے شوہر پر کسی چڑیل کا سایہ ہے تو وہ اسے کسی عامل کامل ناگی باوا کے پاس لے جائے۔ اس کی بات کچھ کچھ میری سمجھ میں آنے لگی تھی۔ میں نے اپنے خیال کی تصدیق کے لئے کہا۔ "اس چڑیل کا نام کیا ہے؟"

جنت نے میرے خیال کی تصدیق کر دی۔ "سونیا!"

اس نے سونیا کا لفظ اتنی نفرت سے ادا کیا تھا کہ جیسے اسے کچا چبا رہی ہو۔ میں نے رف پیڈ اور قلم سنبھال لیا اور جنت کی گفتگو کے اہم پوائنٹس نوٹ کرنے لگا۔ میں نے سوال کیا۔ "آپ کے شوہر حیات یزدانی کب سے سونیا میں دلچسپی لے رہے ہیں؟"

میرے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے اس نے پوچھا۔ "آپ کو ہر صورت میں میری مدد کرنا ہو گی۔ کریں گے نا؟"

میں نے کہا۔ "میں اپنی تسلی کیے بغیر کوئی کیس ہاتھ میں نہیں لیتا۔"

"تسلی، کیسی تسلی؟" اس نے پوچھا۔ "فیس کی تسلی یا کیس کی نوعیت کی تسلی؟"

”آپ کی دوسری بات زیادہ صحیح ہے۔“

وہ پُراعتماد لہجے میں بولی۔ ”آپ فکر نہ کریں بیگ صاحب! میں آپ کی ہر طرح کی تسلی کروں گی۔“ پھر اس نے اپنے بیگ میں سے ایک اور تصویر نکال کر میری طرف بڑھا دی۔ ”یہ وہی چڑیل ہے جو آج کل میرے شوہر نامدار پر پوری طرح قابض ہے۔“

سونیا دلکش نقوش کی مالک ایک پُرکشش اور حسین و جمیل عورت تھی۔ اس کی عمر کا اندازہ میں نے تصویر کے مطابق چوبیس پچیس سال لگایا تھا۔ تصویر میں اس کے سیاہ ریشمی بال شانوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ اس کی غزالی آنکھوں میں جھیل کی سی گہرائی تھی۔ سائڈ پوز میں وہ شان بے نیازی کا شاہکار دکھائی دیتی تھی۔ اگر حیات یزدانی کا دل سونیا کی زلف گرہ گیر میں جا پھنسا تھا تو اس میں اچنبھے کی کوئی بات نہیں تھی۔ دونوں کی جوڑی کو مثالی جوڑی کہا جا سکتا تھا۔ میں سونیا کی تصویر کے سحر میں کھویا ہوا تھا کہ جنت کی آواز نے چونکا دیا۔ ”واپس آجایئے بیگ صاحب!“

میں نے پلکیں جھپکا کر اس کی طرف دیکھا اور سونیا کی تصویر کو اپنے سامنے میز پر رکھ دیا پھر سوالیہ نظروں سے جنت کی جانب دیکھنے لگا۔ اس کے چہرے کے تاثرات سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ اپنی بات کو آگے بڑھانے کیلئے مناسب الفاظ کا انتخاب کر رہی ہے۔ میں کچھ دیر تک اس کے بولنے کا انتظار کرتا رہا پھر اس کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے کہا۔ ”جنت صاحبہ! اگر آپ واقعی چاہتی ہیں کہ میں آپ کی کوئی مدد کروں تو واضح الفاظ میں مجھے سب کچھ بتا دیجئے۔ میرا ایک ذاتی مقولہ ہے کہ دایہ سے پیٹ اور وکیل سے سچ نہیں چھپایا جا سکتا۔ آپ کو بھی جو کچھ کہنا ہے‘ بلا جھجک کہہ ڈالئے۔“

جنت نے میرے سوالات کے جواب میں جو تفصیلات بیان کیں ان میں سے غیر ضروری اور غیر متعلقہ باتوں کو حذف کر کے میں آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں تاکہ آپ اس کیس کے مختلف پہلوؤں سے آگاہ ہو جائیں اور مطالعے کے دوران میں آپ کا ذہن نہ الجھے۔

* * *

جنت کروڑ پتی والدین کی اکلوتی اولاد تھی۔ اس کا باپ طفیل برہانی ایک کامیاب

بزنس مین تھا۔ وہ امپورٹ ایکسپورٹ کا کاروبار کرتا تھا۔ اس کا دفتر ”برہانی ٹریڈرز“ شارع فیصل پر واقع ایک کثیرالمنزلہ عمارت میں تھا۔ وہ مغربی ممالک سے ہیوی مشینری منگواتا تھا۔ اس کے علاوہ جاپان اور دیگر جنوب ایشیائی ملکوں سے وہ آٹو سپیئر پارٹس بھی درآمد کرتا تھا۔ جنت دس سال کی تھی جب اس کی والدہ کا انتقال ہو گیا۔ بیوی کی وفات کے بعد طفیل نے جنت کو اپنی توجہ کا مرکز و محور بنا لیا تھا۔

حیات یزدانی اس زمانے میں برہانی ٹریڈرز میں بطور اکاؤنٹ اسسٹنٹ کام کرتا تھا۔ حیات نے اپنی لگن اور محنت سے روز افزوں ترقی کی اور بہت کم عرصے میں وہ **اکائونٹنٹ** کی سیٹ پر بیٹھا نظر آ رہا تھا۔ طفیل اس کے کام سے بہت خوش تھے۔ حیات کی جس خوبی نے طفیل کو سب سے زیادہ متاثر کیا وہ اس کی ایمان داری اور وفاداری تھی۔ سابق **اکائونٹنٹ** کے کچھ گھپلے پکڑ کر اس نے اپنے باس کی نظر میں بہت معتبر مقام پیدا کر لیا تھا۔

حیات کے بارے میں کوئی نہیں جانتا تھا کہ اس کا پس منظر کیا تھا۔ اس نے برہانی ٹریڈرز میں ملازمت حاصل کرتے وقت اپنے باس کو جو کہانی سنائی تھی‘ اس کے مطابق اس کا تعلق صوبہ پنجاب کے ضلع جہلم سے تھا۔ باپ کی وفات کے بعد چچا نے ان کی جائیداد پر قبضہ کر لیا تھا۔ وہ گھر میں سب سے بڑا تھا۔ اس کی والدہ نے بھی چچا کا ساتھ دیا تھا۔ ماں کے اس رویئے نے اسے دل برداشتہ کر دیا تھا۔ اسے شک تھا کہ اس کے باپ کی موت میں اس کی ماں کا ہاتھ ہو سکتا تھا جو سازشی چچا کے ہاتھوں میں کھلونا بنی ہوئی تھی۔ قصہ مختصر حیات نے سب پر لعنت بھیجی اور روزگار کی تلاش میں کراچی کا رخ کیا۔

طفیل برہانی پہلی ہی ملاقات میں حیات سے بہت متاثر ہوا تھا۔ کسی قسم کی چھان بین کے بغیر اس نے حیات کو ملازمت دے دی۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے حیات نے اپنی ذہانت کا بھرپور استعمال کیا اور روز بہ روز ترقی کرتا چلا گیا پھر ایک وقت ایسا بھی آیا کہ وہ برہانی ٹریڈرز کا جنرل مینجر بن چکا تھا۔

انہی دنوں میں ایک روز طفیل نے اسے اپنے گھر پر بلایا۔ وہ اکثر اپنے باس کے گھر جاتا رہتا تھا۔ یہ کوئی نئی بات نہ تھی مگر آج اسے کچھ عجیب سا محسوس ہو رہا تھا۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے کچھ نہ کچھ ہونے والا ہو مگر وہ اپنی اس کیفیت کو سمجھنے سے قاصر تھا۔ طفیل برہانی سے ملاقات پر اس کے خیال کی تصدیق ہو گئی۔

طفیل تین چار روز سے دفتر نہیں آ رہا تھا۔ وجہ طبیعت کی خرابی تھی۔ حیات سیدھا بیڈ روم میں چلا آیا۔ وہ بیٹھ چکا تو طفیل برہانی نے بولنا شروع کیا۔ اس وقت بیڈ روم میں ان دونوں کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔

”حیات‘ میں نے ہمیشہ تمہیں اپنی اولاد کی طرح ٹریٹ کیا ہے۔ یہ بات تم بڑی اچھی طرح جانتے ہو۔“

”یس سر۔“ حیات نے مختصراً“ کہا۔

طفیل نے نقاہت آمیز لہجے میں کہا۔ ”اولاد کی طرح ٹریٹ کرنا اور بات ہے اور اولاد سمجھنا دوسری بات ہے۔“ ایک لمحے کے توقف کے بعد اس نے حیات کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔ ”تم میرا مطلب سمجھ رہے ہو نا؟“

حیات نے کوئی تبصرہ کرنے کے بجائے مختصر جواب پر اکتفا کیا۔ ”یس سر۔“

طفیل نے کہا۔ ”میں چاہتا ہوں کہ تمہیں اپنے خاندان میں شامل کر لوں۔ میں تمہیں اپنا بیٹا بنانا چاہتا ہوں۔“

”جی!“ حیات نے چونک کر طفیل کی جانب دیکھا۔ ”میں سمجھا نہیں سر!“

”میں سمجھاتا ہوں۔“ طفیل شفقت آمیز لہجے میں گویا ہوا۔ ”حیات میری زندگی کی گنتی قریب الختم ہے۔ شاید اب میں چند روز یا چند ماہ جی سکوں گا۔“

”ایسا نہ کہیں سر!“ حیات نے اپنے باس کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔ ”خدا آپ کا سایہ ہمارے سر پر سلامت رکھے۔ آپ کی وجہ سے ہزاروں افراد کو رزق مل رہا ہے۔“

طفیل خلا میں گھورتے ہوئے ٹھوس لہجے میں بولا۔ ”رزق دینے والی صرف اور صرف خدا کی ذات ہے۔ آدمی تو محض ایک بہانہ‘ ایک وسیلہ ہے۔“ کچھ دیر خاموش رہ کر وہ موزوں الفاظ تلاش کرتا رہا پھر بولا۔ ”مگر یہ وسیلہ‘ یہ بہانہ اب چند روز کا مہمان ہے۔“ آخری جملہ ادا کرتے کرتے اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

”آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے سر۔“ حیات نے جذباتی لہجے میں کہا۔ ”میں ڈاکٹر کو فون کرتا ہوں۔“

”اس کی ضرورت نہیں ہے۔“ طفیل نے ہاتھ کے اشارے سے اسے منع کرتے ہوئے کہا۔ ”میں بالکل ٹھیک ہوں اور ہاں‘ تم میری باتیں غور سے سنو۔“ تھوڑی دیر تک وہ منتشر خیالات کو ذہن میں ترتیب دیتا رہا پھر ٹھہر ٹھہر کر بولنا شروع کیا۔

”اس گفتگو کا ذکر تم جنت سے ہرگز نہیں کرو گے۔ تم جانتے ہو مجھے اپنی اکلوتی بیٹی سے کتنی شدید محبت ہے۔ تم نے کئی مرتبہ میری دیوانہ وار محبت کے مظاہرے دیکھے ہیں۔ میں جنت کو کس قدر چاہتا ہوں‘ یہ تم سے زیادہ اور کوئی نہیں جانتا۔“

خاموشی کا ایک طویل وقفہ گزر گیا تو طفیل کی نحیف آواز بیڈ روم کے سکوت میں ابھری۔ ”میں گزشتہ کئی سال سے ایک مسلسل ذہنی عذاب میں مبتلا ہوں۔ تم جانتے ہو‘ سال میں ایک دو مرتبہ میں یورپ و امریکہ کا چکر ضرور لگاتا ہوں۔ وہ سب اسی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔ اب یہ بات پایہ تکمیل کو پہنچ چکی ہے کہ میں برین ٹیومر ایسے موذی مرض کے شکنجے میں پوری طرح جکڑا جا چکا ہوں۔ اس سال ڈاکٹر میرا میجر آپریشن کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ اس آپریشن سے پہلے پہلے میں جنت کو تمہارے حوالے کر دوں۔ مجھے امید نہیں ہے کہ اس آپریشن کے بعد میں زندہ رہ بھی پاؤں گا۔ میں جنت کو اس دنیا میں تنہا چھوڑ کر جانا نہیں چاہتا۔ میں اسے تم سے منسوب کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے امید ہے تم ایک دوسرے کے لئے آئیڈل میاں بیوی ثابت ہو گے۔“

”لیکن سر۔۔۔؟“

حیات نے کچھ کہنے کیلئے منہ کھولنا چاہا لیکن طفیل نے ہاتھ کے اشارے سے اسے بولنے سے منع کر دیا پھر خود کہا۔ ”میں جانتا ہوں کہ جنت کوئی خوبصورت تو کیا‘ گزارہ صورت لڑکی بھی نہیں ہے مگر یہ بات تو تم بھی بخوبی جانتے ہو کہ وہ دل کی بہت اچھی ہے۔ تمہیں کبھی شکایت کا موقع نہیں دے گی۔ ویسے تم پر کوئی زبردستی نہیں ہے۔ میں تمہیں سوچنے کیلئے دس روز کی مہلت دیتا ہوں۔ دس دن بعد تم مجھے اپنے فیصلے سے آگاہ کر دینا۔ اگر تمہارا فیصلہ میرے حسب منشا ہوا تو میں اسے تمہارا احسان عظیم سمجھوں گا۔ مرتے وقت مجھے کوئی تکلیف نہیں ہو گی۔ میں مطمئن ہوں گا کہ میں نے جنت کو محفوظ ہاتھوں کے سپرد کر دیا ہے۔“

اپنی بات ختم کرنے کے بعد طفیل برہانی نے آنکھیں بند کر لیں‘ بند آنکھوں کے پیچھے سے آنسوؤں کو اپنا راستہ بنانے میں کسی دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ طفیل نے جن آنسوؤں کو چھپانے کیلئے آنکھیں بند کی تھیں‘ انہوں نے اس کا راز افشا کر دیا تھا۔ بیڈ

روم میں گھمبیر خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ حیات بے چینی سے پہلو بدلتے ہوئے اپنے باس کے مزید بولنے کا انتظار کرتا رہا مگر دوسری جانب بدستور خاموشی طاری تھی۔ البتہ آنسوؤں کا سلسلہ جاری و ساری تھا۔

پندرہ بیس منٹ بعد حیات نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ”اب میں چلوں سر؟“

طفیل برہانی نے آنکھیں کھول کر اپنے جنرل مینجر بہ الفاظ دیگر مستقبل کے داماد کو دیکھا۔ حیات کا چہرہ اسے دھندلا دھندلا دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے آنکھوں کی نمی کو صاف کرتے ہوئے بھیگی آواز میں کہا۔ ”حیات ہمارے درمیان جو گفتگو ہوئی ہے، وہ کسی اور تک نہیں پہنچی چاہئے۔ جنت تک بھی نہیں۔“ ایک لمحے کے توقف کے بعد اس نے سلسلہ کلام جوڑتے ہوئے کہا۔ ”اور تم میری بیماری کے بارے میں بھی اپنی زبان بند رکھو گے۔“

”یس سر، میں آپ کی توقعات پر پورا اترنے کی کوشش کروں گا۔“

طفیل نے امید افزا نظروں سے اسے دیکھا۔ ”ٹھیک ہے، اب تم جا سکتے ہو۔“

حیات جھکی ہوئی گردن کے ساتھ بیڈ روم سے نکل آیا۔ طفیل برہانی نے حیات یزدانی کو دس دن کی مہلت دی تھی مگر اس سلسلے میں فیصلہ کرنے کے لئے دس گھنٹے بھی اسے زیادہ دکھائی دے رہے تھے۔ اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں تھا کہ حیات کوئی لالچی اور موقع پرست انسان تھا جو ایک کروڑ پتی کی اکلوتی بدصورت بیٹی سے شادی کرنے کے بعد راتوں رات امیر ہونے کے خواب دیکھ رہا تھا بلکہ حیات کے جنت سے شادی کے لئے رضا مند ہونے کی اصل وجہ یہ تھی کہ وہ طفیل برہانی کا بے پناہ احسان مند تھا۔ آج وہ جو کچھ بھی تھا، طفیل کی وجہ سے تھا۔ حیات نے پلک جھپکتے میں اپنے باس کی آخری خواہش کا احترام کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

دو ماہ کے اندر اندر ”برہانی ٹریڈرز“ کا جنرل مینجر اپنی کمپنی کے باس کا داماد بن چکا تھا۔ لوگوں کو اس عجیب و غریب شادی پر بے پناہ حیرت بھی ہوئی تھی۔ کئی لوگوں نے مختلف قسم کے ریمارکس بھی پاس کئے تھے۔ بہرحال جو ہونا تھا وہ ہو چکا تھا پھر اسی سال کے اختتام پر حیات یزدانی ”برہانی ٹریڈرز“ کا منیجنگ ڈائریکٹر بن گیا۔ طفیل کا آپریشن ناکام رہا تھا اور وہ چل بسا تھا۔

حیات نے کمپنی کا نظم و نسق سنبھال لیا۔ سب کام اس کا دیکھا بھالا تھا۔ کوئی بات اس کے لئے نئی نہیں تھی۔ اس کی ذمے داریوں میں اضافہ ہو گیا تھا۔ اب اسے اندازہ ہوا تھا کہ ملازم کی بہ نسبت مالک کے کندھوں پر کہیں زیادہ ذمے داریاں ہوتی ہیں۔

حیات نے شروع ہی میں ایک اصول بنا لیا تھا کہ کام کے بندے ڈھونڈ ڈھونڈ کر اپنے اسٹاف میں شامل کئے جائیں اور انہیں پھر کسی بھی قیمت پر جانے نہ دیا جائے۔ چاہے ان کے کچھ ناجائز مطالبات بھی ماننے پڑیں مگر ایک معقول حد میں رہتے ہوئے۔ ایک سال کے اندر اندر اس نے کمپنی کے اسٹاف میں چھانٹی کر ڈالی اور بیشتر نئے لوگوں کا اضافہ کر لیا۔ اب اس کے اسٹاف ممبران کی تعداد پہلے سے نسبتاً کم ہو گئی تھی لیکن ہر ورکر اپنے کام کا ماہر تھا۔ اس نے ورکرز کی تنخواہوں میں بھی اضافہ کر دیا۔ نتیجے کے طور پر کاروبار پہلے کی بہ نسبت زیادہ ترقی کرنے لگا۔

شادی کے دو سال بعد بھی جنت کی گود ہری نہ ہوئی۔ تیسرا سال بھی بے بہار ہی گزر گیا۔ اگلے سال نے گزشتہ سال کی تقلید کی پھر سال پر سال گزرنے لگے مگر جنت کی خزاں بہ دستور قائم رہی۔ اب ان کی شادی کو چھ برس بیت چکے تھے مگر ابھی تک وہ صاحب اولاد نہیں ہوئے تھے البتہ اس دوران میں ”برہانی ٹریڈرز“ نے دن دونی اور رات چوگنی ترقی کر لی تھی۔ کام کی زیادتی کے باوجود حیات کبھی دیر تک دفتر میں نہیں رکا تھا۔ وہ سر شام ہی گھر لوٹ آتا۔ جنت کو اولاد کی محرومی کے سوا حیات سے کوئی شکایت نہیں تھی۔ وہ بھرپور محبت کرنے والا ایک وجیہہ و شکیل شوہر تھا۔

ساتواں سال شروع ہوا تو اس کی ازدواجی زندگی میں ہلچل پیدا ہوئی۔ اب حیات نے دفتر میں دیر تک بیٹھنا شروع کر دیا تھا۔ جنت نے ایک دو بار پوچھا تو وہ مصروفیات کی آڑ لے کر ٹال گیا۔ جنت نے اس کے رویئے میں بھی ایک خاص تبدیلی نوٹ کر لی تھی۔ اس کے فطری تجسس نے اسے اکسایا اور وہ حیات کی ٹوہ میں لگ گئی، جلد ہی اسے معلوم ہو گیا کہ اس کے دفتر میں ایک خوب رو سیکریٹری کا اضافہ ہو چکا ہے۔ یہ ایک غیر معمولی تبدیلی تھی جسے جنت معمولی سمجھ کر نظرانداز نہیں کر سکتی تھی۔ اس سے پہلے حیات نے ہمیشہ مرد سیکریٹری رکھا تھا۔

جنت نے اپنی کہانی کو اختتامی موڑ کی طرف لاتے ہوئے بتایا۔ ”سونیا اس دفتر میں

ٹائپسٹ کی حیثیت سے وارد ہوئی تھی‘ کچھ ہی ماہ کے بعد وہ اپنے باس یعنی میرے شوہر حیات یزدانی کی پرائیویٹ سیکریٹری بن گئی اور اب—– اور اب وہ کچھ اور بننے کے خواب دیکھ رہی ہے۔ میرا مطلب ہے خواب دیکھ رہی تھی۔“

”میں سمجھا نہیں‘ دیکھ رہی ہے اور دیکھ رہی تھی‘ سے آپ کی کیا مراد ہے؟“

”میں آپ کو بتاتی ہوں۔“ وہ میری الجھن کو محسوس کرتے ہوئے جلدی سے بولی۔

”میں نے اپنی خفیہ تحقیقات جاری رکھی تھیں اور حیات کے دفتر کے ایک پیون کو اپنے اعتماد میں لے لیا تھا۔ وہ خاصا پرانا آدمی تھا اور مجھے بڑی مفید معلومات فراہم کرتا رہتا تھا۔ آپ تو جانتے ہی ہیں بیگ صاحب کہ بظاہر معمولی نظر آنے والے چپراسی کس طرح باس کی خفیہ سرگرمیوں پر نظر رکھتے ہیں۔“ وہ ایک لمحے کو سانس لینے کیلئے رکی پھر سلسلہ گفتگو جاری رکھتے ہوئے بولی۔ ”مجھے جب یقین ہو گیا کہ حیات واقعی سونیا میں دلچسپی لے رہا ہے اور مستقبل قریب میں ان کے بہت خطرناک ارادے ہیں تو میں ہوشیار ہو گئی اور میں نے اسی رات حیات سے بات کرنے کا فیصلہ کرلیا۔“

”آپ کے شوہر کا کیا رد عمل تھا؟“

”میں وہی بتانے جا رہی ہوں۔“ جنت نے کہا۔ ”میں نے سب کچھ صاف صاف اس سے کہہ ڈالا جو میرے دل میں تھا۔ بیگ صاحب! آپ یقین کریں یا نہ کریں‘ میں بہت صاف گو واقع ہوئی ہوں۔“

مجھے یقین تھا کہ وہ سچ کہہ رہی تھی۔ میں نے تھوڑی دیر کی گفتگو سے اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ ”تن اجلا من کالا“ کے برعکس ”من اجلا تن کالا“ کی تفسیر تھی۔ وہ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ ”میرا خیال تھا کہ وہ میری بات سنتے ہی بھڑک اٹھے گا اور اپنی صفائیاں پیش کرنے لگے گا مگر اس نے ایسا کچھ نہیں کیا۔ میں اس وقت بہت شرمندہ ہو رہی تھی کہ آخر میں نے اپنے ٹوٹ کر محبت کرنے والے شوہر پر شک ہی کیوں کیا؟ پیون جیسے جھوٹے لوگوں کا کیا بھروسا‘ رائی کا پہاڑ بنانا تو ان کی سرشت میں شامل ہوتا ہے‘ اور یہ---“

میں نے اس کی طویل گفتگو سے بیزار ہوتے ہوئے قطع کلامی ی۔ ”رائی ہو تو پہاڑ بنتا ہے جنت صاحبہ! خیر بائی دا وے‘ آپ کے استفسار پر آپ کے شوہر نے کیا جواب دیا

تھا؟“

جنت نے جواب دیا۔ ”اس نے اپنی صفائی میں ایک لفظ ادا نہیں کیا بلکہ صرف اتنا کہا کہ وہ کل ہی سونیا کو ملازمت سے برخاست کر دے گا۔ وہ یہ بات ہرگز پسند نہیں کر سکتا کہ اس کے اور میرے درمیان کوئی تیسری ہستی آئے یا کوئی چیز ہمارے بیچ غلط فہمی پیدا کرے اور پھر اس نے دوسرے ہی روز سونیا کی چھٹی کر دی۔“

”بہت خوب۔“ اس کی بات ختم ہوئی تو میں نے کہا۔ ”اب آپ مجھ سے کیا چاہتی ہیں؟“

”شاید مجھے آپ کے پاس آنے کی ضرورت محسوس نہ ہوتی۔ میں تو مطمئن ہو گئی تھی کہ سونیا کا کانٹا نکل چکا ہے۔ اگر حیات اس میں دلچسپی لے رہا تھا تو بھی اور اگر ان کے بیچ کوئی چکر نہیں تھا تو بھی اب یہ قصہ پاک ہو چکا تھا۔ مجھے حیات پر فخر بھی محسوس ہوتا تھا کہ وہ میری خواہش کا کتنا احترام کرتا ہے۔ میری خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ حیات کی چاہت کے بارے میں سوچتے ہوئے میرا سینہ نشاط انگیز جذبات سے لبریز ہو جاتا تھا مگر پھر ایک ایسا واقعہ پیش آگیا کہ میں سمجھ نہیں پا رہی ہوں کہ حقیقت کیا ہے؟ میری آنکھوں نے جو کچھ دیکھا ہے‘ کہیں وہ فریب نظر تو نہیں۔ حیات کی بے وفائی پر یقین کرنے کو دل تو نہیں چاہ رہا لیکن یقین کیے بغیر کوئی چارہ بھی نہیں ہے۔ آنکھیں بند کر لینے سے کوئی حقیقت تو نہیں بدل جاتی۔“

”آپ نے ایسا کیا دیکھ لیا ہے۔“ میں نے پوچھا۔ ”آپ نے کسی واقعے کا ذکر کیا ہے؟“

وہ بولی۔ ”یہ ایک ہفتے پہلے کی بات ہے۔ سونیا کو دفتر سے نکالے ہوئے کم و بیش ایک سال گزر چکا ہے۔ میں تو اب اسے بھول گئی تھی کہ اس واقعے نے اس چڑیل کی یاد کو میرے ذہن میں دوبارہ تازہ کر دیا ہے۔“

”آپ وہ واقعہ بتانے لگی تھیں؟“ میں نے اسے ٹوک دیا۔ اگرچہ اس کی طویل گفتگو سے میں کچھ عجیب سا محسوس کرنے لگا تھا مگر میں نے اس کا زیادہ اثر نہیں لیا کیونکہ آج خلاف توقع انتظار گاہ خالی پڑی ہوئی تھی۔ میں وقفے وقفے سے شیریں سے باہر کے حالات معلوم کر رہا تھا پھر جنت کی کہانی خاصی دلچسپ بھی تھی اس لئے میں اسے بہ

سہولت برداشت کر رہا تھا۔

"وہ واقعہ جمی کی وجہ سے پیش آیا تھا۔" جنت نے میرے سوال کا جواب دیتے ہوئے بتایا۔

"جمی غالباً آپ کے بیٹے کا نام ہے؟"

وہ عجیب سے انداز میں مسکرائی۔ مجھے اپنی غلطی کا فوراً احساس ہو گیا۔ وہ تھوڑی دیر پہلے مجھے بتا چکی تھی کہ وہ ہنوز اولاد ایسی نعمت سے محروم تھے۔ اس نے کہا۔ "وکیل کی یادداشت بہت مضبوط ہونا چاہیئے۔ خیر ایسا ہو جاتا ہے۔"

مجھے خاموش دیکھ کر اس نے بات آگے بڑھائی۔ "جمی ہمارے کتے کا نام ہے۔ وہ گزشتہ پانچ سال سے ہمارے ساتھ ہے۔ وہ روسی نسل کا ایک پستہ قامت کتا ہے۔ بال برف کے مانند سفید جسم میں بجلیاں سی بھری ہوئیں۔ ایک دم چاق و چوبند۔ بیگ صاحب! آپ کو کتوں کے بارے میں تو کافی معلومات ہوں گی؟" میں نے نفی میں سر ہلایا۔

"حیات کی ہمیشہ سے یہ عادت رہی ہے کہ وہ رات کے کھانے کے بعد چہل قدمی ضرور کرتے ہیں۔ پہلے تو وہ اپنے بنگلے کے لان ہی میں چہل قدمی کر لیتے تھے مگر آٹھ دس ماہ سے انہوں نے گھر سے باہر جانا شروع کر دیا ہے۔ اس دوران میں جمی ان کا واحد ہمراہی ہوتا ہے۔ ان کی واپسی ایک سے دو گھنٹے کے درمیان ہوتی ہے۔ کبھی کبھار ڈھائی تین گھنٹے بھی لگ جاتے ہیں۔ مجھے چہل قدمی اور کسی بھی قسم کی ورزش سے کوئی دلچسی نہیں ہے۔ میرے پسندیدہ مشاغل کھانا' سونا اور ٹی وی دیکھنا ہیں۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جب حیات چہل قدمی کر کے واپس آتے ہیں تو میں سو چکی ہوتی ہوں۔ صبح مجھے پتہ چلتا ہے کہ وہ کتنے بجے واپس آئے تھے۔ شاید اسی وجہ سے میرا وزن بھی کچھ بڑھ رہا ہے۔"

کچھ! میں نے دل ہی دل میں کہا' نتیجہ صاف ظاہر ہے۔

وہ سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے بولی۔ "ایک ہفتہ پہلے حیات دو روز کے لئے اسلام آباد گئے تھے۔ کافی عرصے بعد وہ شہر سے باہر جا رہے تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ گزشتہ ایک سال سے انہوں نے کوئی ملکی یا غیر ملکی دورہ نہیں کیا تھا۔ انہیں اسلام آباد گئے دوسرا دن تھا۔ میں رات کے کھانے کے بعد کسی کام سے لان کی جانب گئی تو میں نے جمی کو بے قراری سے اس کے پنجرے میں ٹہلتے ہوئے دیکھا۔ ہم نے لان کے ایک

سرے پر جمی کیلئے پنجرہ نما گھر بنوا رکھا تھا۔ فرصت کے اوقات میں وہ وہاں پڑا آرام کرتا رہتا تھا۔

مجھے دیکھتے ہی وہ کمان سے نکلے ہوئے تیر کی مانند سیدھا میرے پاس آ گیا اور میرے قدموں میں لوٹ پوٹ ہونے لگا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ مجھے باہر کی طرف لے جانے کی کوشش کر رہا تھا۔ جمی کو حیات کے ساتھ روزانہ چہل قدمی کرنے کی عادت پڑ گئی تھی۔ جانے میرے دل میں کیا آئی کہ میں نے اس کی زنجیر تھام لی اور بنگلے سے باہر نکل آئی۔ میں نے سوچا' چلو آج میں بھی چہل قدمی کر لیتی ہوں۔ دیکھو تو سہی' آخر اس سے ہوتا کیا ہے؟

میں نے دانستہ جمی کی زنجیر ڈھیلی رکھی تھی اور اس کی راہنمائی میں اس کے پیچھے پیچھے چل رہی تھی۔ وہ اپنی فطرت کے مطابق مختلف حرکتیں کر رہا تھا۔ کبھی وہ کسی بنگلے کی دیوار کو سونگھنے لگتا' کبھی کسی درخت کو۔ کبھی وہ اچانک رک جاتا' کبھی اس کی رفتار میں غیر معمولی اضافہ ہو جاتا۔ شاید اس کی نظر میں چہل قدمی کا یہی ایک مقصد تھا۔

مختلف گلیوں (ڈیفنس سوسائٹی کی گلیوں کو عام محلوں کی گلیاں نہ سمجھا جائے۔ واقفان بخوبی جانتے ہیں) میں گھمانے پھرانے کے بعد جمی ایک بنگلے کے گیٹ کے سامنے پہنچ کر رک گیا پھر پچھلے پنجوں پر اچھل اچھل کر گھنٹی بجانے کی کوشش کرنے لگا۔ میں نے جمی کی اس حرکت کو بھی اس کی کوئی اٹکھیلی ہی سمجھا اور اس کی زنجیر کھینچتے ہوئے سرزنش کی۔

"بری بات ہے جمی' چلو آگے بڑھو۔"

"میں نے اس کی زنجیر کو ایک اور جھٹکا دیا مگر وہ وہاں سے نہ ہٹا۔ اسی دوران میں میری نظر بنگلے کی بیرونی دیوار پر لگی نیم پلیٹ پر پڑی تو میں چونک اٹھی۔ اس بنگلے کا نمبر بھی وہی تھا جو ہمارے بنگلے کا تھا۔ یعنی اٹھاسی—ڈبل ایٹ۔ نیم پلیٹ پر جلی حروف میں ایس ایچ یزدانی—لکھا ہوا تھا۔ میرے ذہن میں خطرے کی لاتعداد گھنٹیاں بج اٹھیں۔ مختلف خفیہ قسم کے خدشات کا ہجوم تھا میرے اردگرد—کہیں ایس ایچ یزدانی کا مطلب سونیا حیات یزدانی تو نہیں؟ کہیں حیات نے خفیہ طور پر سونیا سے شادی تو نہیں کر لی؟ پھر ایک فوری خیال کے تحت میں نے اطلاعی گھنٹی کا بٹن دبا دیا۔

”ایک بار، دو بار، تین بار۔ اندر کہیں گھنٹی بج رہی تھی مگر اس کا کوئی رد عمل ظاہر نہیں ہو رہا تھا۔ پھر مجھے خود ہی اپنی حماقت کا احساس ہو گیا۔ بنگلے کے گیٹ پر جھولتا ہوا تالا میرا منہ چڑا رہا تھا۔ یعنی بنگلہ خالی تھا۔ یہاں جو کوئی بھی مقیم تھا، وہ اس وقت بنگلے میں موجود نہیں تھا۔ میں نے بدقت تمام بہت ”منت خوشامد“ کے بعد جمی کو واپسی کیلئے تیار کیا مگر اب میرے اندر ٹوٹ پھوٹ شروع ہو چکی تھی۔“

”آپ نے اس واقعے کا اپنے شوہر سے ذکر کیا تھا؟“

وہ ایک ٹھنڈی سانس لے کر بولی۔ ”کیا تھا مگر کوئی خاص فائدہ نہیں ہوا۔“

”انہوں نے کیا جواب دیا تھا؟“

”حیات نے کہا تھا کہ ہمارا ٹیڈی (پستہ قد جمی) بہت شریر ہو گیا ہے۔ اسے کھلا چھوڑنا ٹھیک نہیں ہے۔ یہ اپنی آوارہ گردی میں کسی کو نقصان بھی پہنچا سکتا ہے بلکہ میں اب اسے فاروقی صاحب کو ہی دے دوں گا۔ وہ کئی مرتبہ اسے مجھ سے مانگ چکے ہیں۔ وہ بھی اس طرح خوش ہو جائیں گے اور ہماری بھی جان ایسے بدتمیز جانور سے چھوٹ جائے گی۔ مجھے حیرت ہو رہی تھی کہ وہ جمی کو بدتمیز جانور کہہ رہے تھے حالانکہ وہ اس کا بہت خیال رکھتے تھے۔ پھر انہوں نے واقعی جمی کو فاروقی صاحب کے حوالے کر دیا۔“

میں نے اپنی رسٹ واچ پر نگاہ ڈالی، وہ جلدی سے بولی۔ ”میں جانتی ہوں بیگ صاحب! میں نے آپ کا بہت سا قیمتی وقت لیا ہے مگر یہ سارا پس منظر ضروری تھا۔ اس سے واقفیت حاصل کئے بغیر آپ بہ احسن طریق سے میری مدد نہیں کر سکیں گے۔“

”چلیں ٹھیک ہے۔“ میں نے کہا۔ ”اب جلدی سے یہ بھی بتا دیں کہ آپ مجھ سے کس قسم کی مدد چاہتی ہیں؟“

”میں چاہتی ہوں کہ آپ سونیا کا سراغ لگائیں۔“ وہ ٹھوس لہجے میں بولی۔ ”اور اسے تلاش کرنے کے بعد اس کا کچھ بندوبست کریں کہ وہ حیات کا پیچھا چھوڑ دے۔“

”معاف کیجئے گا، ابھی تھوڑی دیر پہلے آپ نے بتایا ہے کہ سونیا کا بنگلہ آپ نے ڈھونڈ نکالا تھا؟“

”مجھے خاصی تاخیر ہو گئی تھی۔“ وہ افسوسناک لہجے میں بولی۔ ”میں نے اس واقعے کے بعد بھی دو مرتبہ ادھر کا رخ کیا تھا مگر ابھی تک وہاں تالا پڑا ہوا ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ حیات نے بہت پہلے ہی سونیا کو کہیں اور شفٹ کر دیا تھا۔“

”یعنی آپ یہ کہنا چاہتی ہیں کہ اب آپ کا شک یقین میں بدل چکا ہے کہ سونیا اور حیات کے درمیان واقعی کوئی چکر تھا اور ہو نہ ہو، انہوں نے شادی بھی کر لی ہو؟“

وہ بولی۔ ”میرا شک یقین میں تو بدل چکا ہے مگر اپنے یقین کو ثابت کرنے کیلئے میرے پاس کوئی دلیل نہیں ہے۔ اسی سلسلے میں، میں آپ سے تعاون چاہتی ہوں۔“

”میں وکیل ہوں جنت صاحبہ۔“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”کوئی پرائیویٹ سراغ رساں نہیں ہوں۔“

وہ کچھ دیر سوچنے کے بعد پرخیال انداز میں بولی۔ ”ٹھیک ہے، آپ وکالت کریں۔ سونیا کا سراغ میں کسی اور ذریعے سے لگوا لوں گی۔ اس کمینی کو دفع دور کرنے کے سلسلے میں تو آپ میری مدد کریں گے نا؟“

”ہاں، آپ کی یہ بات معقول ہے۔“ میں نے اثبات میں جواب دیا۔ ”میں اس سلسلے میں حیات کو آپ کی طرف سے ایک قانونی نوٹس بھیج سکتا ہوں لیکن یہ بھی اس صورت میں کہ آپ سونیا اور حیات کے بیچ قابل اعتراض تعلقات کو ثابت کر سکتی ہوں۔“

”یہی تو میں چاہتی نہیں ہوں۔“

”پھر آپ کیا چاہتی ہیں؟“

وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ ”میں حیات کو اس سلسلے میں ٹچ نہیں کرنا چاہتی۔ آپ کو جو کچھ بھی کرنا ہے، سونیا کے ساتھ کرنا ہے۔“

”اس کی وجہ جان سکتا ہوں؟“

”وہ میری اس حرکت سے بھڑک بھی سکتا ہے۔“ وہ رسان سے بولی۔ ”کیونکہ آپ کا ارسال کردہ نوٹس ظاہر ہے کہ میری طرف ہی سے ہو گا لہٰذا اس کا رد عمل میرے لئے نقصان دہ بھی ثابت ہو سکتا ہے۔“

”بہرحال آپ کو رسک تو لینا ہی پڑے گا۔“

”میں حیات کی طرف سے کوئی رسک نہیں لے سکتی۔“

میں نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ”آپ خواہ مخواہ خوف زدہ ہو رہی ہیں۔

آپ نے بتایا ہے کہ حیات آپ سے بے پناہ محبت کرتا ہے۔ ظاہر ہے وہ آپ کو نقصان پہنچانے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا ہو گا۔ نوٹس سے وہ محتاط ہو جائے گا اور ممکن ہے' راہ راست پر بھی آ جائے۔"

"اور اگر نتیجہ اس کے برعکس نکلا تو؟"

"آپ کے ذہن میں کیا ہے؟" میں نے اس کے سوال کا جواب دینے کے بجائے الٹا سوال کر دیا۔

وہ بولی۔ "وہ غصے میں آ کر مجھے طلاق بھی دے سکتا ہے۔ یا کم از کم مجھ سے علیحدگی اختیار کر سکتا ہے۔ مرد ذات کا کیا بھروسا' وہ کس وقت کون سا قدم اٹھا لے' کچھ کہا نہیں جا سکتا۔" پھر اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "ڈونٹ مائنڈ بیگ صاحب! آپ بھی مرد ہیں۔ میری بات کا غلط مطلب نہیں نکال لیجئے گا۔"

"آئی ڈونٹ کیئر۔" میں نے شانے اچکا کر مسکراتے ہوئے کہا۔ "مگر ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔" اس نے سوالیہ نظروں سے میری جانب دیکھا' میں نے پوچھا۔ "آپ کے بیان کے مطابق' آپ کی شادی کو کم و بیش آٹھ سال کا عرصہ گزر چکا ہے۔ آپ یہ بھی کہتی ہیں کہ حیات آپ سے بہت محبت کرتا ہے پھر اس کی ذات پر بھروسہ نہ کرنے کی وجہ سمجھنے سے قاصر ہوں۔ آپ کو یہ اندیشہ کیوں ہے کہ وہ آپ سے علیحدگی اختیار کر لے گا یا آپ کو طلاق دے دے گا؟"

اس نے عجیب سے لہجے میں سوال کیا۔ "کیا آپ اس بات کی گارنٹی دے سکتے ہیں کہ وہ ایسا کچھ نہیں کرے گا؟"

"ایسی گارنٹی تو کوئی بھی نہیں دے سکتا۔"

"جبھی تو میں کوئی رسک لینے کو تیار نہیں ہوں۔" جنت نے مدبرانہ انداز میں کہا۔ "اگر خدا نخواستہ حیات نے علیحدہ ہونے کا فیصلہ کر لیا تو میرے پاس کچھ بھی نہیں رہے گا۔ شاید پھر میں زندہ بھی نہ رہ سکوں۔"

میں نے پوچھا۔ "آپ کا کاروبار۔۔ میرا مطلب ہے کہ "برہانی ٹریڈرز" کس کے نام ہے؟"

میں نے یہ سوال ایک فوری خیال کے تحت کیا تھا۔ مجھے محسوس ہوا تھا کہ شاید

جنت اپنے کسی مالی نقصان کے بارے میں سوچ رہی تھی مگر اس کے جواب نے میرے خیال کی تردید کر دی تھی۔

"برہانی ٹریڈرز کی میں واحد مالک ہوں۔" جنت نے بتایا۔ "اس کے علاوہ بنگلہ بھی میرے نام ہی ہے۔ دونوں کاروں کی رجسٹریشن بھی میرے نام ہی سے ہے۔" اس نے چابیوں کے گچھے کی طرف اشارہ کیا۔ "مزدا میرے استعمال میں رہتی ہے جبکہ حیات ٹویٹا کریسیڈا استعمال کرتے ہیں۔"

مجھے اس کا جواب سن کر حیرت ہوئی۔ میں نے کہا۔ "یعنی طلاق یا علیحدگی کی صورت میں سراسر حیات ہی کا نقصان ہے؟"

"اگر آپ کی مراد مالی نقصان سے ہے تو آپ کے سوال کا جواب میں "ہاں" میں دوں گی۔" جنت نے میرے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ "اس صورت میں تمام مال و دولت' کاروبار' بنگلہ اور گاڑیاں سب کچھ میرا ہو جائے گا۔" ایک لمحے کے توقف سے اس نے اضافہ کیا۔ "اور یہ میرے لئے اتنا بڑا نقصان ہو گا کہ میں جس کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔"

وہ میری حیرتوں میں پے در پے اضافہ کر رہی تھی۔ میں نے پوچھا۔ "اس صورت میں بھلا آپ کا کیا نقصان ہو گا؟"

وہ خواب ناک لہجے میں بولی۔ "بیگ صاحب! میں نے حیات سے محبت کی ہے۔ وہ میرا محبوب ہے۔ میں اسے کھو کر زندہ نہیں رہ سکتی۔ میں اس کی خاطر ہر چیز سے دستبردار ہو سکتی ہوں۔ وہ میری نس نس میں لہو بن کر گردش کر رہا ہے۔ میں تو اس کی جدائی کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔ میں اس کی ذرا سی ناراضگی بھی برداشت نہیں کر سکتی۔ سمجھے آپ؟" اس کی آواز میں جذبات بول رہے تھے۔ یہ دل کی گہرائی سے نکلنے والی آواز تھی۔

"ٹھیک ہے۔" میں نے ایک طویل سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ "میں سب سمجھ گیا۔ آپ بے فکر ہو جائیں۔"

"اب آپ کا کیا ارادہ ہے؟"

"میں اپنی سی پوری کوشش کروں گا۔" میں نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ "آپ تین روز کے بعد تشریف لائیں۔ میں سونیا کے نام ایک نوٹس تیار کر کے رکھوں گا۔ آپ آ کر

دستخط کر دیجئے گا۔ جب تک آپ سونیا کا پتہ ٹھکانا معلوم کر لیں۔"

"آپ وکیل ہیں جو مناسب سمجھیں وہ راہ نکال لیں۔" جنت نے کہا۔ "بس میں تو اتنا چاہتی ہوں کہ وہ چڑیل میرے شوہر کا پیچھا چھوڑ دے۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے کہا اور وکالت نامہ نکال کر اس کے سامنے رکھ دیا۔ "اسے پر کر دیں اور نیچے دستخط بھی کر دیں۔"

اس نے وکالت نامے پر ایک سرسری سی نظر ڈالی پھر تمام اندراج مکمل کرنے کے بعد دستخط کر دیئے۔

"یہ میرے ریکارڈ کی درستی کے لئے ہے۔" میں نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا۔ "یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ آپ نے ایک کام میرے سپرد کیا ہے اور میں نے وہ کام کرنے کا وعدہ کیا ہے۔ آپ اسے ایک رسمی سی کارروائی سمجھ لیں۔"

پھر اس نے میری فیس کی بابت دریافت کیا۔ میں نے اپنی فیس بتا دی۔ عام موکلوں کی طرح نہ تو اس نے مجھ پر لوٹ کھسوٹ کا الزام لگایا اور نہ ہی فیس میں رعایت کروانے کی کوشش کی۔ اس نے خاموشی سے اپنے ہینڈ بیگ سے میری مطلوبہ فیس کی رقم نکال کر میرے حوالے کر دی۔ میں نے اسے رسید دی۔ اس کے بعد وہ سمندر عورت تین روز بعد آنے کا وعدہ کر کے میرے دفتر سے رخصت ہو گئی۔

○

تین روز گزر جانے کے باوجود جنت نے میرے دفتر کا رخ نہیں کیا۔ میں نے اس دوران میں سونیا کو دیے جانے والے نوٹس کا مضمون ٹائپ کروا لیا تھا۔ اب بس اس کے ایڈریس کا انتظار تھا۔ میں نے سوچا، ممکن ہے جنت ابھی تک اس کا سراغ لگانے میں کامیاب نہ ہوئی ہو۔

چھٹے روز میں عدالتی مصروفیات سے فارغ ہو کر دفتر پہنچا ہی تھا کہ اس کا فون آ گیا۔

"بیگ صاحب! میں نے اس حرافہ کو ٹریس کر لیا ہے۔" اس کی آواز میں دبا دبا جوش تھا۔

میں نے کہا۔ "ٹھیک ہے، آپ آج ہی میرے دفتر چلی آیئے۔"

"ابھی میرا کام پورا نہیں ہوا۔" ریسیور میں اس کی آواز ابھری۔ "مجھے معلوم ہو گیا ہے کہ وہ کلفٹن برج کے نزدیک نو تعمیر شدہ لگژری اپارٹمنٹس میں مقیم ہے لیکن اس کے اپارٹمنٹ کا نمبر وغیرہ ابھی حاصل نہیں ہوا۔"

"آپ کو یہ سب کیسے پتہ چلا؟"

"میرا جاسوس بہت تیز رفتاری سے کارکردگی دکھا رہا ہے۔" جنت نے کہا۔ اس نے "برہانی ٹریڈرز" ہی کے ایک ملازم کو اعتماد میں لے کر حیات کی نگرانی کی ذمے داری سونپ دی تھی۔ مذکورہ شخص کے پاس اپنی موٹر سائیکل تھی اس لئے اس کا کام بہت آسان ہو گیا تھا۔ یہ تمام معلومات مجھے جنت کی زبانی پتہ چلی تھیں۔

"میں نے ضروری نوٹس تیار کر لیا ہے۔" میں نے کہا۔ "بس آپ کے دستخط کی ضرورت ہے۔"

وہ بولی۔ "میں بہت جلد خوش خبری کے ساتھ آپ کے پاس آؤں گی۔"

"وش یو گڈ لک۔"

اس نے میرا شکریہ ادا کرنے کے بعد فون بند کر دیا۔

دو روز بعد میں حسب معمول صبح کے اخبار کا مطالعہ کر رہا تھا کہ سٹی پیج کی ایک خبر نے مجھے چونکنے پر مجبور کر دیا۔ میں توجہ سے خبر کی تفصیل پڑھنے لگا۔ لکھا تھا۔ "گزشتہ رات ماڈ ہائٹس میں سونیا نامی ایک عورت کو جنسی تشدد کے بعد قتل کر دیا گیا۔ سونیا مذکورہ اپارٹمنٹس میں تنہا رہتی تھی اور ابھی چند روز قبل ہی یہاں آباد ہوئی تھی۔ پولیس کو ایک نامعلوم شخص کی تلاش ہے جو روزانہ باقاعدگی سے مقتولہ سونیا سے ملنے آتا تھا اور اس کے پاس خاصا وقت گزار کر جاتا تھا۔ پولیس نے اس نامعلوم شخص کے خلاف رپورٹ درج کر کے تفتیش شروع کر دی ہے۔"

اگرچہ یہ ایک مختصر سی خبر تھی مگر میں اس کو بہت دور تک سمجھ رہا تھا۔ خبر میں جس نامعلوم شخص کا ذکر کیا گیا تھا وہ حیات یزدانی کے سوا کوئی اور نہیں ہو سکتا تھا۔ میں نے سوچا، آفس جا کر جنت سے رابطہ کروں گا اور صورتحال کی حقیقت جاننے کی کوشش کروں گا مگر تھوڑی ہی دیر بعد اس کا فون آ گیا۔ اس وقت میں ناشتے سے فارغ ہو چکا تھا اور عدالت جانے کی تیاری کر رہا تھا۔

اس کی آواز میں گھبراہٹ کا عنصر نمایاں تھا۔ ”بیگ صاحب! معاملہ بگڑ گیا ہے۔“ اس نے چھوٹتے ہی کہا۔ ”حیات بے حد پریشان ہیں۔“

میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔ ”میں نے اخبار میں سب کچھ پڑھ لیا ہے۔ کیا یہ وہی سونیا ہے جس کا آپ بندوبست کروانا چاہتی تھیں؟

میں نے بندوبست کا لفظ دانستہ استعمال کیا تھا۔ مجھے پہلا شک یہی گزرا تھا کہ کہیں سونیا کے قتل میں درپردہ جنت کا ہاتھ نہ ہو۔

وہ جلدی سے بولی۔ ”بالکل وہی ہے۔ قدرت نے خود ہی اس کا بندوبست کر دیا ہے۔ آپ کو اس سلسلے میں اب زحمت نہیں اٹھانا پڑے گی مگر حیات کی پوزیشن بہت نازک ہو گئی ہے۔ پولیس کو نامعلوم شخص تک پہنچنے میں دیر نہیں لگے گی۔“

”آپ کا کیا خیال ہے؟“ میں نے پوچھا۔ ”حیات اس معاملے میں کس حد تک ملوث ہے۔ کیا آپ کی اس سلسلے میں اس سے کوئی بات ہوئی ہے؟“

”نہیں‘ حیات قتل ایسا جرم نہیں کر سکتا۔“ وہ اضطراری لہجے میں بولی۔ ”یقیناً اسے پھنسانے کے لئے کوئی سازش بنی گئی ہے۔“

”حیات خود کیا کہتا ہے؟“

اس نے جواب دیا۔ ”اس نے اس واقعے پر کوئی تبصرہ نہیں کیا تاہم میں دیکھ رہی ہوں کہ اس کی حالت بہت خراب ہے۔ وہ آج دفتر بھی نہیں گیا۔“

”آپ کی ادا کی ہوئی رقم میرے پاس امانت کے طور پر رکھی ہوئی ہے۔“ میں نے کہا۔ ”جب چاہیں آ کر لے جائیں۔ شاید اب آپ کو میری ضرورت نہ پڑے۔ میں نے جس کام کی فیس وصول کی تھی اب اس کا کوئی سوال باقی نہیں رہا۔“

”میں آپ سے بعد میں بات کروں گی۔“ اس نے کہا اور فون بند کر دیا۔

میں نے جلدی جلدی تیاری کی اور عدالت روانہ ہو گیا۔

دوسرے روز کسی گمنام فون پر پولیس نے حیات یزدانی کو سونیا کے قتل کے الزام میں گرفتار کر لیا۔ جنت ایک مرتبہ پھر میرے دفتر میں موجود تھی۔ ”بیگ صاحب! مجھے یقین ہے کہ حیات کو کسی سوچی سمجھی سازش کے تحت پھانسا گیا ہے۔ آپ کو حیات کا مقدمہ لڑنا ہے۔ میں اس کا بال بھی بیکا ہوتے ہوئے نہیں دیکھ سکتی۔“

”اس وقت حیات کہاں ہے؟“

”پولیس کی تحویل میں ہے۔“ اس نے بتایا۔ ”وہ کل صبح اسے عدالت میں پیش کر کے ریمانڈ حاصل کرنا چاہتے ہیں۔“

”دیکھیں‘ جنت صاحبہ۔“ میں نے دو ٹوک لہجے میں کہا۔ ”میں یہ کیس لوں گا یا نہیں‘ اس بات کا فیصلہ تو میں حیات سے ملنے کے بعد ہی کروں گا۔“

اس نے مجھے متعلقہ تھانے کا نام بتایا پھر کہا۔ ”آپ ابھی اس سے مل لیں۔“

میں نے گھڑی میں وقت دیکھا‘ ساڑھے چار بجے تھے۔ میں نے تسلی آمیز لہجے میں جنت سے کہا۔ ”آپ اطمینان سے گھر جائیں۔ میں دفتر سے اٹھنے کے بعد تھانے جا کر حیات سے مل لوں گا۔“

وہ امید افزا نظروں سے میری جانب دیکھتے ہوئے رخصت ہو گئی۔

حیات یزدانی سے ملاقات کے لئے مجھے مخصوص ہتھکنڈے استعمال کرنے پڑے تھے جو اس قسم کے معاملات میں میرے آزمودہ تھے۔ حیات سے مجھے جو تفصیلات حاصل ہوئیں وہ حیرت انگیز ہونے کے ساتھ ساتھ انتہائی دلچسپ بھی تھیں۔ میں مختصر طور پر انہیں آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔

چھ ماہ قبل حیات یزدانی سونیا سے شادی کر چکا تھا۔ دفتر سے برخاست کرنے کے بعد حیات مسلسل سونیا سے ملتا رہا تھا۔ وہ دونوں شادی کے لئے ذہنی طور پر تیار تھے مگر سونیا نے ایک ایسا مطالبہ کر دیا تھا جس سے لالچ کی بو آتی تھی۔ حیات اس وقت تک سونیا پر بری طرح مرمٹا تھا کہ اسے سونیا کا ہر جائز و ناجائز مطالبہ ماننے میں کوئی گریز نہیں تھا۔ حیات نے سونیا کے مطالبے کے عین مطابق اس سے وعدہ کر لیا کہ وہ اسے شادی کے فوراً بعد اس کے نام سے گھر لے کر دے گا اور اس کے حسب منشا بینک میں اس کے اکاؤنٹ میں رقم بھی جمع کروا دے گا۔ اس کے بدلے اس نے سونیا کو رضامند کر لیا تھا کہ وہ ہمیشہ اس شادی کو خفیہ رکھے گی۔

ان کی شادی ہو گئی مگر حیات نے اپنا وعدہ پورا نہیں کیا۔ وہ اس دوران میں سونیا کو مختلف کرائے کے گھروں میں رکھ رہا تھا۔ سونیا کو ہر دو ماہ بعد گھر بدلنے پر حیرت بھی تھی۔ جنت نے ڈیفنس سوسائٹی والے جس بنگلے کا جمی کے توسط سے سراغ لگایا تھا وہ بھی کرائے

کا تھا۔ سونیا کو اپنی توقعات پوری ہوتی نظر نہیں آئیں تو اس نے حیات کو دھمکی دے دی کہ اگر اس نے ایک ماہ کے اندر اپنا وعدہ ایفا نہ کیا تو وہ اس شادی کا بھانڈا پھوڑ دے گی اور اس مہم کا آغاز وہ جنت سے کرے گی۔ چنانچہ اسلام آباد جانے سے چند روز قبل حیات نے سونیا کا مطالبہ پورا کر دیا۔ اب سونیا کے اکاؤنٹ میں اس کی مطلوبہ رقم بھی موجود تھی اور وہ اپنے ذاتی لگژری اپارٹمنٹ میں منتقل ہو چکی تھی۔

شادی جیسے نازک بندھن میں بندھنے کے لئے انہوں نے ایک دوسرے کے سامنے جو عجیب و غریب مطالبے رکھے تھے وہ مبنی بر لالچ نظر آتے تھے مگر وہ اس کے لئے مجبور تھے۔ دونوں کی اپنی اپنی ترجیحات تھیں ان ٹھوس وجوہات کا ذکر مناسب موقع پر آئے گا۔ دونوں ایک دوسرے کے تعاقب میں اتنی دور نکل گئے تھے کہ واپسی کھو بیٹھے تھے۔

وقوعہ کی رات ماڈہائٹس کے اس اپارٹمنٹ میں جو کچھ پیش آیا اس کی تفصیلات جاننے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ قتل حیات نے نہیں کیا تھا۔ وہ بے قصور تھا اور کسی سازش کا شکار ہوا تھا۔ مجھے حیات کی بے گناہی کا یقین ہو چکا تھا اس لئے میں نے اس کا کیس لینے کا فیصلہ کر لیا۔ اسے تسلی تشفی دینے کے بعد میں نے وکالت نامہ پر اس کے دستخط لئے اور دوسرے روز عدالت میں ملاقات کا وعدہ کر کے وہاں سے چلا آیا۔

* * *

حیات یزدانی اور سونیا کی شادی کا راز اب راز نہیں رہا تھا۔ اس انکشاف سے جنت کو ایک ذہنی دھچکا پہنچا تھا مگر اسے اس بات کا اطمینان بھی تھا کہ اس کی سوکن اب اس دنیا میں نہیں رہی تھی۔ اس کا شوہر اب صرف اور صرف بلاشرکت غیرے اسی کا تھا لیکن اس شوہر کے سر پر ننگی تلوار لٹک رہی تھی۔ اس پر سونیا کے قتل کا الزام تھا اور جنت نے اسے بچانے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

پولیس نے حیات کو عدالت میں پیش کر کے سات روز کا ریمانڈ حاصل کر لیا تھا۔ میں نے حیات کو یقین دلایا تھا کہ پہلی ہی پیشی پر میں اس کی ضمانت کروا لوں گا' وہ کوئی فکر نہ کرے۔ مجھے اطمینان تھا کہ پولیس ریمانڈ کے دوران میں اس پر تشدد سے گریز کرے گی کیونکہ اس کا تعلق معاشرے کے اونچے طبقے سے تھا۔ ایسے لوگ پولیس والوں کی پیدا کا

بہترین ذریعہ ہوتے ہیں۔

میں ایک بات آپ کو بتانا بھول گیا کہ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ میں مقتولہ کی موت کا وقت نو بجے سے دس بجے شب تک بتایا گیا تھا۔ اسے موت کے گھاٹ اتارنے سے پہلے جنسی تشدد کا نشانہ بنایا گیا تھا۔ بعد ازاں اس کے سینے میں ریوالور کے دو فائر کر کے اسے ابدی نیند سلا دیا گیا تھا۔ اسلحے کے ماہرین نے رپورٹ دی تھی کہ اعشاریہ تین دو کا ریوالور استعمال کیا گیا تھا اور سونیا کی موت انہی گولیوں کی وجہ سے واقع ہوئی تھی۔ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے مطابق مقتولہ کو جنسی زیادتی کا نشانہ بنانے سے پہلے گلا گھونٹ کر بے ہوش کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ سب سے زیادہ چونکا دینے والی بات یہ تھی کہ سونیا حاملہ تھی۔

یہی وہ اہم نکتہ تھا جس کی بنا پر میں نے حیات کا کیس لینے کا فیصلہ کیا تھا اور اسی بات نے مجھے یقین دلایا تھا کہ وہ بے گناہ ہے۔

پولیس نے سات روز کا ریمانڈ پورا کرنے کے بعد مزید سات روز کے ریمانڈ کی درخواست کی۔ پولیس ابھی تک آلہ قتل برآمد نہیں کر سکی تھی۔ مذکورہ کیلیبر کے ریوالور کی تلاش میں پولیس نے حیات کے بنگلے اور دفتر کا کونا کونا چھان مارا تھا مگر کوئی مثبت نتیجہ سامنے نہیں آیا تھا۔ تاہم بنگلے سے پولیس کو حیات کا ذاتی لائسنس یافتہ ریوالور مل گیا تھا مگر یہ اعشاریہ دو پانچ کا ریوالور تھا جب کہ مقتولہ کے جسم سے برآمد ہونے والی گولیاں اعشاریہ تین دو کے ریوالور سے چلائی گئی تھیں۔

مقدمے کی کارروائی شروع ہوئی تو میں نے جج کے سامنے درخواست ضمانت پیش کر دی پھر اپنی جگہ پر آ کر بیٹھ گیا۔

سرکاری وکیل نے اٹھ کر کہا۔ ”یور آنر' پولیس نے ابھی تک چالان پیش نہیں کیا۔ ابھی اس مقدمے کی تفتیش مکمل نہیں ہوئی۔ آلہ قتل برآمد ہونا باقی ہے۔ پولیس اپنی سی پوری کوشش کر رہی ہے۔ ملزم ایک با اثر شخص ہے اور گواہوں پر اثر انداز ہو سکتا ہے اس لئے پولیس کی تفتیش مکمل ہونے سے پہلے ملزم کی درخواست ضمانت منظور کرنا قانونی تقاضوں کے منافی ہے۔“

”جناب عالی۔“ میں نے اپنی جگہ سے اٹھ کر کہا۔ ”قانونی تقاضے' انصاف کے

تقاضے سے باہر نہیں ہو سکتے اور انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ میرے موکل کی درخواست ضمانت ضرور منظور کی جائے۔" ایک لمحے کے توقف سے میں نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "یور آنر' میرے موکل کی گرفتاری سراسر بدنیتی اور سازش پر مبنی ہے۔۔ میرا موکل بے گناہ ہے اور اس کا مقتولہ سونیا یعنی اپنی بیوی کے قتل میں کوئی ہاتھ نہیں ہے۔"

"اس بات کا فیصلہ کرنا عدالت کا کام ہے کہ ملزم کے خلاف کوئی سازش کی گئی ہے یا اس نے سوچی سمجھی سازش کے تحت اپنی بیوی کو ٹھکانے لگایا ہے۔ پولیس کے پاس ایسے گواہ موجود ہیں جن کا بیان ملزم کو مجرم ثابت کرنے کے لئے کافی ہے۔"

"جناب عالی' پولیس کے پاس ملزم کی گرفتاری کا اس کے سوا اور کوئی جواز نہیں ہے کہ انہیں ایک گم نام ٹیلی فون کال موصول ہوئی تھی۔ ٹیلی فون کرنے والے شخص نے بتایا تھا کہ مقتولہ سے ملنے آنے والا شخص حیات یزدانی تھا جو باقاعدہ روزانہ اس کے پاس آتا تھا۔ اس وقت تک کسی کو معلوم نہیں تھا کہ سونیا اور حیات میاں بیوی تھے۔ یہ بات بھی اس گم نام شخص نے پولیس تک پہنچائی تھی۔" میں نے چند لمحے توقف سے اپنی بات جاری رکھی۔ "یور آنر' اصولی طور پر تو یہ ہوتا ہے کہ جب پولیس کو اس قسم کی اطلاعات موصول ہوتی ہیں تو وہ آنکھ بند کر کے ان پر یقین نہیں کر لیتی بلکہ پہلے تصدیق کی جاتی ہے کہ اطلاع فراہم کرنے والا شخص معتبر بھی ہے یا نہیں۔ اس کے بعد کوئی عملی قدم اٹھایا جاتا ہے مگر اس کیس میں ایسی کوئی احتیاط ملحوظ خاطر نہیں رکھی گئی۔ اس کے علاوہ میرے فاضل دوست نے جن گواہوں کا تذکرہ کیا ہے' ان کے بیانات کا پول تو جرح کے دوران میں ہی بہ خوبی کھل سکے گا۔ مجھے یقین ہے کہ ان کا جھوٹ میری جرح کا سامنا نہیں کر سکے گا۔"

وکیل سرکار نے کہا۔ "جناب عالی' ملزم کی گرفتاری کی بنیاد محض گمنام ٹیلی فون کال ہی نہیں ہے بلکہ پولیس کے پاس اور بھی بہت سے ثبوت ہیں۔"

"یور آنرز!" میں نے جج کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "میری فاضل عدالت سے درخواست ہے کہ وکیل استغاثہ کو وہ ثبوت پیش کرنے کی ہدایت کی جائے۔"

جج نے سوالیہ نظروں سے سرکاری وکیل کی جانب دیکھا۔ وہ جلدی سے بولا۔ "جناب عالی' ابھی ان شواہد کا ذکر مناسب نہیں ہے کیونکہ پولیس کی تفتیش ابھی جاری ہے' اس میں کوئی رکاوٹ پیدا ہو سکتی ہے۔"

میں کہا۔ "جناب عالی' میرا موکل اس شہر کا ایک معزز بزنس مین ہے۔ ملک اور ملک سے باہر اس کا کروڑوں کا کاروبار پھیلا ہوا ہے۔ اس کیس میں گرفتاری کی وجہ سے اس کی نیک نامی متاثر ہو رہی ہے۔ اس پر جو گھناؤنا الزام لگایا گیا ہے' وہ اس کی کاروباری ساکھ تباہ کر رہا ہے۔ میرا موکل نہ تو پولیس کی تفتیش میں رکاوٹ بن سکتا ہے اور نہ ہی کسی طرح استغاثہ کے گواہان پر اثر انداز ہو سکتا ہے۔ لہٰذا معزز عدالت سے میری استدعا ہے کہ وہ ملزم حیات یزدانی کو ضمانت پر ذاتی مچلکے پر رہا کر دے۔ دیٹس آل یور آنر۔"

وکیل استغاثہ نے ایک مرتبہ پھر ضمانت رکوانے کی کوشش کی۔ وہ خاصی دیر تک ایک ہی بات کو مختلف انداز میں بیان کرتا رہا۔ جج چند لمحوں تک اس کی تقریر سنتا رہا۔ وکیل استغاثہ کے دلائل ختم ہوئے تو جج نے کہا۔ "یہ سب کچھ تو آپ پہلے بھی کہہ چکے ہیں۔"

"جناب عالی!" وکیل سرکار نے کہا۔ "پولیس کی تفتیش ابھی جاری ہے۔ بہت سی باتیں قبل از وقت نہیں کہی جا سکتیں۔ جب اس مقدمے کی باقاعدہ سماعت شروع ہو گی تو میں وہ اہم نکات سامنے لاؤں گا فی الحال میری معزز عدالت سے پرزور درخواست ہے کہ یہ ایک قتل کا کیس ہے اور قتل بھی بہیمانہ اس لئے ملزم کی ضمانت منظور کرنا انصاف کے تقاضوں کے منافی ہو گا جب کہ مقتولہ کو قتل کرنے سے پہلے جنسی تشدد۔۔۔"

میں نے فوراً ہی اس کی بات کاٹ دی۔ "یور آنر' جس طرح پولیس نے یہ فرض کر لیا کہ میرے موکل نے اپنی بیوی کو قتل کیا ہے اسی طرح وہ مقتولہ سے ہونے والی زیادتی کو بھی میرے موکل کے کھاتے میں ڈالنے کی کوشش کر رہے ہیں جب کہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ ملزم حیات یزدانی کو ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت پھانسے کی بھرپور کوشش کی گئی ہے۔ میں وقت آنے پر موکل کی بے گناہی کو ثابت کر دوں گا۔ ویسے بھی ابھی کوئی بات ثابت نہیں ہوئی اس لئے میرے موکل کی ضمانت منظور ہونے میں کوئی رکاوٹ نہیں ہونا چاہئے۔

"جو بات ابھی تک ثابت نہیں ہوئی وہ جرح کے دوران میں ثابت ہو جائے گی۔" وکیل سرکار نے میرے موکل کی ضمانت رکوانے کی آخری کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "ملزم

حیات یزدانی خطرناک قاتل۔۔۔"

"آپ پرانی باتیں ہی دہراتے رہیں گے یا کوئی نئی بات بھی کریں گے۔" جج نے ذرا سخت لہجے میں کہا۔ پھر پچاس ہزار کے ذاتی مچلکے پر حیات کی رہائی کا حکم صادر کر دیا۔

"جناب عالی۔" میں نے جج کی جانب مڑتے ہوئے کہا۔ "معزز عدالت سے میری چھوٹی سی درخواست ہے کہ پولیس کو جلد از جلد چالان پیش کرنے کی تاکید کی جائے کیوں کہ مقدمے میں تاخیر کی وجہ سے میرے موکل کی شہرت متاثر ہو رہی ہے۔"

جج نے پولیس کو دس روز کے اندر اندر چالان پیش کرنے کے آرڈر جاری کر دیئے۔

○

پولس نے جج کی دی ہوئی مقررہ مدت سے دو روز قبل ہی چالان پیش کر دیا تاہم آلہ قتل برآمد نہیں ہو سکا تھا۔

ابتدائی چند پیشیاں عدالت کی تکنیکی کارروائی کی نذر ہو گئیں۔ پانچ ماہ بعد اس مقدمے کی باقاعدہ سماعت شروع ہوئی۔ پولیس نے اپنی کارگزاری کی جو رپورٹ پیش کی تھی اس کا خلاصہ کچھ یوں ہے۔

ماڈہائٹس میں سونیا کو آئے ہوئے کچھ زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا لیکن اس کے باوجود دائیں بائیں کے لوگ اس میں دلچسپی لینے لگے تھے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ وہ تنہا رہتی تھی۔ خیر یہ کوئی اتنی بڑی بات نہ تھی۔ لوگوں کو سونیا کی جانب توجہ دینے پر جس بات نے مجبور کیا وہ حیات کی وہاں آمدورفت تھی۔ کسی کو یہ بات معلوم نہ تھی کہ وہ دونوں میاں بیوی ہیں۔ ایسی پراسرار سرگرمیوں میں نچلی سطح کے لوگ کچھ زیادہ ہی نظر رکھتے ہیں اور پھر کچھ ہوا بھی ایسا ہی۔

سونیا کا فلیٹ کارنر فلیٹ تھا اور بلڈنگ کے فرسٹ فلور پر واقع تھا۔ اس کی ایک جانب بغلی گلی میں مختلف دکانیں اور اسٹوز وغیرہ تھے۔ بلڈنگ کی پارکنگ کا راستہ بھی اسی بغلی گلی کی طرف تھا۔ سونیا کے اپارٹمنٹ کی کچھ کھڑکیوں کا رخ بغلی گلی کی جانب تھا۔ حیات کی گاڑی جیسے ہی بلڈنگ میں داخل ہوتی، تجسّس پسند دکان دار اپنی نگاہیں سونیا کے اپارٹمنٹ کی کھڑکیوں پر لگا دیتے تاہم وہ کوئی دلچسپ نظارہ دیکھنے سے محروم رہتے تھے کیونکہ کھڑکیوں پر دبیز پردے پڑے رہتے تھے۔

وقوعہ کی رات خلاف معمول کھڑکیوں کے پردے ہٹے ہوئے تھے۔ حیات اپنے وقت پر آیا اور گاڑی پارک کرنے کے بعد اوپر چلا گیا۔ دکانوں پر موجود لوگوں نے حیات اور سونیا کو ایک دو بار کھڑکیوں کے پاس سے گزرتے ہوئے دیکھا۔ کچھ دیر بعد ایسی آوازیں آنے لگیں جیسے وہ دونوں آپس میں جھگڑا کر رہے ہوں پھر کھڑکی میں سونیا کی جھلک نظر آئی، وہ پردے برابر کرنے آئی تھی۔ حیات بھی اس کے پیچھے تھا اور غصے میں تیز تیز کچھ بول رہا تھا۔ سونیا نے جلدی سے کھڑکیاں بند کرنے کے بعد پردے کھینچ دیئے۔ تھوڑی دیر بعد حیات غصے میں ڈرائیونگ کرتا ہوا۔۔۔ وہاں سے چلا گیا۔

چوکیدار اپنے معمول کے راؤنڈ پر تھا کہ اسے سونیا کے اپارٹمنٹ کا دروازہ کھلا ہوا نظر آیا۔ ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ حیات کے جانے کے بعد سونیا دروازہ بند ہی رکھتی تھی۔ چوکیدار نے گھنٹی بجائی تاکہ سونیا کو دروازہ بند کرنے کے لئے کہہ سکے مگر تین چار بار گھنٹی بجانے کے بعد بھی اندر کوئی ردعمل ظاہر نہ ہوا۔ تجسّس کے ہاتھوں مجبور ہو کر وہ فلیٹ کے اندر داخل ہو گیا۔ وہ ایک غیر اخلاقی حرکت کر رہا تھا مگر اس کا یہ فعل غیر ارادی تھا۔ پھر اسے سونیا کی لاش نظر آ گئی۔ وہ حواس باختہ ہو کر باہر دوڑا اور فوراً پولیس کو فون کر دیا۔ کچھ ہی دیر بعد پولیس وہاں موجود تھی۔

پولیس نے پہلے تو بلڈنگ کے چوکیدار گل شیر کو بھی شامل تفتیش کر لیا تھا پھر اسے استغاثہ کے گواہوں میں شامل کر لیا۔ گل شیر کے بیان اور گمنام ٹیلی فون کے بعد پولیس نے سونیا کے قتل کے الزام میں حیات یزدانی کو گرفتار کر لیا۔ دکان داروں سے پوچھ گچھ کے بعد تو پولیس کو یقین ہو گیا کہ قاتل حیات یزدانی ہی تھا۔

مقدمے کی باقاعدہ کارروائی شروع ہوئی۔ سب سے پہلے استغاثہ کے گواہوں کو پیش کیا گیا۔ جج نے فائل کا بہ غور مطالعہ کرنے کے بعد پہلے گواہ کو کٹہرے میں طلب کر لیا۔

بلڈنگ کے چوکیدار گل شیر نے سچ بولنے کا حلف اٹھایا پھر وہی بیان دیا جو وہ اس سے پہلے پولیس کو دے چکا تھا۔ اس کا بیان ختم ہوا تو وکیل استغاثہ نے سوالات کا آغاز

کیا۔ اس نے ملزموں کے کٹہرے میں کھڑے ہوئے حیات یزدانی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ "گل شیر صاحب! آپ اس شخص کو پہچانتے ہیں؟"

"جی ہاں۔" اس نے اثبات میں جواب دیا۔ "یہ روزانہ بی بی سے ملنے آتا تھا۔"

"جس روز سونیا کا قتل ہوا' اس روز بھی آپ نے ملزم کو دیکھا تھا؟"

"یہ اس روز بھی آیا تھا اور بہت غصے میں واپس گیا تھا۔"

وکیل استغاثہ نے پوچھا۔ "ذرا سوچ کر بتایئے' جب ملزم سونیا سے ملنے کے بعد واپس چلا گیا تھا تو اس کے بعد بھی کوئی سونیا کے اپارٹمنٹ میں گیا تھا؟"

"نہیں جناب' مجھے اچھی طرح یاد ہے' اس کے بعد کوئی نہیں آیا تھا۔"

"پھر کیا ہوا؟"

وکیل سرکار کے اس سوال کے جواب میں شیر گل نے اپنا بیان ایک مرتبہ پھر دہرا دیا۔

وکیل سرکار کے سوالات ختم ہوئے تو میں نے جرح کا آغاز کیا۔ "گل شیر صاحب! آپ کو ماڈ ہائٹس میں چوکیداری کرتے ہوئے کتنا عرصہ ہوا ہے؟"

"ابھی ایک سال ہوا ہے۔"

"کیا آپ کو معلوم تھا کہ سونیا حیات کی بیوی ہے؟"

"نہیں جناب' یہ بات تو مجھے پولیس نے بتائی ہے۔"

"آپ نے اپنے بیان میں پولیس کو بتایا ہے کہ ملزم روزانہ باقاعدگی سے سونیا سے ملنے آتا تھا۔ آپ کے دل میں کبھی تجسس پیدا نہیں ہوا کہ ان کے تعلق کے بارے میں کچھ جاننے کی کوشش کریں؟"

وہ بولا۔ "میں اپنے کام سے کام رکھنے والا آدمی ہوں۔ ویسے بھی میں کسی کی نجی زندگی میں جھانکنے کی کوشش نہیں کرتا۔"

"بہت خوب۔" میں نے جج کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ "یور آنر گواہ کا بیان ہے کہ وہ کسی کی نجی زندگی میں کوئی دلچسپی نہیں رکھتا۔ جب کہ پولیس کے بیان کے مطابق گواہ سونیا کا دروازہ کھلا دیکھ کر فلیٹ کے اندر داخل ہو گیا تھا۔"

چوکیدار نے پریشان نظروں سے سرکاری وکیل کی طرف دیکھا۔ میں نے اگلا سوال

کیا۔ "گل شیر صاحب! آپ نے بیان دیا ہے کہ ملزم روزانہ باقاعدگی سے سونیا سے ملنے آتا تھا۔ آپ معزز عدالت کو بتائیں گے کہ وہ عموماً کتنے بجے آتا تھا؟"

وہ کچھ دیر سوچنے کے بعد بولا۔ "تقریباً سات بجے۔"

"صبح سات بجے یا شام کو؟"

"شام کو جناب۔ وہ صبح میں کبھی نہیں آیا۔"

میں نے پوچھا۔ "اس کی واپسی کب تک ہوتی تھی؟"

"یہی کوئی لگ بھگ دس بجے رات۔"

میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سوال کیا۔ "ذرا اچھی طرح سوچ سمجھ کر جواب دینا' وقوعہ والی رات بھی ملزم دس بجے ہی روانہ ہوا تھا؟"

اس کے چہرے پر تذبذب کے آثار نظر آنے لگے۔ "مجھے اچھی طرح یاد نہیں ہے مگر خیال ہے کہ وہ حسب معمول دس بجے ہی واپس گیا ہو گا۔"

"گیا ہو گا اور گیا تھا کے دو مختلف معانی نکلتے ہیں۔" میں نے ذرا سخت لہجے میں کہا۔ "آپ کی کون سی بات کو سچ مانا جائے؟"

"آبجیکشن یور آنر!" سرکاری وکیل نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا۔ "میرے فاضل دوست گواہ کو الجھانے کی کوشش کر رہے ہیں جب کہ وہ بتا چکا ہے کہ ملزم وقوعہ کی رات بھی حسب معمول ہی واپس گیا تھا۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا پھر گل شیر سے پوچھا۔ "گل شیر صاحب! آپ نے ابھی تھوڑی دیر پہلے وکیل استغاثہ کے سوال کے جواب میں بتایا ہے کہ ملزم کے جانے کے بعد سونیا سے ملنے کوئی نہیں آیا تھا؟"

اس نے اثبات میں سر کو جنبش دی پھر کہا۔ "میں نے یہی کہا تھا۔"

"گل شیر صاحب! کیا آپ ملزم کے روانہ ہونے کے بعد کہیں گئے تھے۔ میرا مطلب ہے تھوڑی دیر کے لئے اپنی ڈیوٹی سے ہٹے تھے۔ بہت سوچ سمجھ کر جواب دیجئے گا۔ آپ کے جواب کی بڑی اہمیت ہے۔ جھوٹ بولنے کی صورت میں آپ کی گردن بھی پھنس سکتی ہے۔"

"مجھے سخت اعتراض ہے جناب عالی!" سرکاری وکیل نے احتجاجی لہجے میں کہا۔

"وکیل صفائی، معزز گواہ کو دھمکی دینے کی کوشش کر رہے ہیں۔"

"میں نے ایسی کوئی کوشش نہیں کی یور آنر!" میں نے دونوں ہاتھ پھیلاتے ہوئے جج کی جانب دیکھا۔ "کسی کو جھوٹ بولنے سے منع کرنا اگر دھمکی کے زمرے میں آتا ہے تو میں ایسی دھمکی سے باز آیا۔"

جج نے وکیل استغاثہ کے اعتراض کو رد کرتے ہوئے گل شیر سے کہا۔ "وکیل صاحب جو پوچھ رہے ہیں اس کا جواب دیں۔"

وہ اٹک اٹک کر بولا۔ "میں دس پندرہ منٹ کے لئے قریبی ہوٹل سے چائے پینے چلا گیا تھا۔"

"یعنی اگر اس دوران میں کوئی بلڈنگ میں داخل ہوا تھا اور وہ سونیا سے ملنے اس کے فلیٹ پر گیا تھا تو آپ اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتے؟"

اس نے مختصر سا جواب دیا۔ "جی!"

میں نے پوچھا۔ "گل شیر صاحب! آپ حسب معمول کے راؤنڈ پر تھے اور آپ نے سونیا کے فلیٹ کا دروازہ کھلا ہوا دیکھا تو اس وقت حیات یزدانی کو وہاں سے رخصت ہوئے تقریباً کتنا وقت ہو چکا تھا؟"

اس نے بتایا۔ "عام طور پر رات گیارہ بجے راؤنڈ لگاتا ہوں۔"

"یور آنر!" میں نے جج کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ "میرے موکل کا بیان ہے کہ وہ وقوعہ کی رات تقریباً نو بجے وہاں سے چلا آیا تھا۔ جلدی آ جانے کی وجہ یہ تھی کہ اس کا مقتولہ سے کسی بات پر جھگڑا ہو گیا تھا۔ تلخ کلامی اتنی بڑھ گئی کہ وہ فوراً وہاں سے اٹھ گیا۔ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ بتاتی ہے کہ سونیا کی موت نو اور دس بجے کے درمیان واقع ہوئی ہے۔ یعنی میرے موکل کے جانے کے بعد اسے قتل کیا گیا ہے۔ یہی وہ وقت تھا جب چوکیدار کچھ دیر کے لئے چائے پینے چلا گیا تھا۔ اس بات کو ریکارڈ پر لایا جائے۔"

چوکیدار گل شیر کے بعد بغلی گلی کے دکاندار گواہی کے لئے پیش ہوئے۔ انہوں نے کم و بیش ایک جیسا بیان دیا اس لئے میں صفحات کی کمی کو مدنظر رکھتے ہوئے صرف ایک گواہ کے بیان کا احوال تحریر کر رہا ہوں۔ امجد حسین کی دودھ دہی کی دکان تھی۔ وہ چہرے سے سیدھا سادہ اور شریف آدمی نظر آتا تھا۔ اس نے کٹہرے میں آ کر سچ بولنے کا حلف اٹھایا پھر بیان دیا۔ "میری دکان کے بالکل سامنے سونیا کے فلیٹ کی کھڑکیاں ہیں۔ حیات نامی یہ شخص روزانہ سونیا سے ملنے آتا تھا۔ یہ تو بعد میں معلوم ہوا کہ وہ اس کا شوہر تھا۔ میں نے ایک دو بار ملزم کو سونیا کے فلیٹ میں چلتے پھرتے بھی دیکھا تھا۔ کئی بار سوچا کہ سونیا سے معلوم کروں گا مگر ہمت نہ ہو سکی۔ سونیا روزانہ میری دکان پر دودھ لینے آتی تھی۔ وقوعہ والی رات میں نے سونیا اور ملزم کو جھگڑتے ہوئے بھی دیکھا تھا مگر بعد میں سونیا نے پردہ کھینچ کر برابر کر دیا تھا۔ اسی طرح کی اور بھی کئی باتیں تھیں جو پولیس کے بیان میں موجود تھیں اس لئے ان کا ذکر خالی از دلچسپی ہو گا۔

امجد حسین کا بیان ختم ہوا تو میں نے سوالات کا سلسلہ شروع کیا۔

"امجد حسین صاحب! آپ نے بتایا ہے کہ وقوعہ والی رات آپ نے سونیا اور ملزم کو جھگڑتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ وہ کس بات پر جھگڑ رہے تھے؟"

"میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا جناب!" اس نے کہا۔ "میں بھلا کیسے بتا سکتا ہوں؟"

"امجد حسین صاحب! آپ نے پولیس کو بیان دیا ہے کہ آپ نے ملزم حیات یزدانی کو سونیا کے ساتھ ہاتھا پائی کرتے ہوئے دیکھا تھا؟"

"میں نے تو ایسا کوئی بیان نہیں دیا۔" وہ جلدی سے بولا۔ "ہاتھا پائی والی بات پولیس نے اپنی طرف سے لکھ لی ہو گی۔ میں نے تو ان دونوں کو جھگڑنے والے انداز میں باتیں کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ ان کے بولنے کا انداز اور ہاتھوں کی حرکت بتا رہی تھی کہ وہ کسی بات پر بحث و تکرار کر رہے ہیں اور یہ بھی لمحاتی منظر تھا۔"

"یعنی آپ یہ نہیں بتا سکتے کہ وہ کس بات پر جھگڑا کر رہے تھے؟"

"یہ تو کوئی بھی نہیں بتا سکتا۔"

"امجد حسین صاحب! آپ روزانہ ملزم کو آتے جاتے دیکھتے رہے ہیں۔ آپ کا بیان یہی ہے۔"

"جی ہاں۔"

"کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ ملزم ہمیشہ ایک ہی گاڑی میں آتا تھا؟"

اس نے اثبات میں جواب دیا۔ "جی جناب، وہ ہمیشہ ہلکے بھورے رنگ کی ایک

بڑی سی گاڑی میں آیا کرتا تھا۔"

میں نے پوچھا۔ "آپ اس گاڑی کا نام بتا سکتے ہیں؟"

اس نے معذوری ظاہر کی۔ "جناب، میں غریب آدمی ہوں، بڑی بڑی گاڑیوں کے نام وغیرہ مجھے نہیں آتے۔"

وکیل استغاثہ نے اس کی مدد کی ؟ وہ لائٹ براؤن کلر کی ٹوٹا کریسیڈا گاڑی تھی۔"

"مجھے اعتراض ہے جناب عالی!" میں نے جج کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "گواہ کا بیان ہے کہ وہ گاڑیوں کے ناموں سے کوئی واقفیت نہیں رکھتا۔ میرے فاضل دوست خواہ مخواہ اسے پٹی پڑھانے کی کوشش کر رہے ہیں۔"

جج نے وکیل استغاثہ کو سرزنش کرتے ہوئے مجھے جرح جاری رکھنے کی ہدایت کی۔

"امجد حسین صاحب!" میں نے سوالات کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے پوچھا۔ "ملزم حیات عموماً کس وقت آیا کرتا تھا؟"

اس نے جو جواب دیا اس نے چوکیدار کے بیان کی تصدیق کر دی۔ "مغرب کے وقت یا تھوڑا اوپر نیچے۔"

"اور دس بجے کے لگ بھگ واپس جاتا تھا؟"

"جی ہاں" اس نے بتایا۔ "میں گیارہ ساڑھے گیارہ بجے تک دکان کھلی رکھتا ہوں۔ ملزم دس بجے تک رخصت ہو جاتا تھا۔"

"آپ کو یاد ہے، واردات والی رات بھی ملزم ٹھیک دس بجے ہی وہاں سے روانہ ہو گیا تھا؟"

"نہیں جناب، اس روز وہ بہت جلدی واپس چلا گیا تھا۔" امجد حسین دودھ فروش کے جواب نے عدالت میں موجود ہر شخص کو چونکنے پر مجبور کر دیا۔ اس نے بتایا۔ "میں نے جب کھڑکی میں سے انہیں جھگڑنے والے انداز میں باتیں کرتے ہوئے دیکھا تو اس وقت تقریباً ساڑھے آٹھ بجے تھے۔ یہ مجھے اس لئے بھی یاد ہے کہ اس وقت عشاء کی اذان ہو رہی تھی۔"

"آپ بتا سکتے ہیں کہ وقوعہ والی رات ملزم کس وقت وہاں سے روانہ ہوا تھا؟"

"صحیح وقت کا تو مجھے اندازہ نہیں جناب۔" اس نے کہا۔ "لیکن میرا خیال ہے کہ اذانیں ختم ہونے کے فوراً بعد ہی میں نے اسے جاتے ہوئے دیکھا تھا۔" ایک لمحے کو رک کر اس نے اضافہ کیا۔ "اور اس وقت وہ شدید غصے میں بھی تھا۔ گاڑی لہرا کر مین گیٹ سے نکلی تھی۔"

"یعنی اس وقت تقریباً پونے نو یا زیادہ سے زیادہ نو بجے ہوں گے؟"

"آپ کہہ سکتے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "پولیس نے آپ سے منسوب بیان میں لکھا ہے کہ آپ نے اس دوران گولیاں چلنے کی آوازیں بھی سنی تھیں؟"

اس نے الجھن آمیز نظروں سے میری جانب دیکھا۔ میں نے اپنی بات کی وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "جب آپ نے دونوں کو جھگڑتے ہوئے دیکھا تھا اس کے فوراً بعد آپ نے گولیوں کی آواز بھی سنی تھی یعنی ملزم کے وہاں سے جانے سے پہلے؟"

"جناب، میں نے ایسی آوازیں سنی تو تھیں لیکن میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ وہ فائر ہی کی آواز تھی۔"

"پولیس کے بیان میں تو یہی لکھا ہے۔ آپ نے بیان دیا ہو گا تو پولیس نے لکھا ہو گا؟"

وہ برہمی سے بولا۔ "پولیس نے تو یہ بھی لکھا ہے کہ میں نے ملزم اور مقتولہ کو ہاتھا پائی کرتے ہوئے بھی دیکھا تھا؟"

"پھر آپ نے جو آوازیں سنی تھیں، ان کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟"

وہ ٹھوس لہجے میں بولا۔ "جناب بات دراصل یہ ہے کہ ویسی آوازیں تو سرشام ہی آنا شروع ہو گئی تھیں۔" ایک لمحے کو رک کر اس نے اپنی بات کی وضاحت کی۔ "اس دن شب برات تھی۔ سارے شہر میں پٹاخے پھوڑے جا رہے تھے۔"

میں نے مزید دو چار سوالات کرنے کے بعد اپنی جرح ختم کر دی۔

جج نے وکیل سرکاری سے پوچھا۔ "استغاثہ کے تمام گواہ پیش ہو چکے ہیں یا ابھی کوئی باقی ہے؟"

"جناب عالی!" وکیل استغاثہ نے مودبانہ لہجے میں کہا۔ "اس کیس کا سب سے اہم

گواہ ابھی باقی ہے۔ بوجوہ وہ آج عدالت میں پیش نہیں ہو سکا۔"

جج نے اس کے ساتھ ہی اگلی پیشی کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کر دی۔

وکیل استغاثہ نے کہا۔ "یور آنر! آئندہ پیشی پر میں ملزم سے جرح کرنا چاہتا ہوں۔"

جج نے میری جانب دیکھا' میں نے فوراً اعتراض کر دیا۔ "جناب عالی' ابھی استغاثہ کا اہم گواہ باقی ہے۔ ذرا اس کی "نقاب کشائی" ہو جائے پھر میرے فاضل دوست چاہیں تو میرے موکل پر جرح کر سکتے ہیں۔"

میرا اعتراض معقول تھا۔ جج نے وکیل استغاثہ کو تاکید کر دی کہ آئندہ پیشی پر وہ اہم گواہ کو ضرور پیش کر دے۔

ہم عدالت سے باہر آئے تو حیات یزدانی نے پوچھا۔ "وکیل صاحب! کچھ اندازہ ہے وہ اہم گواہ کون ہو سکتا ہے؟"

"ایسے ہی اندازہ لگانا تو مشکل ہے۔" میں نے کہا۔ "جو بھی ہو گا آئندہ پیشی پر سامنے آ ہی جائے گا۔"

جنت نے کہا۔ "آپ ٹھیک کہتے ہیں بیگ صاحب! اب آئندہ پیشی تک انتظار تو کرنا ہی پڑے گا۔ آپ کا کیا خیال ہے ہماری پوزیشن تو مضبوط ہے نا؟"

"سچ کو آنچ نہیں۔" میں نے بے پروائی سے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔ "ابھی تک کی کارروائی میں تو ہمارا پلا بھاری ہے۔"

"انشاء اللہ آگے چل کر بھی بھاری ہی رہے گا۔" جنت خاصی پر امید نظر آ رہی تھی۔ حیات کی حالت بھی اس سے کچھ زیادہ مختلف نہیں تھی۔ وہ اب مطمئن تھا۔ اس کی ضمانت ہو چکی تھی۔ اب اسے کسی بات کی جلدی نہیں تھی۔ ان دونوں کی بات چیت اور باہمی رویئے سے مجھے اندازہ ہوا تھا کہ ان کے درمیان "سیٹل منٹ" ہو چکا تھا۔

ایک بات مجھے شروع ہی سے پریشان کر رہی تھی۔ سونیا کے والدین نے اس کیس میں کسی قسم کی گرمجوشی کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔ ایک آدھ بار اس کی والدہ مجھے عدالت کے کمرے میں نظر آئی تھی لیکن پھر اس کے بعد ایسی غائب ہوئی تھی کہ جیسے سونیا کے قتل کے بعد اس سے کوئی تعلق واسطہ ہی نہ رہا ہو۔ میں نے اپنی اس پریشانی کا ذکر حیات سے کیا تو اس نے بھی کوئی تسلی بخش جواب نہیں دیا بلکہ جان چھڑانے والا رویہ اختیار کیا۔

"بیگ صاحب!" اس نے بیزار کن لہجے میں کہا۔ "وہ ذرا مختلف قسم کے لوگ ہیں۔ آپ میرا مطلب سمجھ رہے ہیں نا؟"

میں واقعی اس کا مطلب نہیں سمجھ رہا تھا اس لئے نفی میں گردن ہلا دی۔ اس نے کہا۔ "آپ بھی کن چکروں میں پڑ گئے ہیں وکیل صاحب!" وہ اس کی شادی سے خوش نہیں تھے۔ خاص طور پر سونیا کا والد تو اس شادی کے سخت خلاف تھا البتہ والدہ اور اس کی چھوٹی بہنیں میرے حق میں تھیں لیکن اب انہوں نے بھی آنکھیں پھیر لی ہیں۔ ان باتوں کی اہمیت نہیں ہے۔"

میں نے کہا۔ "مسٹر حیات' بعض اوقات غیر اہم باتیں بعد میں بہت زیادہ اہم ہو جاتی ہیں۔ ہم مقتولہ کے گھر والوں کو اس کیس میں نظر انداز نہیں کر سکتے۔ اگرچہ آپ کی پوزیشن بہت مضبوط ہے اور مجھے یقین ہے ہم یہ کیس جیت جائیں گے تاہم میں ایک ملاقات سونیا کے میکے والوں سے بھی کرنا چاہتا ہوں۔"

"کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔"

"ہو سکتا ہے' سونیا کے قاتل کے بارے میں کوئی سراغ مل جائے؟"

وہ اکتاہٹ آمیز لہجے میں بولا۔ "مجھے قاتل کے پکڑے جانے یا نہ پکڑے جانے سے کوئی دلچسپی نہیں ہے' جو ہونا تھا' ہو چکا' کاش میں پہلے جان جاتا۔"

وہ اچانک خاموش ہو کر خلا میں تکنے لگا۔ میں اس کے دلی جذبات کو سمجھ رہا تھا اور اس کی ذہنی کیفیت کو بھی محسوس کر رہا تھا۔ اس نے مجھے ایک ایک بات کھول کر بتا دی تھی۔ اس نے کیا بتائی تھی' جنت نے اسے مجبور کر دیا تھا۔ حقیقت حال سے پوری طرح واقف ہونے کے بعد ہی میں نے یہ کیس ہاتھ میں لیا تھا۔ قارئین' زیادہ بے تابی کا مظاہرہ نہ کریں۔ عدالت کے کمرے میں آپ بھی ہر راز آگاہ ہو جائیں گے۔ فی الفور' ایسی کسی بات کا ذکر مناسب نہ ہو گا۔

"اگر آپ کو کوئی اعتراض نہ ہو تو۔" میں نے بولنا شروع کیا تو وہ چونک کر میری جانب متوجہ ہو گیا۔ "میں ایک بار سونیا کے گھر والوں سے ملنا چاہتا ہوں؟"

اس نے "ہاں" یا "نہ" میں جواب دینے کے بجائے مجھے سونیا کے گھر کا پتہ سمجھا

دیا۔

○

وہ پینتالیس گز پر بنا ہوا ڈیڑھ کمرے کا ایک بوسیدہ سا مکان تھا۔

کبھی اس علاقے کا نام گولی مار تھا۔ اب نام بدل کر گل بہار ہو چکا تھا مگر پورے علاقے میں نہ تو کہیں گل نظر آتے ہیں اور نہ ہی بہار کے آثار ملتے ہیں۔ حتیٰ کہ لوگوں نے نئے نام کو بھی پوری طرح قبول نہیں کیا اور اب بھی ان کی زبان پر گولی مار ہی ہے۔

میں مطلوبہ مکان کے سامنے جا کر رک گیا۔ دروازے کے باہر ایک بڑے میاں چارپائی ڈالے لیٹے تھے۔ میں نے ان کی عمر کا اندازہ ساٹھ ستر کے درمیان لگایا۔

میں نے سلام کرنے کے بعد استفسار کیا۔ "بڑے صاحب! کیا سونیا کا گھر یہی ہے؟"

"آپ کون ہیں؟" انہوں نے نظر کا چشمہ درست کرتے ہوئے جواباً سوال داغ دیا۔ "بہت دیر کی مہرباں آتے آتے۔" انداز ایسا تھا جیسے طنز کے تیر برسا رہے ہوں۔

"میرا نام مرزا امجد بیگ ہے، میں وکیل ہوں۔" میں نے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا۔

"میں اس "عظیم خاتون" کا باپ ہوں۔۔۔ صابر حسین۔" اس نے سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "کیا مرنے کے بعد بھی مجھے چین سے نہیں رہنے دی گی؟ کیا وصیت کر رکھی تھی اس نے جو آپ تشریف لائے ہیں۔"

اس کے لہجے سے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ سونیا سے بے حد خفا تھا اور اس کی موت کے بعد بھی اپنی خفگی جتانے سے باز نہیں آ رہا تھا۔ اسی اثنا میں گھر کے اندر سے کسی عورت نے پکار کر پوچھا۔ "کون ہے؟" پھر پکارنے والی کی جھلک دروازے میں نظر آئی۔ میں نے اسے دیکھتے ہی پہچان لیا۔ وہ سونیا کی والدہ تھی۔

"ارے وکیل صاحب آپ۔۔۔ باہر کیوں کھڑے ہیں۔ اندر تشریف لائیے نا۔" پھر اس نے بڑے میاں کی جانب گھور کر دیکھتے ہوئے کہا۔ "تم مجھے بتا نہیں سکتے تھے؟"

میں نے محسوس کیا کہ وہ خاصی دھانسو قسم کی عورت تھی جسے اپنے شوہر کی ذرا بھی پرواہ نہیں تھی۔ بڑے میاں سے اس کے بات کرنے کے انداز نے مجھے سمجھا دیا تھا کہ اس گھر میں جو کچھ بھی ہوتا ہے وہ اسی کے اشاروں پر ہوتا ہوگا۔ میاں تو محض ایک شو پیس تھا۔ بعد میں میرے اس خیال کی تصدیق بھی ہو گئی۔ بڑے صاحب نے بڑھاپے میں اس سے شادی کی تھی۔ سونیا ان کی پہلی اولاد تھی۔

"جائیے وکیل صاحب! کچھ آؤ بھگت کروائیے۔" بڑے میاں نے مجھے ہاتھ سے اندر جانے کا اشارہ کیا۔

"ہر وقت شور نہ مچاتے رہا کرو۔" سونیا کی صحت مند والدہ نے اپنے نحیف و نزار شوہر کو ڈانٹ کر کہا۔ "ورنہ یہاں سے بھی چارپائی اٹھوا دوں گی۔"

وہ مجھے لے کر اندر چلی گئی پھر "آدھے کمرے" میں بٹھانے کے بعد اس نے کسی کو آواز دی۔ تھوڑی دیر بعد اٹھارہ انیس سال کی ایک دبلی پتلی لڑکی کمرے میں داخل ہوئی۔ اس نے چوڑی دار پائے جامہ اور بھوپالی کرتہ پہن رکھا تھا۔ سونیا کی بہ نسبت اس کا رنگ ذرا گہرا تھا مگر اس کی آنکھوں میں بے پناہ کشش پائی جاتی تھی۔ اس نے کمرے میں آتے ہی بے تکلفی سے مجھے سلام کیا جیسے برسوں کی شناسائی ہو۔

سونیا کی والدہ نے کہا۔ "یہ زویا ہے، سونیا کی چھوٹی بہن۔ بی اے میں پڑھ رہی ہے۔ کیا کیا خواب دیکھ رکھے تھے سونیا نے اس کے لئے مگر اس منحوس کی بددعائیں کھا گئیں میری بچی کو۔"

"امی چھوڑیں بھی، اب سب کے سامنے۔۔۔"

"کیسے چھوڑ دوں؟" وہ ہوا میں ہاتھ چلاتے ہوئے بولی۔ "اس مردود نے تو میری لٹیا ڈبو دی۔ دن رات ہاتھ اٹھا اٹھا کر یہ لمبی لمبی دعائیں مانگتا تھا میری سونیا کی تباہی و بربادی کی۔ قبر میں ٹانگیں لٹکائے بیٹھا ہے مگر مجال ہے جو اس کو ذرا سکون ہو۔ اس سے تو ہماری خوشی دیکھی نہیں جاتی۔ اس پر اللہ کی مار، اولاد کا دشمن ہوا بیٹھا ہے۔"

"پھر بھی امی۔۔۔" زویا نے نیم احتجاجی لہجے میں کہنا چاہا۔ مگر وہ بیچ میں بول اٹھی۔

"وکیل صاحب کوئی غیر تھوڑی ہیں بیٹی۔ یہ تو گھر کے ہی آدمی ہیں۔ تمہارے دولہا بھائی کا مقدمہ لڑ رہے ہیں۔" پھر اسے کچھ خیال آیا، جلدی سے بولی۔ "اے اے، تم جا کر کچھ چائے پانی کا انتظام کرو۔"

میں نے ہاتھ کے اشارے سے اسے ایسے اہتمام سے منع کرتے ہوئے کہا۔

"میرے پاس وقت بہت کم ہے۔ مجھے آپ سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔"

"آپ کو ضروری باتیں بھی کرنی ہیں اور آپ کے پاس وقت بھی بہت کم ہے۔" زویا شوخی سے بولی۔ "وکیل صاحب! آپ نے جمع کا صیغہ استعمال کیا ہے۔ یعنی آپ دو یا دو سے زیادہ باتیں کرنا چاہتے ہیں اور وہ بھی ضروری۔" وہ کھلکھلا کر ہنسی تو اس کے موتیوں جیسے دانت چمکنے لگے۔ "آپ امی کے بارے میں کیا جانتے ہیں؟"

اس کے سوالیہ انداز پر میں نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا' وہ جلدی سے بولی۔ "امی کسی چھوٹی سے چھوٹی بات کا جواب بھی کم از کم ایک منٹ سے پہلے نہیں دے سکتیں۔ یعنی آپ کے پاس کم از کم تین منٹ کا وقت تو ہو گا۔ میرا آپ سے وعدہ ہے کہ اس سے پہلے ہی آپ کی تواضع کا انتظام کر دوں گی۔"

میرے کچھ بولنے سے پہلے ہی وہ کمرے سے جا چکی تھی۔ وہ مجھے خاصی تیز لڑکی لگی۔ وہ نہ صرف باتونی واقعہ ہوئی تھی بلکہ اس کی باتوں میں تاثر بھی تھا۔ اس کے جانے کے بعد میں نے اس کی ماں سے سوال کیا۔ "آپ کا کیا خیال ہے' سونیا کے قتل میں کس کا ہاتھ ہو سکتا ہے؟"

"بدفالوں کا' بددعاؤں کا اور کوسنوں کا۔" وہ پیشانی پر ہاتھ مارتے ہوئے بولی۔ "میری بیٹی کا قاتل وہ باہر بیٹھا ہے۔"

"کوئی باپ اپنی اولاد کا برا نہیں چاہتا خاتون!" میں نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔

"ارے بھیا' تم کیا جانو اس خانہ خراب کو۔" وہ منہ کو ٹیڑھا کر کے بولی۔ "اگر آج سونیا زندہ ہوتی تو ہم اس کھولی میں تمہیں نظر نہ آتے۔"

"کیا مطلب؟"

اس کے جواب دینے سے پہلے ہی زویا چائے کی ٹرے اٹھائے کمرے میں داخل ہوئی۔ آپ گھڑی دیکھ سکتے ہیں۔" وہ میری طرف دیکھ کر شرارت سے مسکرائی۔ "صرف دو منٹ ہوئے ہیں گرما گرم چائے حاضر ہے۔"

مجھے خود حیرت ہوئی کہ اس نے اتنی جلدی چائے کیسے تیار کر لی ہو گی۔ مجھے زیادہ حیرت زدہ نہیں رہنا پڑا۔ وہ پٹ سے بولی۔ "آپ حیران نہ ہوں' میں بتائے دیتی ہوں۔"

پھر اس نے بتایا کہ وہ مجھے اپنے باپ سے باتیں کرتے ہوئے دیکھ چکی تھی اور اسے یقین تھا کہ میں گھر کے اندر بھی ضرور آؤں گا اس لئے اس نے مجھے دیکھتے ہی چائے کا پانی چڑھا دیا تھا۔

"اور اگر تمہارا اندازہ غلط ہو جاتا تو؟" میں نے پوچھا۔ "ضروری تو نہیں تھا کہ میں گھر میں بھی آتا اور چائے کے لئے ٹھہر بھی جاتا۔"

"میرا اندازہ غلط نہیں ہو سکتا تھا۔" وہ پراعتماد لہجے میں بولی۔ "میں آدمی کو پہچان لیتی ہوں۔"

وہ میری توقع سے زیادہ تیز و طرار ثابت ہو رہی تھی۔ بالکل اپنی ماں پر گئی تھی۔ چائے کی ٹرے میز پر رکھنے کے بعد اس نے میرے لئے چائے بنائی پھر چائے کی پیالی مجھے تھماتے ہوئے میرے قریب ہی بیٹھ گئی۔ میں اس کی ماں کی طرف متوجہ ہو گیا۔ "آپ کہہ رہی تھیں؟"

"اللہ جھوٹ نہ بلوائے' زویا گواہ ہے۔" وہ بولی۔ "سونیا نے ہمارے لئے کیا کچھ نہیں کیا۔ وہ تو اپنی سی پوری کوشش کر رہی تھی۔ حیات کو اس نے آمادہ کر لیا تھا کہ وہ گلشن میں ہمارے لئے دو سو گز کا مکان خرید لے مگر یہ جو باہر لیٹا ہوا ہے نا' اس نے ایک مان کر نہ دی۔"

زویا ماں کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے بولی۔ "اور نہیں تو کیا۔ اگر ابا نے مخالفت نہ کی ہوتی تو آپی کب کا ہمیں مکان دلا چکی ہوتیں۔ اب تو دور دور تک کوئی امکان نظر نہیں آتا۔ دولہا بھائی کی نظریں بھی بدلی بدلی سی ہیں۔" وہ افسوس ناک انداز میں بولی۔

دونوں ماں بیٹی بار بار مکان نہ ملنے کا رونا رو رہی تھیں۔ انہوں نے ایک مرتبہ بھی سونیا کے المناک انجام پر دکھ و رنج کا اظہار نہیں کیا تھا۔ ان کا پورا زور اس بات پر تھا کہ اگر ابا یعنی سونیا اور زویا کے ابا ان کی ہاں میں ہاں ملاتے تو وہ حیات سے کم از کم ایک مکان تو اینٹھ ہی لیتے۔ مجھے اب محسوس ہو رہا تھا کہ حیات کی اپنی سسرال کی طرف سے بیزاری بے معنی نہیں تھی۔ وہ ان لالچی لوگوں سے خوش نہیں تھا۔

چائے ختم ہونے تک وہاں بیٹھنا ضروری تھا۔ میں نے سونیا کی امی سے دریافت کیا۔ "صابر صاحب کرتے کیا ہیں؟ میرا مطلب ہے' اس گھر کا خرچہ کس طرح چلتا ہے؟"

وہ ایک ٹھنڈی سانس بھر کر بولی۔ "اگر یہ نامراد کچھ کرتا تو بھی ہماری یہ حالت تو نہ ہوتی۔ اب تو خیر کسی قابل ہی نہیں رہا۔ جب ہاتھ پاؤں میں طاقت تھی جب کچھ نہیں کیا تو اب کیا کرے گا۔ وہ تو بھلا ہو ان بیٹیوں کا' پہلے سونیا ملازمت کرتی رہی۔ اب زویا ایک اسکول میں ٹیچری کر رہی ہے۔ ساتھ ساتھ پرائیویٹ بی اے بھی کر رہی ہے۔

زویا بولی۔ "امی' کیا سارے دکھڑے آج ہی رو لیں گی۔ اب تو وکیل صاحب آتے جاتے رہیں گے۔"

اس نے یہ جملہ اتنی بے تکلفی سے کہا تھا کہ کوئی غیرت مند ماں ہوتی تو زندہ گڑ جاتی مگر ماں نے اس کی طرف کوئی توجہ ہی نہیں دی بلکہ مجھ سے میرا پتہ پوچھ رہی تھی۔ "اب تو ہم بیگ صاحب کے گھر جائیں گے۔ کیوں وکیل صاحب! آپ ہمیں خوش آمدید کہیں گے نا؟"

میں گڑبڑا گیا۔ "وہ جی--- وہ جی---"

زویا جھٹ سے بولی۔ "ڈر گئے نا' بڑے کنجوس ہیں آپ بھی۔ بھئی آپ ہمیں کچھ کھلایئے پلایئے گا نہیں۔ ہم آپ کا خرچ نہیں کرائیں گے۔"

"یہ بات نہیں ہے۔" میں نے جلدی سے کہا۔ "دراصل میں گھر پر بہت کم ملتا ہوں۔ آپ میرے دفتر کا پتہ لے لیں۔" میں نے جان چھڑانے کی خاطر کہا۔

زویا ایک ادا سے بولی۔ "کوئی بات نہیں' آپ گھر پر نہیں ہوں گے تو آپ کی گھر والی تو ہوں گی۔ ہم ان ہی سے مل لیں گے۔"

میں نے کہا۔ "ابھی تک اللہ کی اس نعمت سے محروم ہوں۔"

یہ سنتے ہی زویا کچھ زیادہ ہی بے تکلفی کا مظاہرہ کرنے لگی۔ میں سمجھ گیا کہ وہ گھیرو قسم کے لوگ تھے۔ اب مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ حیات یزدانی کے ساتھ دراصل کیا ہوا ہو گا۔ میں نے جیسے تیسے ان سے پیچھا چھڑایا' دوبارہ آنے کا جھوٹا وعدہ کیا اور گھر سے نکل آیا۔

* * *

منظر اسی عدالت کا تھا اور گواہوں کے کٹہرے میں استغاثہ کا سب سے اہم گواہ

واصف علی کھڑا تھا۔

اس کی عمر لگ بھگ پچیّس سال ہو گی۔ چہرے سے وہ ایک جذباتی اور جھگڑالو قسم کا آدمی نظر آتا تھا۔ اس نے سیاہ پتلون اور چیک دار شرٹ پہن رکھی تھی۔ اس کی شخصیت میں دو چیزیں غیر معمولی تھیں۔ ایک تو اس کا دراز قد اور دوسرے بڑی بڑی آنکھیں۔

واصف علی پر نگاہ پڑتے ہی حیات یزدانی کی آنکھیں شعلے اگلنے لگی۔ وہ بار بار اپنی مٹھیاں بھینچ رہا تھا اور بے چینی سے پہلو بدل رہا تھا۔ میں نے اس سے اس کی کیفیت کے بارے میں دریافت کیا۔ "کیا آپ واصف علی کو جانتے ہیں؟"

"بہت اچھی طرح۔" وہ دانت کچکچا کر بولا پھر نفرت سے اس کی جانب دیکھنے لگا۔

"یہ ایک طویل کہانی ہے۔" وہ بدستور واصف کو گھورتے ہوئے بولا۔ "آپ کو بعد میں بتاؤں گا۔ پہلے میں یہ دیکھ لوں کہ یہ کیا کیا بکواس کرتا ہے؟"

جج اپنی کرسی پر آ کر بیٹھ گیا تو کارروائی کا آغاز ہوا۔ واصف علی نے حلف اٹھانے کے بعد بیان دیا کہ وہ ملزم حیات یزدانی اور اس کی مقتولہ بیگم سونیا کو اچھی طرح جانتا تھا۔ اکثر و بیشتر مقتولہ کی اس سے فون پر بات بھی ہوتی رہتی تھی۔ وہ اپنے شوہر کی جانب سے بہت خوف زدہ تھی۔ اسے ڈر تھا کہ حیات اس کی جان لے لے گا۔ اس نے کئی مرتبہ اپنے اس خدشے کا اظہار بھی کیا تھا۔ واصف نے ہمیشہ اسے تسلی دی تھی۔ سونیا کے قتل کی خبر اس نے اخبار میں پڑھی تھی اور خبر پڑھتے ہی اس نے پولیس سے رابطہ کیا اور انہیں مقتولہ کے حالات اور خدشات سے آگاہ کر دیا تھا۔

اس کا بیان ختم ہوا تو جج نے سوالیہ نظروں سے میری جانب دیکھا۔ مطلب صاف ظاہر تھا کہ میں اپنی جرح کا آغاز کر سکتا ہوں۔ میں ایک عجیب قسم کی الجھن میں مبتلا ہو گیا تھا۔ ایسی بات نہیں تھی کہ مجھے جرح میں کوئی دشواری پیش آتی مگر میں اس نئی صورتحال سے الجھ گیا تھا۔ واصف علی کو دیکھ کر میرے موکل نے جو ردعمل ظاہر کیا تھا وہ غیر معمولی تھا پھر گواہ کے بارے میں میرے موکل کے ریمارکس بھی بہت اہمیت کے حامل تھے۔ اگر میں حیات یزدانی اور واصف کے تعلق سے واقف ہو جاتا تو یقیناً زیادہ بہتر انداز میں گواہ پر جرح کر سکتا تھا اور یہ سب کچھ جاننے کے لئے حیات یزدانی سے فوری گفتگو از حد

ضروری ہو گئی تھی۔

میں نے روئے سخن جج کی جانب موڑتے ہوئے کہا۔ ”جناب عالی! گواہ واصف علی کے بیان نے اس مقدمے میں ایک نئی روح پھونک دی ہے۔ میں گواہ پر جرح شروع کرنے سے پہلے تھوڑی دیر کے لئے اپنے موکل سے تنہائی میں بات کرنا چاہتا ہوں۔ معزز عدالت سے میری درخواست ہے کہ ہمیں چند منٹ کی گفتگو کا موقع فراہم کیا جائے۔“

وکیل استغاثہ نے فوراً اعتراض جڑ دیا۔ ”جناب عالی! پہلے ہی اس کیس میں خاصی تاخیر ہو چکی ہے۔ وکیل صفائی مزید تاخیری حربے استعمال کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ بہت سا وقت ضائع ہو چکا ہے۔ اب میرے فاضل دوست کو عدالت کے قیمتی وقت کا لحاظ رکھنا چاہئے۔“

”مجھے عدالت کے قیمتی وقت کا خیال ہے اسی لئے میں نے معزز عدالت سے یہ درخواست کی ہے۔“

”جناب عالی! بڑی مشکل سے ہمارے کیس کی باری آئی ہے۔ عدالت کا وقت ختم ہونے میں زیادہ وقت باقی نہیں ہے۔ استغاثہ کا آخری گواہ بھی بھگت جائے تو اچھی بات تھی مگر مجھے لگتا ہے وکیل صفائی کی نیت ٹھیک نہیں ہے۔“

میں نے جج کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”یور آنر' میں اس مقدمے میں وکیل صفائی ہوں۔ اس کیس کا جتنا جلدی فیصلہ ہو جائے' اس میں میرا ہی فائدہ ہے۔ میں تاخیر کیوں چاہنے لگا۔“

جج نے دیوار گیر کلاک کی جانب نظر اٹھا کر وقت دیکھا پھر مجھ سے سوال کیا۔ ”بیگ صاحب! آپ اپنے موکل سے بات کرنے کے لئے عدالت کا کتنا وقت لیں گے؟“

”مشکل سے دس منٹ۔“

وکیل استغاثہ نے جلدی سے کہا۔ ”یور آنر' عدالت کا وقت ختم ہونے میں پندرہ منٹ باقی ہیں۔ پانچ منٹ میں کیا خاک جرح ہو سکے گی۔“

میں نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ ”موثر جرح کے لئے ایک سوال بھی کافی ہوتا ہے۔ بعض اوقات ایک معمولی سا نکتہ کیس کا پانسہ پلٹ دیتا ہے پھر جرح تو مجھے کرنا ہے' آپ خاطر جمع رکھیں۔“

”جناب عالی! وکیل صفائی حد سے تجاوز کر رہے ہیں۔“

”آرڈر' آرڈر“ جج نے اپنے مخصوص لہجے میں کہا۔ ”آپ آپس کے جھگڑوں کو بھول کر اپنے موکلین کا خیال کریں۔“ پھر اس نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”بیگ صاحب! میں آپ کو ایک دن کا وقت دے رہا ہوں۔ آپ اپنے موکل سے اچھی طرح میٹنگ کر لیں۔“

پھر جج نے پیش کار کو ہدایت کی کہ ہمارے کیس کا نمبر شروع میں رکھا جائے تاکہ ہمیں زیادہ سے زیادہ وقت مل سکے۔ اس کے بعد جج نے عدالت برخاست کر کے دوسرے دن کی تاریخ دے دی۔

دراصل واصف علی کو دیکھ کر حیات یزدانی کی جو حالت ہوئی تھی اور حیات بار بار جن شعلہ بار نگاہوں سے واصف کو گھور رہا تھا' وہ سب کچھ جج سے بھی پوشیدہ نہیں رہا تھا۔ اس نے سمجھ لیا تھا کہ کوئی نہ کوئی ایسی بات ضرور ہے جو اس مقدمے سے گہرا تعلق رکھتی ہے اس لئے اس نے میری درخواست کی حمایت کرتے ہوئے مجھے ایک دن کی مہلت دے دی تھی۔

حیات یزدانی سے دو گھنٹے کی طویل گفتگو میں بہت سے سربستہ راز افشا ہوئے۔ اس سلسلے میں رات کو میں نے ایک چکر موقع واردات کا بھی لگایا اور ماڈ ہائٹس کی بغلی گلی میں واقع دکانوں کے مالکان سے بھی فرداً فرداً ملا۔ امجد حسین دودھ فروش مجھے دیکھتے ہی پہچان گیا تھا۔ میں نے بلڈنگ کے چوکیدار سے بھی سرسری ملاقات کی تاہم سب سے اہم آدمی جو مجھے ملا وہ ایک پان سگریٹ فروخت کرنے والا تھا' اس کا نام نعمت علی تھا۔ اس سے مجھے بہت مفید معلومات حاصل ہو گئیں۔ میں نے کسی طرح کل اسے عدالت میں جانے کے لئے راضی کر لیا۔ وہ اس کام کے لئے بڑی مشکل سے تیار ہوا تھا۔ اس نے جس مشکوک موٹر سائیکل سوار کا تذکرہ کیا تھا' مجھے یقین تھا کہ وہ واصف علی کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔

* * *

دوسرے روز میں ذرا جلدی ہی عدالت پہنچ گیا تھا۔ میں نے دروازے میں قدم

رکھا ہی تھا کہ ہمارے مقدمے کی آواز پڑ گئی۔ تمام لوگ اپنی اپنی جگہوں پر بیٹھ گئے۔ واصف علی گواہوں کے کٹہرے میں آیا۔ دوسرے کٹہرے میں میرا موکل ملزم حیات یزدانی موجود تھا۔ واصف علی گزشتہ روز والے بیان کو دہرا چکا تو میں نے جرح کا آغاز کیا۔

"واصف علی صاحب!" میں نے کہا۔ "استغاثہ کے دعوے کے مطابق آپ اس مقدمے کے سب سے اہم گواہ ہیں۔ آپ کا کیا خیال ہے؟"

"میں آپ کو اپنے خیال سے آگاہ کرنے کا پابند نہیں ہوں۔" اس نے اکھڑے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

"بالکل نہیں۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "میں نے تو ایسے ہی پوچھ لیا تھا۔ اگر آپ کو کوئی اعتراض ہو تو مت بتائیں۔" میں نے ایک لمحہ رک کر دوسرا سوال کیا۔ "آپ نے اپنے بیان میں بتایا ہے کہ آپ ملزم یزدانی اور ان کی مقتولہ بیوی سونیا کو اچھی طرح جانتے ہیں؟"

"جی ہاں، میں نے یہی بیان دیا ہے۔"

"کیا یہ سچ ہے کہ آپ کسی زمانے میں ملزم کی فرم "برہانی ٹریڈرز" میں ملازم رہے ہیں؟" میں نے حیات سے حاصل شدہ معلومات کی روشنی میں سوال کیا۔

"ہاں۔" اس نے اثبات میں جواب دیا۔ "یہ کسی زمانے کی بات نہیں بلکہ سال ڈیڑھ سال پہلے کی بات ہے۔"

"واصف علی صاحب! کیا یہ سچ ہے کہ آپ کے باس نے آپ کو ملازمت سے نکال دیا تھا؟"

وہ بھڑک کر بولا۔ "یہ جھوٹ ہے۔ میں نے ملازمت اپنی مرضی سے چھوڑی تھی۔"

"میرے موکل کا کہنا ہے کہ ایک خاص بات پر آپ کا اس سے جھگڑا ہو گیا تھا جس کی وجہ سے آپ کو نوکری سے جواب دے دیا گیا تھا؟" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "آپ معزز عدالت کو وہ خاص بات بتانا پسند کریں گے؟"

"میرا کسی سے کوئی جھگڑا نہیں ہوا تھا بلکہ میں نے انصاف کی بات کی تھی۔"

"عدالت وہ بات جاننا چاہتی ہے۔"

اس نے حاضرین عدالت پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی پھر جج کی جانب دیکھتے ہوئے بولا۔

"میرا سابق باس اور حالیہ ملزم حیات یزدانی ایک غاصب اور بے انصاف شخص ہے۔ میں نے حق سچ بات کی تھی۔ میرا مطالبہ ہر لحاظ سے جائز تھا مگر اس نے---"

جج نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ "آپ غیر متعلق تفصیل سے پرہیز کریں اور وکیل صاحب جو پوچھ رہے ہیں اس کا ٹو دی پوائنٹ جواب دیں۔"

وہ میری جانب دیکھتے ہوئے بولا۔ "میں برہانی ٹریڈرز میں سینئر تھا جب کہ سونیا کو وہاں آئے ہوئے جمعہ جمعہ آٹھ دن ہوئے تھے۔ مجھے آٹھ گھنٹے کی پر مشقت محنت کے ڈھائی ہزار ماہانہ ملتے تھے۔ اس کے برعکس سونیا کو کچھ نہ کرنے کے چار ہزار۔ بس اسی بات پر ہمارے درمیان تلخ کلامی ہوئی تھی۔ نتیجے میں، میں نے اس بے انصاف باس کے یہاں کام کرنے سے انکار کر دیا تھا۔"

"واصف علی صاحب! آپ برہانی ٹریڈرز میں کیا کام کرتے تھے۔ میرا مطلب ہے کہ آپ کے ذمے کون سا کام تھا؟"

اس نے بتایا۔ "میں آؤٹ ڈور کا کام کرتا تھا۔ دن بھر موٹر سائیکل پر دھوپ میں جلتا پھرتا تھا۔" اس کے لہجے میں زہر ہی زہر بھرا ہوا تھا۔

میں نے اگلا سوال کیا۔ "سونیا کی فرم میں کیا حیثیت تھی؟"

"وہ باس کی پرائیویٹ سیکریٹری تھی۔"

میں نے کہا۔ "واصف علی صاحب! آپ کا موقف خالی از منطق ہے۔" پھر میں نے جج کو مخاطب کرتے ہوئے اپنا بیان جاری رکھا۔ "یور آنر، ایک بلڈنگ کی تعمیر میں مختلف لوگ کام کرتے ہیں۔ مزدور، مستری، ٹھیکے دار، انجینئرز وغیرہ وغیرہ۔ سب سے زیادہ جسمانی مشقت بے چارے مزدوروں کو اٹھانا پڑتی ہے مگر سب سے کم معاوضہ بھی انہی کو ملتا ہے جب کہ ایک انجینئر ان کے مقابلے میں کہیں زیادہ وصول کرتا ہے۔ سب اپنے اپنے ٹریڈ کی بات ہے۔ اگر میرا موکل اپنی سیکریٹری کو ایک آؤٹ ڈور کلرک کے مقابلے میں زیادہ تنخواہ دیتا تھا تو اس میں بے انصافی کی کوئی بات نہیں تھی۔"

وکیل استغاثہ نے فوراً اٹھ کر کہا۔ "جناب عالی! اس عدالت میں سونیا مرڈر کیس زیر سماعت ہے۔ میرے فاضل دوست خواہ مخواہ کی باتیں زیر بحث لا رہے ہیں۔"

”میں نے ابھی تک ایک بھی غیر متعلق بات نہیں کی یور آنر۔“ میں نے کہا۔ ”اس کیس کے تین اہم کردار، مقتول سونیا، ملزم حیات یزدانی اور گواہ واصف علی میں ایک خاص ربط پایا جاتا ہے۔ میں بہت سی ایسی باتیں عدالت کے سامنے لاؤں گا کہ صورتحال بدل کر رہ جائے گی۔“

جج نے مجھے جرح جاری رکھنے کا اشارہ کیا۔ میں نے پوچھا۔ ”واصف علی صاحب! آپ نے ابھی ابھی بتایا ہے کہ برہانی ٹریڈرز کو چھوڑنے کی وجہ آپ کے باس کی بے انصافی تھی اور وجہ نزع سونیا کی ذات تھی؟“

”جی ہاں، میں نے یہی بتایا ہے۔“

”واصف علی صاحب! میرے موکل کا دعویٰ ہے کہ آپ اس کی سیکریٹری پر بری نظر رکھتے تھے اور دفتر میں اس سے متعلق الٹی سیدھی باتیں کرتے رہتے تھے۔ اس نے آپ کو ایسی پیچ حرکت سے باز رکھنے کی تاکید بھی کی تھی مگر آپ نے اس کی تاکید کے برعکس اپنی سرگرمیاں تیز کر دی تھیں۔ مجبوراً میرے موکل کو آپ کو نوکری سے نکالنا پڑا۔“ میں نے واصف علی سے متعلق حیات یزدانی کا بیان عدالت میں پیش کر دیا تھا۔ جو اس وقت جج کے سامنے رکھی فائل میں موجود تھا۔

”آپ کا موکل جھوٹا ہے۔“ وہ غصے سے بولا۔ ”میں اس کے سوا اور کیا کہہ سکتا ہوں۔“

”یعنی آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ حقیقت وہی ہے جو آپ نے بیان کی ہے؟“

”آپ کا خیال درست ہے۔“

میں نے اس کے قریب جا کر کٹہرے کی ریلنگ کو چھوتے ہوئے کہا۔ ”واصف علی صاحب! اگر آپ کے بیان کو سچ مان لیا جائے تو اس سے یہ نتیجہ سامنے آتا ہے کہ آپ مقتولہ سونیا کی جانب سے اپنے دل میں رنجش رکھتے تھے؟“

”مجھے اس کی شکل سے بھی نفرت ہو گئی تھی؟“

میں نے کہا۔ ”آپ نے گزشتہ روز۔۔۔ اور پھر آج بھی معزز عدالت میں جو بیان دیا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ کے مقتولہ سونیا سے بہت اچھے تعلقات تھے۔ وہ آپ کو اپنے مصائب سے آگاہ کرتی رہتی تھی۔ اس نے گاہے بہ گاہے آپ کو فون پر بتایا تھا کہ وہ اپنے شوہر کی جانب سے خوف زدہ ہے۔ اسے ڈر تھا کہ ملزم حیات اس کی جان کے درپے ہے اور آپ جواباً اسے تسلیاں بھی دیتے رہتے تھے۔ اس سے تو ظاہر ہوتا ہے کہ وہ آپ پر بہت اعتماد کرتی تھی کیونکہ انسان اپنے ذاتی مسائل کے بارے میں صرف اپنے ہمدردوں کو ہی بتاتا ہے۔ یعنی آپ دونوں کے درمیان خوشگوار تعلقات تھے۔ ابھی آپ نے میرے ایک سوال کے جواب میں بتایا ہے کہ آپ کو اس کی صورت سے بھی نفرت ہو گئی تھی۔ آپ کے کون سے بیان کو درست سمجھا جائے؟“

وہ پراعتماد لہجے میں بولا۔ ”میں نے نہ تو پہلے کوئی جھوٹ بولا تھا اور نہ ہی اب کسی غلط بیانی سے کام لے رہا ہوں۔“

”آپ مبہم باتیں کرنے سے پرہیز کریں اور اپنی بات کی وضاحت کریں۔“ جج نے سخت لہجے میں کہا۔

وہ بولا۔ ”یور آنر! جس طرح وقت بدلتے دیر نہیں لگتی، اسی طرح انسانوں کو بدلتے ہوئے بھی کوئی ہل بیل نہیں لگتے۔ انسانی ذہن ایک عجیب و غریب چیز ہے۔ دل اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز واقعات کو جنم دیتا ہے۔“ ایک لمحے کو رک کر اس نے حیات یزدانی کی طرف دیکھا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ”جب سونیا شروع شروع میں ہمارے دفتر میں آئی تھی تو مجھے بہت اچھی لگی تھی۔ میں نے محبت میں اس کی جانب ایک قدم بڑھایا تو وہ دوڑی چلی آئی۔ میں اپنی خوش قسمتی پر نازاں تھا مگر پھر بیچ میں باس دیوار بن کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے جانے سونیا کو کیا پٹی پڑھائی کہ وہ میری جانب سے بدگمان ہو گئی۔ میں نے سمجھ لیا کہ باس کی دولت نے اسے اپنا اسیر بنا لیا ہے۔ اس کے بعد مجھے سونیا سے نفرت ہو گئی۔ اس نے میری جانب سے یوں نظر پھیرلی تھی جیسے میں کوئی ناخوش گوار منظر ہوں۔ اس کے فوراً بعد میں نے نوکری پر لعنت بھیج کر برہانی ٹریڈرز کو چھوڑ دیا۔

بعد ازاں مجھے معلوم ہو گیا کہ سونیا نے حیات سے شادی کر لی ہے۔ مجھے یہ بھی پتہ چل گیا تھا کہ اس شادی کو حیات نے اپنی پہلی بیوی جنت سے خفیہ رکھا ہوا ہے۔ میرے دل میں انتقام کے جذبات موجزن تھے۔ میں نے سوچا، سونیا اور حیات کو مزہ چکھانے کا یہ نادر موقع ہے۔ میں جنت کو اس شادی سے باخبر کرنا چاہتا تھا مگر اس سے پہلے میں سونیا کا سراغ لگا لینا چاہتا تھا۔ میں اس میں کامیاب بھی ہو گیا مگر سونیا سے مل کر معلوم ہوا کہ

صورتحال وہ نہیں ہے جو میں سمجھ رہا تھا۔ سونیا نے مجھے حیات کے ظلم و ستم کی داستان سنائی تو میرا دل پسیج گیا۔ میں اپنے دل کے نہاں خانوں سے ابھی تک سونیا کو نکال نہیں پایا تھا۔ اسے دکھی دیکھ کر ایک مرتبہ پھر میرا دل اس کی محبت سے بھر گیا۔ میں نے اپنے ذہن سے تمام انتقامی خیالات کو کھرچ ڈالا اور سونیا سے وعدہ کیا کہ اسے اس مصیبت سے نجات دلانے کی کوشش کروں گا۔"

"گویا آپ مقتولہ کے لئے نجات دہندہ بن گئے تھے؟" اس کا طویل بیان ختم ہوا تو میں نے سوال کیا۔

"آپ جو چاہیں سمجھ لیں مگر میں خلوص دل سے اس کی مدد کرنا چاہتا تھا۔" اس نے کہا۔ "مگر شاید اس کی قسمت میں ہی بربادی لکھی تھی۔"

میں جانتا تھا کہ اس نے عدالت کو متاثر کرنے کے لئے سراسر جھوٹ پر مبنی ایک تقریر کر ڈالی تھی۔ جس کا حقیقت سے دور کا واسطہ بھی نہیں تھا اور مجھے عدالت کے علم میں حقائق کی رونمائی کرنا تھی۔

"واصف علی صاحب!" میں نے اسے مخاطب کرتے ہوئے اگلا سوال کیا۔ "آپ نے اپنے بیان میں بتایا ہے کہ سونیا کے قتل کی خبر آپ نے اخبار میں پڑھی تھی پھر آپ نے فوراً پولیس کو آگاہ کر دیا کہ مقتولہ کو اپنے شوہر کی جانب سے جان کا خطرہ تھا۔"

اس نے اثبات میں سر ہلایا' میں نے پوچھا۔ "پولیس کو واردات کے دوسرے روز ایک گمنام ٹیلی فون کال ملی تھی۔ کیا وہ کال آپ ہی نے کی تھی؟"

"مجھے گمنام ٹیلی فون کرنے کی کیا ضرورت تھی؟"

"چلیں مان لیتے ہیں' گمنام ٹیلی فون کرنے والا کوئی اور ہو گا۔" میں نے معتدل لہجے میں کہا۔ "آپ معزز عدالت کو بتائیں گے کہ وقوعہ کی رات یعنی پچیس اپریل کو آپ رات نو دس بجے کے درمیان کہاں تھے؟"

اس نے ہراساں نظروں سے وکیل استغاثہ کی جانب دیکھا پھر لرزاں لہجے میں بولا۔ "میں کہاں تھا۔۔۔ سیدھی سی بات ہے' میں اس وقت کلفٹن کے ساحل پر تھا۔"

"یہ بات سیدھی سی کیسے ہو گئی۔ عدالت نہیں جانتی تھی کہ آپ اس وقت ساحل سمندر پر تفریح کر رہے تھے۔ یہ آپ نے ابھی بتایا ہے۔"

وہ اکھڑے ہوئے لہجے میں بولا۔ "آپ کیا مجھے اس جرم میں پھانسی لگا دیں گے؟"

"اگر پھانسی لگنے والا کوئی جرم آپ کریں گے تو یقیناً قانون آپ کو معاف نہیں کرے گا۔" میں نے اس کے چہرے پر نگاہیں گاڑتے ہوئے کہا۔ "آپ کے پاس' ساحل پر موجودگی کا کوئی ثبوت ہے؟"

"میں بھلا کیا ثبوت پیش کر سکتا ہوں؟"

میں نے کہا۔ "واصف علی صاحب! وقوعہ کی رات آپ کو ماڈ ہائٹس کے قریب منڈلاتے ہوئے دیکھا گیا ہے۔ یہ وہی وقت تھا جب مقتولہ سونیا کو قتل کیا گیا ہے۔ آپ کے پاس اس کا کیا جواب ہے؟"

واصف کے بجائے وکیل استغاثہ نے اٹھ کر کہا۔ "عدالت میں ہر بات کو ثابت کرنا پڑتا ہے۔ آپ کے پاس کیا ثبوت ہے وکیل صاحب!"

"بیگ صاحب! آپ واصف علی کی موقع واردات پر موجودگی کو ثابت کر سکتے ہیں؟" جج نے پوچھا۔

"شیور یور آنر!" میں نے گردن جھکا کر کہا۔ "اس وقت عدالت میں ایک ایسا شخص موجود ہے جس نے وقوعہ کی رات گواہ کو رات آٹھ سے نو بجے کے درمیان ماڈ ہائٹس کے نزدیک ٹہلتے ہوئے دیکھا تھا۔"

سب نے غیر ارادی طور پر عدالت میں بیٹھے ہوئے افراد کی طرف دیکھا۔ واصف علی کے چہرے پر گھبراہٹ کے تاثرات نمودار ہو گئے تھے۔ جج نے مجھ سے کہا کہ میں مذکورہ شخص کو پیش کروں۔ میں نے اشارے سے نعمت علی پان فروش کو بلا لیا۔

نعمت علی نے گواہوں کے کٹہرے میں آ کر سچ بولنے کا حلف اٹھایا پھر بیان دیا کہ وقوعہ کی رات اس نے واصف علی کو پریشانی کے عالم میں ماڈ ہائٹس کے قریب ٹہلتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس نے مزید بتایا کہ وہاں نزدیک ہی ایک لیڈی ڈاکٹر کا کلینک ہے۔ ایسا اکثر ہوتا ہے کہ خواتین مریضوں کے ساتھ آنے والے حضرات وہاں کھڑے ہو کر انتظار کرتے رہتے ہیں کیونکہ کلینک میں جینٹس کے لئے کوئی انتظار گاہ کا انتظام نہیں ہے لیکن نعمت علی کو اس وقت حیرت ہوئی کہ جب واصف علی اکیلا ہی واپس چلا گیا۔ اس نے واصف کو پہلے تو کسی پریشان حال مریضہ کا ساتھی ہی سمجھا تھا مگر جب وہ وہاں سے تنہا ہی گیا تو وہ

چونک اٹھا تھا لیکن اس نے اس طرف زیادہ دھیان نہیں دیا تھا۔

نعمت علی کا بیان ختم ہوا تو میں نے واصف علی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے اس سے پوچھا۔ ”یہی وہ شخص تھا جسے آپ نے وقوعہ کی رات اپنے کیبن کے پاس ٹہلتے ہوئے دیکھا تھا؟“

”جی ہاں جناب‘ یہی تھا وہ۔“

واصف علی نے غصیلے لہجے میں کہا۔ ”یہ کیا بکواس ہے۔ آپ نے کوئی خواب دیکھ لیا ہو گا؟“

”میں نے کوئی خواب نہیں دیکھا تھا برخوردار!“ نعمت علی نے بڑی رسائیت سے کہا۔ اس کی عمر چالیس سے تجاوز کر چکی تھی۔ ”اچھی طرح یاد ہے تم ہی اس رات تنہا واپس گئے تھے۔ تمہارے پاس نیلے رنگ کی موٹر سائیکل تھی جس پر سامنے والی نمبر پلیٹ کے اوپر دوڑتے ہوئے گھوڑے کا مونوگرام بنا ہوا تھا۔“

”یہ سب ایک سازش ہے۔“ واصف نے جھنجھلاہٹ آمیز لہجے میں کہا۔ ”ایسی موٹر سائیکلیں شہر میں جانے کتنوں کے پاس ہوں گی۔“

جج نے ڈانٹ کر واصف علی سے پوچھا۔ ”کیا آپ کے پاس مذکورہ رنگ اور نمبر پلیٹ والی موٹر سائیکل ہے؟“

اس نے اثبات میں جواب دیا۔

میں نے پوچھا۔ ”واصف علی صاحب! آپ نے معزز عدالت کو بتایا ہے کہ وقوعہ کی رات آپ ساحل سمندر کا نظارہ کر رہے تھے۔ اسی وقت آپ کو اور آپ کی موٹر سائیکل کو جائے واردات کے پاس دیکھا گیا ہے۔ اس کا کیا مطلب سمجھا جائے؟“

”آپ کا جو جی چاہے سمجھتے پھریں۔“

جج نے سخت لہجے میں کہا۔ ”وکیل صاحب جو پوچھ رہے ہیں‘ اس کا سیدھا جواب دیں۔“

وہ بری طرح گھبرایا ہوا تھا۔ اسے امید نہیں تھی اس طرح میرے جال میں پھنس جائے گا۔ وہ بار بار امداد طلب نظروں سے وکیل استغاثہ کو دیکھ رہا تھا۔ وکیل استغاثہ نے خانہ پری کی۔ ”یور آنر! میرے فاضل دوست گواہ کو خواہ مخواہ الجھانے کی کوشش کر رہے ہیں۔“

میں نے کہا۔ ”جناب عالی! استغاثہ کے سب سے اہم گواہ کی ذات مشکوک ہو چکی ہے۔ جس وقت میرے موکل کی بیوی سونیا کو قتل کیا گیا‘ استغاثہ کا مذکورہ گواہ موقع واردات کے پاس ٹہلتا ہوا پایا گیا ہے۔ میری معزز عدالت سے درخواست ہے کہ فاضل وکیل کو جرح کے دوران میں روڑے اٹکانے سے باز رکھا جائے اور گواہ کو میرے سوالات کے جوابات دینے کی تاکید کی جائے۔“

جج نے واصف علی کو تنبیہہ کرتے ہوئے مجھے جرح جاری رکھنے کا اشارہ کیا۔

میں نے پوچھا۔ ”واصف علی صاحب! کیا عدالت یہ سمجھ لے کہ جس وقت آپ کلفٹن کے ساحل پر موجود تھے‘ آپ کا ہمزاد ماڈ ہائٹس کے آس پاس مٹر گشت کر رہا تھا۔“

”جو بات میں ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا وہ اب بتانا ہی پڑے گی۔“ وہ اٹک اٹک کر بولا۔ ”دراصل اس روز مجھے سونیا ہی نے بلایا تھا۔ وہ کوئی خاص بات مجھے بتانا چاہتی تھی لیکن جب میں وہاں پہنچا تو پارکنگ میں حیات کی گاڑی موجود تھی۔ میں اس کے جانے کا انتظار کرنے لگا۔ اسی دوران میں خاصا وقت گزر گیا۔ پھر میں نے سوچا کہ واپس چلا جاتا ہوں بعد میں فون پر سونیا سے بات کر لوں گا لیکن جب رات میں نے سونیا کو فون کرنا چاہا تو دوسری جانب سے کوئی اٹھا نہیں رہا تھا۔ میں تھک ہار کر سو گیا۔ دوسری صبح میں نے اس کے قتل کی خبر اخبار میں پڑھی تھی۔“

وہ مسلسل جھوٹ پر جھوٹ بول رہا تھا۔ جج بھی غصے سے اس کی جانب دیکھ رہا تھا۔

میں نے کہا۔ ”جناب عالی! گواہ بار بار اپنا بیان بدل رہا ہے۔ اس سے اس کی دروغ گوئی کا پتہ چلتا ہے۔ میرا موکل بے گناہ ہے۔ حالات وہ نہیں ہیں جیسے نظر آ رہے ہیں۔ میرے موکل کو دانستہ پھانسنے کی کوشش کی گئی ہے ورنہ اس کا سونیا کے قتل سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔“

وکیل استغاثہ نے فوراً کہا۔ ”اگر ملزم کا اپنی بیوی کے قتل سے کوئی تعلق نہیں ہے تو پھر وہ اس مقدمے میں لاتعلقی کا مظاہرہ کیوں کر رہا ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے اسے اپنی بیوی کی موت کا ذرا سا بھی صدمہ نہ ہو۔“

”آپ نے بجا فرمایا میرے دوست۔“ میں نے وکیل استغاثہ کی بات کا جواب دیتے

ہوئے کہا۔ "میرے موکل کو مقتولہ سے کوئی خاص دلچسپی نہیں ہے۔"

"یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟"

اس کے ساتھ ہی عدالت کا وقت ختم ہو گیا۔

○

اگلی پیشی پر تمام متعلقہ افراد عدالت کے کمرے میں موجود تھے سوائے استغاثہ کے اہم ترین گواہ واصف علی کے۔

جج نے وکیل استغاثہ سے گواہ کے بارے میں استفسار کیا تو وہ بغلیں جھانکنے لگا۔

"جناب عالی! ابھی تھوڑی دیر پہلے تو وہ مجھے برآمدے میں نظر آیا تھا۔ خدا جانے اب کہاں غائب ہو گیا ہے؟"

میں نے کہا۔ "یور آنر! گواہ کی موجودگی بہت ضروری ہے۔ آج میں اس سے ایسے سوالات کرنا چاہتا ہوں کہ میرے موکل کی بے گناہی ثابت ہو جائے گی۔"

جج کے حکم پر چپڑاسی نے برآمدے میں جا کر آواز لگائی مگر واصف علی کا دور دور نام و نشان نہیں تھا۔ پچھلی پیشی پر واصف نے جو بیان دیا تھا اس نے وکیل استغاثہ کو خاصا مایوس کیا تھا۔ بار بار متضاد باتوں سے اسے بوکھلا دیا تھا۔ آج اس کے چہرے پر وہ پہلے والا جوش و خروش نظر نہیں آتا تھا۔

جج نے گزشتہ پیشی والے وکیل استغاثہ کے سوال کو دہراتے ہوئے مجھ سے سوال کیا۔ "وکیل صاحب! آپ نے بتایا تھا کہ آپ کا موکل اپنی بیوی کے قتل کے سلسلے میں کوئی خاص دلچسپی نہیں رکھتا۔ اس کی کوئی خاص وجہ؟"

میں نے حیات یزدانی کی جانب دیکھا، اس نے گردن جھکا دی۔ میں نے پہلے ہی حیات کو بتا دیا تھا کہ عدالت میں اس کی ذات کا یہ حساس پہلو ضرور زیر بحث آئے گا لہٰذا اسے ذہنی طور پر اس قسم کی تکلیف دہ صورتحال کیلئے تیار رہنا چاہئے۔ حیات کی زندگی کے اس خفیہ گوشے سے پردہ اٹھائے بغیر اس کی بے گناہی ثابت نہیں کی جا سکتی تھی۔ اس سلسلے میں جنت نے بھرپور تعاون کا وعدہ کیا تھا۔

میں نے کھنکار کر گلا صاف کیا پھر جج کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "یور آنر، پولیس

کی رپورٹ اور گواہوں کے بیانات میں اس بات کا ذکر موجود ہے کہ وقوعہ والی رات میرے موکل کا اپنی بیوی سے جھگڑا ہو گیا تھا اور وہ اپنے معمول کے خلاف اس رات ایک گھنٹہ پہلے یعنی نو بجے ہی وہاں سے چلا گیا تھا۔ جھگڑے کی وجہ میرے موکل کے بیان میں تحریر نہیں کی گئی مگر میں وہ وجہ معزز عدالت کے سامنے لانے کی جسارت کر رہا ہوں۔"

ایک لمحے کے توقف سے میں نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "جناب عالی! پوسٹ مارٹم کی رپورٹ عدالت کے علم میں آ چکی ہے۔ اسی رپورٹ کے مطابق مقتولہ سونیا کی موت رات نو اور دس بجے کے درمیان واقع ہوئی تھی۔ اس کو موت کی نیند سلانے سے پہلے جنسی تشدد کا نشانہ بھی بنایا گیا تھا۔ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ میں یہ بھی لکھا ہوا ہے کہ مقتولہ تین ماہ کی حاملہ تھی اور یہی وہ خاص بات ہے جو میرے موکل کو بے گناہ ثابت کرتی ہے۔ اسی بات پر ان کے درمیان جھگڑا ہوا تھا۔"

"اس میں جھگڑے والی کون سی بات ہے؟" جج نے سوال کیا۔

میں نے کہا۔ "جناب عالی! میرا موکل ذہنی اور جسمانی طور پر انتہائی صحت مند ہونے کے باوجود اس قابل نہیں ہے کہ اپنی نسل کو چلا سکے۔ اس بات کی گواہی کیلئے اس کی پہلی بیوی جنت کا بیان کافی ہو گا۔ اندرون ملک اور بیرون ملک ہر قسم کے ٹیسٹ کروانے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ اولاد جیسی نعمت خداوندی سے وہ ہمیشہ محروم رہے گا۔ صاحب اولاد ہونے کے لئے مطلوبہ جرثومے اس میں ناپید تھے اور کسی بھی قسم کے علاج سے پیدا نہیں کیے جا سکتے تھے۔ یعنی وہ ازدواجی مسرتوں سے لطف اندوز تو ہو سکتا تھا لیکن زندگی بھر باپ نہیں بن سکتا تھا۔

میرے موکل کے مطابق وقوعہ کی رات جب سونیا نے اسے خوشخبری سنائی کہ وہ باپ بننے والا ہے تو اس کا دماغ گھوم کر رہ گیا۔ اس نے طیش کے عالم میں کہا۔ "یہ ممکن نہیں ہے۔"

"کیوں ممکن نہیں ہے؟" سونیا نے جواباً غصے میں کہا۔ "ہم چھ ماہ سے میاں بیوی کی حیثیت سے رہ رہے ہیں۔ ایسا تو ہونا ہی تھا۔"

حیات نے کوئی جواب نہیں دیا اور غصے میں پاؤں پٹختا ہوا وہاں سے واپس چلا آیا۔

اس نے سوچ لیا تھا کہ کل صبح ہی وہ ایک مرتبہ پھر اپنا ٹیسٹ کروائے گا۔ ممکن ہے اس دوران میں کوئی تبدیلی واقع ہو چکی ہو۔

وہ دروازے سے نکل رہا تھا کہ سونیا نے کہا۔ "عجیب آدمی ہو تم بھی۔ ایسے موقع پر تو مرد خوشی سے نہال ہو جاتا ہے تم تو ایسا ردعمل ظاہر کر رہے ہو جیسے میں نے تمہیں کوئی غلیظ گالی دے دی ہو۔"

اس وقت تک حیات اپنے اشتعال پر قابو پا چکا تھا۔ معتدل لہجے میں بولا۔ "اس وقت تم سے کوئی بات نہیں ہو سکتی۔ میں کل تفصیلی بات کروں گا۔"

سونیا کا جواب سنے بغیر وہ وہاں سے چلا آیا۔ اس وقت رات کے نو بجنے میں چند منٹ باقی تھے۔ دوسرے روز صبح ہی صبح وہ لیبارٹری پہنچ گیا اور ارجنٹ ٹیسٹ کروا ڈالا۔ دوپہر سے پہلے اسے رپورٹ بھی مل گئی جو حسب سابق مایوس کن تھی۔ اس نے فیصلہ کر لیا کہ آج رات وہ جب سونیا کے پاس جائے گا تو اس کی ایسی تیسی کر دے گا اور اسے خوب کھری کھری سنانے کے بعد اپنی زندگی سے نکال دے گا مگر وہ اپنے ارادے کو پایہ تکمیل تک نہ پہنچا سکا، شام سے پہلے ہی پولیس نے اسے سونیا کے قتل کے الزام میں گرفتار کر لیا۔"

"خوب، بہت خوب!" وکیل استغاثہ نے مضحکہ خیز انداز میں کہا۔ "یور آنر، میرے فاضل دوست کہانیاں گھڑنے میں بڑی مہارت رکھتے ہیں۔ اپنے موکل کو بے قصور ثابت کرنے کے لئے انہوں نے کتنی خوبصورت اور تاثیر انگیز کہانی سنائی ہے۔"

میں نے کہا۔ "میں صرف کہانیاں ہی نہیں سناتا ہوں بلکہ ان میں حقیقت کا رنگ بھی بھرتا ہوں۔" پھر میں نے جج کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"جناب عالی! میں نے ابھی ابھی عدالت میں بقول میرے فاضل دوست، جو خوبصورت کہانی سنائی ہے اس میں حقیقت کا رنگ بھرنے کے لئے میرے موکل کی پہلی بیوی جنت اس وقت عدالت میں موجود ہے۔ جنت اور حیات میں آٹھ سالہ ازدواجی رفاقت ہے مگر وہ ہنوز اولاد جیسی نعمت سے محروم ہیں۔"

جنت نے گواہوں کے کٹہرے میں آ کر پہلے زبانی میرے بیان کی تصدیق کی پھر گزشتہ آٹھ سال کے دوران میں ہونے والے حیات کے میڈیکل ٹیسٹ کی رپورٹیں بہ

شمول تازہ ترین ٹیسٹ جج کی خدمت میں پیش کر دیں۔

جج کچھ دیر تک تمام رپورٹوں کو الٹ پلٹ کر ان کا مطالعہ کرتا رہا۔ میں نے مزید دلائل دیتے ہوئے کہا۔ "جناب عالی! وقوعہ والی رات میرا موکل رات نو بجے سے پہلے وہاں سے رخصت ہو چکا تھا۔ اس بات کی تصدیق امجد حسین شیر فروش کے بیان سے بھی ہو جاتی ہے۔ یعنی سونیا کو حیات کے وہاں سے چلے جانے کے بعد ہلاک کیا گیا تھا۔ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ میں لکھا ہوا ہے کہ پہلے اس کا گلا گھونٹا گیا پھر اس کو جنسی زیادتی کا نشانہ بنانے کے بعد سینے میں دو گولیاں اتار کر موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ مقتولہ کے جسم سے برآمد ہونے والی گولیاں اعشاریہ تین دو کے ریوالور سے چلائی گئی ہیں۔ جب کہ حیات کی ملکیت میں جو ریوالور ہے، وہ اعشاریہ دو پانچ کا ہے۔ اس سے یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ قاتل کوئی اور ہے۔"

میں نے ایک لمحے کے توقف سے اپنی بات جاری رکھی۔ "جناب عالی! گواہ نعمت علی کے بیان کے مطابق وقوعہ کے وقت "غیر موجود گواہ" واصف علی موقع واردات کے پاس پریشانی کے عالم میں ٹہلتا ہوا پایا گیا ہے۔ بعد ازاں واصف علی نے اس بات کا اقرار بھی کیا ہے۔ یہ بات عدالت کے ریکارڈ پر موجود ہے مگر اس اقرار کے ساتھ ساتھ گواہ واصف علی نے مقتولہ سونیا سے منسوب کر کے ایک دلچسپ کہانی بھی سنائی ہے۔ اس کے علاوہ بھی اس نے بار بار بیان بدل کر جو مختلف انواع کی کہانیاں سنائی ہیں ان کی تصدیق یا تردید صرف اور صرف ایک ہستی کر سکتی تھی جو اب اس دنیا میں نہیں رہی۔۔۔ یعنی مقتولہ سونیا۔"

میں نے اپنے دلائل جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "جناب عالی! استغاثہ کے گواہ واصف علی کی شخصیت اس کیس میں پہلے ہی مشکوک ہو چکی ہے کیونکہ سونیا نے اسے ٹھکرا کر اور اس کے دشمن حیات یزدانی سے شادی کر کے جلتی پر تیل کا کام کیا تھا۔ ایسی صورت میں اس بات میں شبہے کی کوئی گنجائش نہیں ہے کہ وہ سونیا اور حیات کے لئے اپنے دل میں بے پناہ نفرت رکھتا تھا اور موقع ملنے پر نفرت کو انتقام میں بدلتے ہوئے دیر نہیں لگتی۔ پھر قتل کرنے سے پہلے مقتولہ کے ساتھ جس درندگی کا مظاہرہ کیا گیا ہے، وہ کسی ناآسودہ منتقم المزاج جنونی کا کارنامہ تو ہو سکتا ہے لیکن کوئی شوہر اپنی بیوی کے ساتھ ایسا سلوک ہرگز

ہرگز نہیں کر سکتا۔"

جج بڑی توجہ سے میرے دلائل سن رہا تھا۔ حیات یزدانی کی گردن بدستور جھکی ہوئی تھی۔ بھری عدالت میں اس کا ایک انتہائی ذاتی راز افشا ہو گیا تھا مگر یہ سب کچھ انتہائی مجبوری کے عالم میں کیا گیا تھا' دوسری صورت میں حیات کی گردن پوری طرح پھنسی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ عدالت میں موجود تمام افراد کی نگاہیں مجھ پر لگی ہوئی تھیں۔ جنت کے چہرے پر اطمینان و سکون کے تاثرات اپنی بہار دکھا رہے تھے۔

"یور آنر!" میں نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "میری معزز عدالت سے استدعا ہے کہ گواہ واصف علی کو فوراً بازیاب کروایا جائے اور پولیس کو تاکید کی جائے کہ وہ اسے شامل تفتیش کر کے حقائق کو جاننے کی کوشش کرے تاکہ انصاف کے تقاضے پورے کئے جا سکیں۔ دیٹس آل یور آنرز۔"

جج خاصی دیر تک اپنے سامنے پھیلے ہوئے کاغذات کو الٹ پلٹ کر دیکھتا رہا۔ وہ حیات یزدانی کی میڈیکل رپورٹس کو کئی بار پڑھ چکا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ میرے دلائل سے خاصا متاثر نظر آ رہا تھا۔ وکیل استغاثہ کو تو جیسے سانپ سونگھ گیا تھا۔ وہ اپنی مخصوص سیٹ پر بیٹھا بیزاری سے پہلو بدل رہا تھا۔

جج نے وکیل استغاثہ کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔ "آپ کچھ کہنا چاہتے ہیں وکیل صاحب؟"

اس نے ڈپلومیٹک جواب دیا۔ "جناب عالی! مجھے جو کچھ کہنا ہے' وہ واصف علی کے منظر عام پر آنے کے بعد ہی کہوں گا۔"

جج کو غصہ آ گیا۔ اس نے متعلقہ عدالتی عملے کو ہدایت کی کہ وہ استغاثہ کے گواہ واصف علی کے قابل ضمانت وارنٹ گرفتاری جاری کر دیں پھر تفتیشی افسر کو حکم دیا کہ وہ واصف علی کو جلد از جلد گرفتار کر کے عدالت میں پیش کرے۔

وکیل استغاثہ نے ایک ہفتے کی تاریخ لینا چاہی مگر جج نے اس کی درخواست مسترد کر دی۔

تفتیشی افسر جو ایک اے ایس آئی تھا' ہمارے ساتھ ہی عدالت کے کمرے سے باہر آیا تھا۔ میں نے اس کے پاس سے گزرتے ہوئے کہا۔ "اگر آپ چاہیں تو میں آپ کے بہت کام آ سکتا ہوں۔"

اس نے سوالیہ نظروں سے میری جانب دیکھا' میں نے کہا۔ "میں آپ کو بتا سکتا ہوں کہ واصف علی آپ کو کہاں ملے گا؟ اس کی تلاش میں آپ کو لمبے چوڑے چھاپوں کی ضرورت نہیں پڑے گی۔"

"آپ اپنے کام سے کام رکھیں وکیل صاحب! ہم اپنا کام بہ خوبی جانتے ہیں۔" وہ طنزیہ لہجے میں بولا۔

میں نے بے نیازی سے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔ "ٹھیک ہے' جیسی آپ کی مرضی۔ میں تو آپ کا بھلا چاہ رہا تھا۔"

"بہت بہت شکریہ!" اس نے کہا اور جلدی سے آگے بڑھ گیا۔

حیات یزدانی خاصا پژمردہ نظر آ رہا تھا۔ بھری عدالت میں اسے خاصی خفت اٹھانا پڑی تھی۔ وہ خاموشی کے ساتھ چلتے ہوئے اپنی گاڑی کی جانب بڑھ رہا تھا۔ جنت نے مجھ سے پوچھا۔ "بیگ صاحب! مجھے تو شک ہے کہ قتل اسی نامراد واصف نے کیا ہو گا۔"

"آپ کو شک ہے لیکن حالات و واقعات کی روشنی میں میرا تجربہ بتاتا ہے کہ یقیناً قتل اسی نے کیا ہے یا کسی نہ کسی حوالے سے اس قتل میں اس کا ہاتھ ضرور ہے۔"

"آج آپ نے بہت جان دار دلائل دیئے ہیں۔" جنت نے توصیفی لہجے میں کہا۔

حیات نے شکایتی نظروں سے اسے گھورا مگر وہ اس کی نظروں کی پرواہ کئے بغیر بولی۔ "جج خاصا متاثر نظر آ رہا تھا۔"

میں نے پروثوق انداز میں کہا۔ "انشاء اللہ آئندہ پیشی پر دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جائے گا۔"

"انشاء اللہ۔" جنت نے ایک طویل سانس چھوڑتے ہوئے کہا۔ "اللہ کا شکر ہے' میرا شوہر مجھے واپس مل گیا ہے۔ وہ کیا کہتے ہیں بیگ صاحب۔۔۔ صبح کا بھولا شام کو واپس آ جائے تو اسے۔۔۔"

"تو اسے بھولا (سیدھا سادھا) نہیں سمجھنا چاہئے۔" میں نے اس کا جملہ مکمل کرتے ہوئے کہا۔

جنت نے ایک بلند آہنگ قہقہہ لگایا۔ حیات یزدانی بھی اپنی ہنسی کو ضبط نہ کر سکا۔

* * *

دوسرے روز پولیس نے واصف علی کو گرفتار کر کے عدالت میں پیش کر دیا۔

پولیس نے گزشتہ روز رات گئے اس کے گھر پر چھاپہ مارا تھا۔ گھر کی تلاشی کے دوران میں پولیس کو اعشاریہ تین دو کا ایک ریوالور بھی مل گیا تھا۔ واصف علی نے ریوالور اپنے بیڈ میں فوم کے گدے کے نیچے ہارڈ بورڈ کے تختوں کے درمیان چھپا رکھا تھا۔ پولیس نے مذکورہ ریوالور کو لیبارٹری ٹیسٹ کیلئے بھجوا دیا اور واصف علی کو عدالت میں پیش کر کے سات روز کا ریمانڈ حاصل کر لیا۔ تاہم واصف علی نے سر دست سونیا کے قتل کا اقبال نہیں کیا تھا۔

پولیس کی سات روزہ "مہمان نوازی" نے واصف علی کے کس بال نکال دیئے تھے۔ پھر ریوالور کے کیمیائی تجزیے سے یہ بات ثابت ہو چکی تھی کہ مقتولہ کے جسم سے برآمد ہونے والی گولیاں اسی ریوالور سے چلائی گئی تھیں۔ پولیس نے اپنی تفتیش مکمل کر کے نیا چالان پیش کر دیا۔

اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ محض ضابطے کی کارروائی تھی۔ واصف علی کے پاس فرار کا کوئی راستہ نہیں بچا تھا۔ اس نے اقبال جرم کر لیا اور بھری عدالت میں بہ آواز بلند کہا۔

"مجھے اپنے اس فعل پر کوئی شرمندگی نہیں ہے۔ میں نے جو کچھ بھی کیا، ٹھیک کیا۔ مقتولہ اس سے بھی بدتر سلوک کی مستحق تھی۔ مجھے بس ایک ہی افسوس ہے کہ میں حیات کو کوئی نقصان پہنچانے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ اگر زندگی نے وفا کی اور مجھے موقع ملا تو میں۔۔۔ تو میں۔۔۔"

وہ دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ کر خونخوار نظروں سے حیات یزدانی کو گھورنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں حیوانی چمک نمایاں نظر آ رہی تھی۔ اس کے انداز سے محسوس ہو رہا تھا کہ اگر اسے آزاد کر دیا جائے تو وہ ابھی حیات یزدانی کو چیر پھاڑ کر رکھ دے گا۔

بھری عدالت میں جج کے سامنے اقبال جرم کر کے واصف علی نے اپنے تابوت میں آخری کیل ٹھونک لی تھی۔ آئندہ پیشی پر عدالت نے اسے سزا سنا دی۔ یہ بتانے کی

ضرورت نہیں ہے کہ عدالت نے میرے موکل حیات یزدانی کو باعزت طور پر بری کر دیا تھا۔

اس موقع پر حیات نے اپنے اعلیٰ ظرف ہونے کا ثبوت پیش کیا۔ سونیا کی موت کے بعد ماڈ ہائٹس والا فلیٹ قانونی طور پر اب اس کی ملکیت ہو گیا تھا مگر اس نے مذکورہ فلیٹ اپنے سسرالیوں کے حوالے کر دیا۔ وہ اپنی بے وفا اور بدچلن بیوی کی تلخ یاد کو ذہن سے کھرچ ڈالنا چاہتا تھا۔ بعد میں جنت کی زبانی مجھے معلوم ہوا کہ زویا اور اس کی ماں تو فلیٹ میں منتقل ہو گئی تھیں لیکن صابر حسین نے گولی مار والے مکان کو چھوڑنے سے انکار کر دیا تھا چنانچہ ماں بیٹی نے اسے چھوڑ دیا۔ چند روز بعد صابر حسین کا انتقال ہو گیا۔

حیات یزدانی نے اپنی ساس، سالی کی پلٹ کر خبر نہ لی۔ وہ اپنی جنت میں خوش ہے۔ اگرچہ اس جنت میں کوئی پھول نہیں مہکتا، مگر جنت کا فلسفہ ہے کہ سچی خوشی انسان کے اندر سے پھوٹتی ہے اگر محبت میں شدت ہو تو خزاں میں بھی بھری بہار کا لطف اٹھایا جا سکتا ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے؟

* * *

# انسان نما

آپ نے اکثر لوگوں کو یہ کہتے ہوئے سنا ہوگا کہ آج کل تو شرافت اور بھلائی کا زمانہ ہی نہیں رہا۔ ہر طرف لوٹ کھسوٹ کا بازار گرم ہے۔ ڈاکو اور چور لٹیرے تو رہے ایک طرف، اب تو ملاؤں اور حاجیوں نمازیوں نے بھی کھلم کھلا دھوکے اور فریب کے ذریعے مال بنانا شروع کردیا ہے۔ دونوں ہاتھوں سے دولت سمیٹنا ان کی زندگی کا مقصد اول بن چکا ہے۔ اس سلسلے میں جائز اور ناجائز کی بھی کوئی تمیز نہیں رہی۔ وہ اپنے مقصد کے حصول کی خاطر اپنی شخصیت اور قابل بھروسا وضع قطع کو باقاعدہ ہتھیار کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ مذہب سے دلی لگاؤ رکھنے والے سیدھے سادے اللہ کے بندے بڑی آسانی سے ان باریش معزز چہرہ ہستیوں کے بچھائے ہوئے جال میں پھنس جاتے ہیں۔ وہ ان معصوم اور سادہ لوح لوگوں کو اپنی لچھے دار اور اللہ رسول کے ذکر سے لب ریز باتوں کے شکنجے میں جکڑ کر اس طرح نچوڑتے ہیں کہ ان مصیبت زدگان میں داد و فریاد کی سکت بھی باقی نہیں رہتی۔

میرا گھڑی ساز موکل بھی کچھ ایسے ہی خیالات کا مالک تھا۔

مندرجہ بالا رائے کسی طور پر بھی معقول اور صحت مند کہلائے جانے کی مستحق نہیں ہے۔ حقیقت سے اس کا دور کا بھی تعلق نہیں۔ دراصل ہمارے معاشرے کے معتبر اور قابل احترام لوگوں نے مکر و فریب، ریاکاری اور دھوکا دہی کو اپنا شعار نہیں بنایا اور نہ ہی کبھی انہوں نے اس معاملے میں کسی کی حوصلہ افزائی کی ہے بلکہ ڈاکوؤں، چوروں اور دیگر جرائم پیشہ انسان نما بھیڑیوں نے داڑھیاں بڑھا کر اور معزز افراد کا بھیس بدل کر اپنا کام چمکانا شروع کر دیا ہے۔ نیک اور پرہیز گار لوگوں کو

الزامات دینے کے بجائے ان معاشرتی لٹیروں سے ہوشیار رہنا چاہئے۔ ایسے ہی لوگوں کے لئے کہا جاتا ہے۔ صورت موموناں، کرتوت کافراں۔

وہ گھڑی ساز مجھے کار ساز کے اسٹاپ پر ملا تھا۔ میں اپنے ایک عزیز کو ائر پورٹ چھوڑ کر واپس آرہا تھا۔ اس روز بسوں اور ویگنوں کی ہڑتال تھی۔ مجھے اچھی طرح یاد نہیں، شاید کرایہ بڑھانے کے سلسلے میں یہ ہڑتال کی گئی تھی۔ میں اپنی گاڑی میں تھا اور شارع فیصل کے راستے میرا واپسی کا سفر جاری تھا کہ کار ساز کے اسٹاپ پر ایک شخص نے ہاتھ ہلا کر مجھے رکنے کا اشارہ کیا۔

میں نے گاڑی اس کے نزدیک لے جاکر روک دی پھر بائیں جانب کا شیشہ اتار کر پوچھا “کیا بات ہے ؟”

“بابو جی، آپ کس طرف جا رہے ہیں ؟” اس شخص نے الٹا سوال کر دیا۔

اس کی عمر لگ بھگ چالیس سال رہی ہوگی۔ اس نے شلوار سوٹ پہن رکھا تھا۔ چہرے سے وہ ایک شریف شہری نظر آتا تھا۔ میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے استفسار کیا۔ “تمہیں کہاں جانا ہے ؟”

“جی، مجھے تو سعید منزل کی طرف جانا ہے۔” اس نے بلا تامل جواب دیا۔ “اگر آپ اس طرف نہ جا رہے ہوں تو راستے میں کہیں۔”

میں نے اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی گاڑی کا پچھلا دروازہ کھول دیا “بیٹھ جاؤ۔”

وہ مجھے دعائیں دیتے ہوئے گاڑی کی پچھلی نشست پر بیٹھ گیا۔ میں نے گاڑی آگے بڑھا دی۔

آج صبح جب میں گھر سے نکلا تھا تو پوری طرح تیار ہوکر چلا تھا۔ میرا ارادہ تھا کہ اپنے مذکور عزیز کو ائرپورٹ پہنچا کر میں سیدھا کورٹ جاؤں گا۔ میرا وکیلوں والا مخصوص کوٹ اس وقت گاڑی کی عقبی نشست پر ایک طرف رکھا تھا۔ کچھ دیر تک گاڑی میں خاموشی رہی پھر اس شخص نے سلسلہ کلام کا آغاز کرتے ہوئے کہا “میں اس تکلیف کے لئے معذرت خواہ ہوں۔ میں تو گھر سے نکل کر پھنس گیا تھا۔”

میں نے پوچھا “آپ کو معلوم نہیں کہ آج ٹرانسپورٹرز نے ہڑتال کا اعلان کر

رکھا تھا ؟"

"پتہ تو تھا لیکن یقین نہیں تھا کہ ہڑتال اتنی کامیاب ہو جائے گی۔" اس نے بتایا "ایک گھنٹا پہلے گھر سے نکلا تھا۔ ہر اسٹاپ پر کچھ دیر رک کر انتظار کرتا رہا پھر مایوس ہوکر پیدل ہی آگے بڑھ جاتا۔ اکا دکا ٹیکسی والوں سے بھی بات کی مگر صاحب! آج تو ان کے منہ کھلے ہوئے ہیں۔ بھلا بتایئے' وہ ڈرگ کالونی سے سعید منزل تک جانے کے پورے ساٹھ روپے مانگ رہے ہیں (اس زمانے میں مذکورہ فاصلے کے لئے ٹیکسی کا میٹر زیادہ سے زیادہ تیس روپے بناتا تھا) خدا کا خوف تو دلوں سے بالکل ہی اٹھ گیا ہے۔ ہر شخص دوسرے کی مجبوری سے فائدہ اٹھانے کی تاک میں لگا ہوا ہے۔ اب تو بس قیامت آنے ہی والی ہے۔"

میں نے سرسری انداز میں کہا "یہ تو آپ ٹھیک کہتے ہیں۔"

وہ خاصا باتونی دکھائی دیتا تھا۔ اس لئے میں نے مناسب یہی سمجھا کہ بات بڑھانے کے بجائے خاموشی اختیار کرلوں ورنہ خواہ مخواہ وہ کان کھائے گا۔ اس نے شاید میرے خیالات پڑھ لیے تھے یا وہ اپنی عادت سے مجبور تھا۔ ابھی مجھے خاموش ہوئے دو منٹ بھی نہیں گزرے ہوں گے کہ وہ پھر بول اٹھا۔

"اپنی گاڑی بھی اس دور میں بہت بڑی نعمت ہوتی ہے صاحب!"

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میرے بن پوچھے ہی اس نے اپنے بارے میں بتایا کہ اس کی رہائش سعید منزل پر تھی۔ ڈرگ کالونی میں اس کی بہن اور بہنوئی رہتے تھے۔ گزشتہ رات وہ ان کے یہاں ٹھہرا ہوا تھا۔ اس کے چار بچے تھے۔ ان کا نام منظور حسین اور اس کے بہنوئی کا نام عبدالقیوم تھا۔ صدر کے علاقے میں اس کی ایک چھوٹی سی دکان تھی۔ جہاں وہ گھڑیوں کی مرمت کا کام کرتا تھا۔ اس کے علاوہ پرانی گھڑیوں کی خرید و فروخت بھی کرتا تھا۔ اس کا بہنوئی عبدالقیوم کے ایم سی میں کوئی کلرک ٹائپ چیز تھا۔ وغیرہ وغیرہ۔ اس کے علاوہ اس نے حالات کا رونا رویا جو اس ملک میں بسنے والے بیشتر لوگوں کا المیہ ہے۔

میں خاموشی سے ڈرائیونگ پر توجہ مرکوز کئے ہوئے تھا۔ اس صورت میں کہ جب میں اس کی باتوں کا خاطر خواہ جواب نہیں دے رہا تھا تو اصولی طور پر اسے

چاہیے تھا کہ وہ بھی خاموش بیٹھا رہے مگر بعض لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ چاہے کوئی ان کی بات سنے یا نہ سنے مگر وہ اپنی سنائے جاتے ہیں۔ چند لمحوں کے توقف کے بعد اس نے پوچھا "آپ دفتر جا رہے ہیں نا ؟"

میں نے اثبات میں جواب دیا' اس نے دریافت کیا۔ "آپ کا دفتر کہاں ہے ؟"

"سٹی کورٹ کے نزدیک۔"

"اوہ !" اس نے ایک طویل سانس خارج کی۔ "پھر تو آپ بہت سے وکیلوں کو بھی جانتے ہوں گے ؟"

"جی ہاں ' آپ کا اندازہ درست ہے۔"

"جناب ' آپ مجھے کسی ایمان دار وکیل کے بارے میں بتا سکتے ہیں" اس کے لہجے میں دبا دبا جوش شامل تھا۔ "دراصل میں ایک چکر میں بری طرح پھنس چکا ہوں۔ میں ہی کیا بلکہ عبدالقیوم بھی میرے ساتھ ہے۔ اسی سلسلے میں کل رات میں ڈرگ کالونی اس کے پاس آیا تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کریں۔ اب ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ہمیں انصاف کے حصول کے لئے عدالت سے رجوع کرنا چاہیے۔ کوئی ایمان دار اور ہوشیار وکیل ہمیں ہمارا حق دلا سکتا ہے۔"

مجھے اس روز جلد از جلد عدالت پہنچنا تھا۔ میرے ایک انتہائی اہم مقدمے کی سماعت تھی جو اپنے اختتامی مراحل میں داخل ہوچکا تھا۔ اگر میں منظور حسین نامی اس گھڑی ساز کو یہ بتا بیٹھتا کہ میں بھی ایک کامیاب وکیل ہوں تو مجھے قوی امید تھی کہ وہ اپنی رام کہانی سنائے بغیر' مجھے آگے بڑھنے نہیں دے گا۔ میں اس وقت کسی تاخیر کا متحمل نہیں ہوسکتا تھا اس لئے منظور حسین پر ٹوٹنے والی مصیبت کی تفصیلات جاننے کے بجائے میں نے ٹالنے والے انداز میں کہا "ایک ایسا وکیل ہے تو سہی میری نظر میں مگر وہ فیس کے معاملے میں کسی رو رعایت کا قائل نہیں ہے۔"

منظور حسین نے کہا "ارے صاحب' جہاں لاکھوں ڈوبتے ہوئے نظر آرہے ہوں' وہاں فیس کی کمی بیشی کیا معنی رکھتی ہے۔ آپ مجھے اس وکیل کا ایڈریس بتائیں۔ میں کل ہی عبدالقیوم کے ساتھ جاکر اس سے مل لوں گا۔"

میں نے اپنی جیب سے اپنا وزیٹنگ کارڈ نکال کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے

کہا "یہ رکھ لیں، یہ اسی وکیل کا کارڈ ہے۔ کافی عرصے سے میرے پاس رکھا ہوا تھا۔" "خدا آپ کا بھلا کرے۔" اس نے میرے ہاتھ سے کارڈ لے کر الٹ پلٹ کر دیکھا۔

مجھے یہ اندازہ لگانے میں ذرا بھی دیر نہیں لگی کہ وہ انگریزی تحریر نہیں پڑھ سکتا تھا۔ اس نے کارڈ اپنی جیب میں رکھنے کے بعد میرا شکریہ ادا کیا۔ اتنی دیر میں ہم سعید منزل کے اسٹاپ پر پہنچ چکے تھے۔ میں اسے وہاں اتار کر آگے بڑھ گیا۔

اس واقعے کے دو روز بعد ایک دوپہر میں عدالتی بکھیڑوں سے فارغ ہو کر اپنے دفتر پہنچا تو انتظار گاہ میں منظور حسین کو بیٹھے ہوئے دیکھا۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے مجھے سلام کیا پھر حیرت میں ڈوبی ہوئی آواز میں بولا۔ "صاحب، آپ!"

میں نے پیشہ ورانہ مسکراہٹ کو ہونٹوں پر سجاتے ہوئے کہا "منظور حسین، میں ہی وہ وکیل ہوں جس کا کارڈ اس روز میں نے تمہیں دیا تھا۔"

میں نے دیکھا، منظور حسین کے ساتھ ایک لحیم شحیم پستہ قامت شخص بھی وہاں موجود تھا۔ میرے خیال میں وہ منظور حسین کا بہنوئی عبدالقیوم تھا۔ بعد میں میرے اس خیال کی تصدیق بھی ہو گئی۔ اس وقت انتظار گاہ میں ان دونوں کے سوا اور کوئی کلائنٹ موجود نہیں تھا اسی لیے میں نے انہیں اپنے کمرے میں بلا لیا۔

وہ دونوں میرے سامنے رکھی کرسیوں میں بیٹھ چکے تو میں نے خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرتے ہوئے پوچھا "ہاں تو جناب، میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟"

باہر انتظار گاہ میں، میں نے منظور حسین کے ہاتھ میں ایک فائل دبی دیکھی تھی۔ اس نے وہ فائل میز پر رکھتے ہوئے سوالیہ نظروں سے عبدالقیوم کی طرف دیکھا۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے وہ پوچھ رہا ہو کہ وکیل سے بات تم کرو گے یا میں کروں۔

عبدالقیوم کی عمر کم و بیش پینتیس سال تھی مگر منظور حسین کی بہ نسبت وہ کوتاہ قد اور خاصا ڈیل ڈول والا شخص تھا۔ اس کے چہرے پر نمایاں چیز اس کی بھاری مونچھیں تھیں۔ مجھے اپنی جانب دیکھتے ہوئے محسوس کر کے عبدالقیوم نے گفتگو کا آغاز کیا۔ اس نے منظور حسین کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "بھائی صاحب، میرا خیال ہے کہ پہلے فیس کی بات کر لی جائے!"

منظور حسین نے استفساریہ نظروں سے میری طرف دیکھا، میں نے کہا "فیس کی بات تو میں بعد میں کروں گا۔ پہلے تو یہ معلوم ہو کہ آپ کا کیس کیا ہے۔ پوری بات سننے کے بعد اگر میں نے آپ کا کیس لڑنے کا فیصلہ کر لیا تو پھر فیس بھی بتا دوں گا۔"

عبدالقیوم نے منظور حسین سے کہا "بھائی صاحب، وکیل صاحب کو آپ ہی سب کچھ بتائیں۔"

منظور حسین نے اپنے سامنے رکھی ہوئی فائل میری جانب بڑھا دی "وکیل صاحب، سارا کیس اس فائل میں بند ہے۔ پہلے آپ اس کا مطالعہ کر لیں پھر میں آپ کو بتاؤں گا۔"

میں نے وہ فائل کھول کر دیکھی۔ اس میں مختلف قسم کی رسیدیں لگی ہوئی تھیں۔ ایک دو ایگریمنٹ قسم کی دستاویزات بھی تھیں جو "حاجی بلڈرز" کے لیٹر ہیڈ پر تیار کی گئی تھیں۔ رسیدوں سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ وہ کسی فلیٹ کی بکنگ کے سلسلے میں ادا کی جانے والی ماہانہ قسطوں کے لئے جاری کی گئی تھیں۔ اس کے علاوہ چند بھاری ادائیگیوں کی رسیدیں بھی موجود تھیں۔ مختلف کاغذات پر "طور کمپلیکس" اور "طور اسکوائر" کا بھی اندراج تھا۔ کسی ایفی ڈیوٹ کی ایک نقل بھی فائل میں لگی ہوئی تھی۔ اسی نوعیت کے کچھ اور کاغذات بھی تھے۔

میں نے فائل کا سرسری جائزہ لینے کے بعد اسے بند کر دیا پھر منظور حسین سے پوچھا "اب تفصیلات آپ بتائیں؟"

وہ باتونی شخص کسی ٹیپ ریکارڈ کے مانند بج اٹھا۔ اس کی زبان کسی تیز رفتار مشین کے سے انداز میں چل رہی تھی۔ میں نے رف پیڈ اور قلم سنبھال لیا اور ضروری پوائنٹ نوٹ کرنے لگا۔ وقفے وقفے سے عبدالقیوم بھی گفتگو میں شامل ہو جاتا تھا مگر ایک آدھ بات کے لئے۔ مجھے منظور حسین کی زبانی اس کیس کی نوعیت کے بارے میں جو باتیں معلوم ہوئیں ان میں سے غیر ضروری باتوں کو حذف کر کے میں آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں تاکہ آپ عدالتی کارروائی کے لئے ذہنی طور پر تیار ہو جائیں اور جرح کے دوران میں آپ کو کوئی الجھن محسوس نہ ہو۔

* * *

منظور حسین دو کمرے کے کرائے کے فلیٹ میں رہتا تھا۔ اسی کی بیوی خالصتاً ایک گھریلو عورت تھی۔ آمدنی کا ذریعہ منظور حسین کی صدر والی دکان تھی اور وہ دکان بھی کرائے پر تھی۔ بچے ابھی چھوٹے تھے یعنی اس قابل نہیں ہوئے تھے کہ معاشی طور پر وہ والد کا ہاتھ بٹاسکیں۔ اس پر ان کی تعلیم کے اخراجات الگ تھے۔ منظور کی بیوی کی سدا سے خواہش رہی تھی کہ ان کا اپنا ذاتی گھر ہو۔ وہ اکثر اوقات شوہر کو اس سلسلے میں اکساتی بھی رہتی تھی۔

“تمہاری آدھی آمدنی تو کرائے کی مد میں نکل جاتی ہے۔” وہ کہتی “باقی جو رقم بچتی ہے، اس سے میں گھر کیسے چلاؤں؟”

“میں تو جو کچھ کماتا ہوں، تمہاری ہتھیلی پر لاکر رکھ دیتا ہوں۔” منظور حسین جواباً کہتا۔ “صبح کا نکلا ہوا رات گئے لوٹتا ہوں۔ اب تم ہی بتاؤں، میں اور کیا کرسکتا ہوں؟”

“کسی طرح گھر اپنا ہو جائے تو ہمارے خاصے مسئلے حل ہو جائیں گے۔”

“مگر یہ ہو کیسے؟” منظور حسین نے سر پکڑتے ہوئے کہا۔ “مجھ میں تو اتنی سکت نہیں ہے کہ اپنا گھر خرید سکوں۔”

اس کی بیوی نے کہا “میں تو ذاتی گھر کے خواب اپنے ساتھ ہی لے کر قبر میں اتر جاؤں گی۔”

“ایسی بدفالیں منہ سے نہیں نکالتے۔” منظور حسین نے پیار بھری سرزنش کی “مایوسی گناہ ہے، اللہ کے گھر سے ہمیشہ امید رکھنا چاہیے۔”

“اسی امید پر تو زندہ ہوں ورنہ تم تو زندگی بھر کرائے کے گھر میں ہی رکھو گے۔”

منظور حسین کو بیوی کے بدلے ہوئے رویئے پر حیرت ہوئی تاہم اس نے متحمل مزاجی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ “اگر تم مجھے قصور وار سمجھتی ہو تو یہ تمہاری زیادتی ہے۔ میں اس آمدنی میں کیسے ذاتی گھر خرید سکتا ہوں؟”

“سب خریدتے تھوڑی ہیں۔”

“کیا مطلب؟” منظور حسین نے چونک کر بیوی کی جانب دیکھا۔

“مطلب یہ کہ تم ابھی تک انیس سو چھتیس میں سانس لے رہے ہو۔” وہ میٹھی ناراضی سے بولی “آج کل ذاتی گھر خریدنا تو بہت آسان ہوگیا ہے۔ جن کے پاس کچھ نہیں ہوتا، ان کے بارے میں بھی سنتے ہیں کہ انہوں نے فلاں جگہ فلیٹ بک کروالیا ہے۔”

“اوہ، تو یہ مطلب تھا تمہارا!” منظور حسین نے گہری سانس چھوڑتے ہوئے کہا “تم قسطوں والے فلیٹ کی بات کر رہی ہو؟”

“تو تم نے خاصی معلومات بھی حاصل کرلی ہیں۔”

“اور نہیں تو کیا۔ کیا ہم اتنے ہی گئے گزرے ہیں کہ ماہانہ پانچ سو روپے بھی ادا نہ کر سکیں۔”

“میں تمہاری طرح اتنی بھی بے خبر نہیں ہوں۔” منظور حسین کی بیوی نے کہا “تصدق حسین کی بیوی بتا رہی تھی کہ ادھر قریب ہی ایک نیا منصوبہ شروع ہوا ہے۔ آج کل اس کا اشتہار بھی اخبار میں آرہا ہے۔ بس پانچ ہزار روپے ایڈوانس دے کر فلیٹ بک کروایا جاسکتا ہے۔ اس کے بعد پانچ سو ماہوار قسط ہوگی۔”

“تم نہیں سمجھتی ہو ان چکروں کو۔” منظور حسین نے کہا “ان میں سے اکثر بلڈرز فراڈ ہوتے ہیں۔ بعد میں پتہ چلے کہ جو کچھ تھوڑا بہت اپنے پاس تھا، وہ بھی گیا ہاتھ سے۔”

“تم سدا کے بزدل ہو۔” اس کی بیوی نے طعنہ دیا “نہ ہی تم نے کبھی ترقی کے بارے میں سوچا ہے۔ ساری زندگی اسی چھ فٹ کی دکان میں رہو گے اور ہم اس دو کمرے کی کابک میں گھٹ گھٹ کر مرجائیں گے۔”

“آج تم یہ کیسی باتیں کر رہی ہو؟” منظور حسین نے ذرا سخت لہجے میں کہا “پہلے تو تم اتنی ناشکری نہیں تھیں۔”

“اس میں ناشکری کی کیا بات ہے۔ کیا مجھے یہ حق حاصل نہیں ہے کہ میں جس گھر میں رہ رہی ہوں اسے اپنا گھر کہہ سکوں؟”

”وہ تو ٹھیک ہے سلمی۔ مگر انسان کو اپنے وسائل کو بھی دیکھنا چاہیے۔“

”میں کچھ نہیں جانتی۔“ سلمی نے ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا ”میں یہ برداشت نہیں کرسکتی کہ ہمارے بچے بھی ہمیشہ کرائے کے مکانوں میں دھکے کھاتے رہیں۔ میں اپنی آنکھ بند ہونے سے پہلے ان کے ٹھکانے کا بندوبست ضرور کروں گی۔“

”ذرا میں بھی تو سنوں، تم آخر کرنا کیا چاہتی ہو؟“

”بس تم میرا ساتھ دو، پھر دیکھتے جاؤ کیا ہوتا ہے۔“ سلمی نے پراعتماد لہجے میں کہا۔

”مجھ سے کس قسم کا تعاون چاہتی ہو؟“

سلمی نے کہا ”بس تم ماہانہ قسط کا ذمہ اٹھا لو۔ تمہیں ہر صورت میں ہر ماہ پانچ سو روپے کا انتظام کرنا ہوگا۔“

”اور وہ بکنگ کے پانچ ہزار روپے؟“

”ان کا بندوبست کرنا میری ذمے داری ہوگی۔“

منظور حسین نے پوچھا ”تمہارے پاس یہ رقم کہاں سے آئے گی؟“

”میں اپنے زیورات بیچ دوں گی۔“

”زیورات ہیں ہی کتنے جو بیچ دو گی۔“ منظور حسین کے لہجے میں افسردگی ٹپک رہی تھی ”میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آرہا کہ تمہیں ہو کیا گیا ہے۔“

سلمی نے قطعیت سے کہا ”مجھے“ اپنا گھر ”ہوگیا ہے۔“

منظور عجیب سی نظروں سے سلمی کو دیکھنے لگا، وہ بولی۔ ”میری تمام بہنوں کے ذاتی گھر ہیں۔ ان کے شوہر اچھا خاصا کماتے ہیں۔ ان کے گھر میں ہر طرف آسودگی ہی آسودگی نظر آتی ہے۔ مجھے تو وہاں جاتے ہوئے بھی شرم آتی ہے۔ اسی سب کی خاطر تو میں انہیں اپنے گھر نہیں بلاتی ہوں۔ کم از کم اگر گھر ہمارا اپنا ہو تو اس آمدنی میں بھی گھر کی اندرونی حالت بدلی جاسکتی ہے۔ کرائے کی مد میں جانے والی رقم جب گھر میں استعمال ہوگی تو یہاں بھی بہار آجائے گی۔ ان پردوں کو دیکھ رہے ہو تم، کیا حالت ہو رہی ہے ان کی۔ پانچ سال پہلے لنڈا بازار سے خرید کر لائی تھی۔ گھر میں ڈھنگ کا کوئی برتن نہیں ہے۔ فریج بھی اتنا پھٹیچر ہوچکا ہے کہ سال میں بارہ مرتبہ مکینک کے پاس جاتا ہے۔ تم تو سارا دن دکان پر رہتے ہو۔ تم کیا جانو کہ گھر میں کیا ہوتا ہے۔“

سلمی نے آج سے پہلے کبھی اس انداز میں منظور حسین سے بات نہیں کی تھی۔ اپنے گھر کی افادیت اور ضرورت کا احساس تو اسے بھی تھا مگر وہ اس معاملے میں خود کو بے بس پاتا تھا۔ اتنی رقم اس کے پاس تھی نہیں کہ یک مشت ادا کرکے وہ کوئی چھوٹا موٹا گھر خرید لیتا۔ کہیں سے کوئی ادھار ملنے کی بھی امید نہیں تھی اور قسطوں والے فلیٹ کی بکنگ پر اس کا دل کبھی آمادہ نہیں ہوا تھا۔ اس کے خیال میں یہ سراسر فریب کا کاروبار تھا۔ سلمی کی اس غیر متوقع تقریر نے اسے رنجیدہ کر دیا۔ ابھی وہ ان الفاظ کی تلاش میں سوچ و فکر کی خاک چھان رہا تھا جن کی مدد سے وہ سلمی کو قائل کرسکے کہ سلمی کی آواز نے اسے لوٹ آنے پر مجبور کر دیا۔ اس نے چونک کر سلمی کی جانب دیکھا، وہ کہہ رہی تھی۔

”تم پانچ سو روپے ماہانہ کی ذمے داری اٹھاتے ہو یا میں باجی سے بات کروں؟“

منظور حسین کی خود داری پر سلمی کے الفاظ نے اتنے کوڑے برسائے کہ اس کی روح تک لہولہان ہوگئی۔ سلمی اپنی بڑی بہن یعنی منظور حسین کی سالی کا ذکر کررہی تھی۔ شگفتہ کا شوہر ایک سرکاری محکمے میں ایسی پوسٹ پر تھا کہ اس پر ہن برستا تھا۔ منظور حسین نے زخمی نظروں سے اپنی بیوی کی طرف دیکھا مگر سلمی کا انداز بتا رہا تھا کہ اسے اپنے شوہر کی تکلیف کا ذرا بھی احساس نہیں تھا۔

منظور حسین نے طنزیہ انداز میں کہا ”اگر تمہاری باجی اتنی ہی دریا دل ہیں تو ان سے کہو، پورا فلیٹ ہی دلوا دیں۔“

”اب تم سے یہی امید رہ گئی ہے۔“ وہ ناگواری سے بولی۔ ”خود کچھ نہیں کرو گے، بیوی سے بھیک منگواؤ گے۔“

”تم کیا ہر وقت مرچیں چبائے رہتی ہو۔ کبھی آرام سے بھی بات کرلیا کرو۔“

سلمی نے کہا ”میں تو آرام ہی سے تمہیں سمجھا رہی تھی لیکن تم کوئی بات سمجھ کر بھی دو تو۔“ ایک لمحے کے توقف سے اس نے مزید کہا ”میں کل اپنے زیورات لے کر کھارادر کی صرافہ مارکیٹ بھی گئی تھی اور صدر سے بھی میں نے مختلف دکانوں سے ریٹ معلوم کیے ہیں۔ ساڑھے چار ہزار روپے تو مل ہی جائیں گے۔ پانچ سو تم ملا

دینا۔”

منظور حسین نے کہا “تم تو اسی بات پر خوش ہو کہ پانچ ہزار روپے میں فلیٹ بک ہو جائے گا اور بس ماہانہ پانچ سو روپے دینا ہوں گے مگر میں نے تو سن رکھا ہے کہ وہ لوگ بیچ بیچ میں بھی رقم کا مطالبہ کرتے رہتے ہیں اور قبضہ بھی کوئی اتنی آسانی سے نہیں دیتے بشرطیکہ ...... وہ واقعی قبضہ دینے کا ارادہ بھی رکھتے ہوں۔”

“تمہیں تو خواہ مخواہ کا وہم ہو گیا ہے۔”

“یہ بات میں نہیں کہہ رہا ہوں۔ لوگوں کی اکثریت کا یہی خیال ہے۔”

سلمی نے بے پروائی سے کہا “لوگوں کا کیا ہے۔ ان کی باتوں پر چلتے رہے تو بس ہو گیا کام۔”

منظور حسین نے گویا ہتھیار پھینکتے ہوئے کہا “بھئی مجھے تو ان فلیٹوں کے بارے میں زیادہ معلوم نہیں ہے۔ تم جانو اور تمہارا کام۔”

“یونہی گھر میں بیٹھے باتیں بناتے رہے تو کچھ بھی نہیں ہو گا۔” سلمی چیخ کر بولی “تم کل دکان سے جلدی گھر آجاؤ' پھر ہم دونوں بکنگ آفس جاکر ساری معلومات حاصل کرلیں گے۔ میں دن میں کسی وقت زیورات بیچ کر رقم بھی لے آؤں گی۔”

“میں تو فوری طور پر ایک ہزار روپے کا انتظام نہیں کر پاؤں گا۔” منظور حسین نے کمزور سا احتجاج کیا۔

“تم ہر وقت روتے ہی رہنا۔” سلمی نے ہاتھ نچا کر کہا۔ “میں ہی کچھ کراوں گی۔ بس تم جلدی آجانا۔ باجی کی بیسی (کمیٹی) کے پیسے میرے پاس رکھے ہیں۔ ان میں سے ایک ہزار لے لوں گی۔ باجی کو بعد میں دے دیں گے۔”

حسب پروگرام دوسرے روز وہ “طور کمپلیکس” کے بکنگ آفس پہنچ گئے۔ یہ پروجیکٹ “حاجی بلڈرز” کے زیر انتظام شروع ہوا تھا اور بندر روڈ (ایم اے جناح روڈ) پر واقع تھا۔ دفتر میں اس وقت خاصا رش تھا۔ ظاہر ہے وہ لوگ فلیٹ بک کروانے کی غرض ہی سے وہاں آئے ہوں گے۔ سلمی نے فاتحانہ نگاہوں سے اپنے شوہر کو دیکھا۔ منظور حسین ان نظروں کا پیغام واضح طور پر سمجھ گیا تھا۔ سلمی اسے احساس دلا رہی تھی کہ دیکھو' میں نہ کہتی تھی کہ جلد از جلد فلیٹ بک کروا لینا چاہئے' اب اس رش سے تم خود ہی اندازہ لگالو۔ کیا یہ سب لوگ اتنے ہی احمق ہیں جو دھڑا دھڑ یہاں بکنگ کے لئے آرہے ہیں۔

اپنی باری پر وہ بکنگ کلرک کے پاس پہنچ گئے۔ کلرک نے خندہ پیشانی سے ان کا استقبال کیا پھر ان کے کچھ بولنے سے پہلے وہ رٹا رٹایا سبق دہرانے لگا۔

“دیکھیں جناب! ہمارے پاس تین مختلف **کیٹیگری** کے فلیٹ ہیں۔ اب یہ آپ کی ضرورت پر منحصر ہے کہ آپ کس قسم کا فلیٹ بک کروانا چاہتے ہیں۔”

“وہ تین **کیٹیگری** کون کون سی ہیں؟” کلرک ایک لمحے کو سانس لینے کے لئے رکا تو منظور حسین نے سوال کیا۔

“**کیٹیگری** اے' بی اور سی۔” بکنگ کلرک نے جواب دیا “**کیٹیگری** اے میں تین بیڈ روم **اٹیچڈ** باتھ' ایک ڈرائنگ روم' ایک ڈائننگ' ٹی وی لاؤنج' کچن اور دو بالکونیاں شامل ہیں۔ **کیٹیگری** بی میں تین بیڈ روم **اٹیچڈ** باتھ' ایک ڈرائنگ روم' ٹی وی لاؤنج' کچن اور ایک بالکونی شامل ہے۔ کیٹگری سی میں دو بیڈ روم اٹیچڈ باتھ' ایک ڈرائنگ روم' لاؤنج' کچن اور ایک بالکونی شامل ہے۔”

منظور حسین نے جلدی سے کہا “ہاں' یہ ٹھیک رہے گا۔”

“ٹھیک ہے' گویا آپ سی **کیٹیگری** میں فلیٹ بک کروانا چاہتے ہیں؟”

سلمی نے بکنگ کلرک کے جواب پر ناپسندیدہ نظروں سے شوہر کر گھورا مگر کچھ بولی نہیں۔ اتنا ہی بہت تھا کہ وہ اللہ کا بندہ کسی طرح فلیٹ بک کرانے پر راضی تو ہوا تھا۔

منظور حسین نے کلرک سے پوچھا “مذکورہ فلیٹ کے بارے میں کچھ تفصیل بتائیں؟”

وہ بولا “دیکھیں صاحب' سی **کیٹیگری** میں آپ کی بکنگ پانچ ہزار سے ہوگی۔ اس صورت میں آپ کو دو سال تک ماہانہ پانچ سو روپے قسط ادا کرنا ہوگی۔ اس کے علاوہ ہر چھ ماہ بعد آپ کو آٹھ ہزار روپے ادا کرنا ہوں گے۔ دو سال بعد آپ کو فلیٹ کا قبضہ دے دیا جائے گا۔”

منظور حسین نے دل ہی دل میں حساب جوڑا۔ ماہانہ۔۔۔ قسطیں دو سال میں چوبیس

ادا کرنا ہوں گی۔ پانچ سو روپے ماہوار کے حساب سے یہ ہوگئے بارہ ہزار' پانچ ہزار بکنگ کے ملا کر ہوگئے سترہ ہزار۔ ہر چھ ماہ بعد آٹھ ہزار کے حساب سے دو سال میں ہوگئے بتیس ہزار روپے۔ کل ملا کر ہوگئے انچاس ہزار روپے۔

"یعنی انچاس ہزار روپے میں دو سال بعد آپ ہمیں فلیٹ کا قبضہ دیں گے؟" منظور حسین نے کلرک سے پوچھا۔

"جی ہاں' آپ نے بالکل درست حساب لگایا ہے۔" کلرک نے جواب دیا "یہ وہ رقم ہے جو آپ ہمیں مختلف قسطوں میں ادا کریں گے۔ اس کے علاوہ ایچ بی ایف سی (ہاؤس بلڈنگ فنانس کارپوریشن) کا قرضہ ہوگا جو قبضہ ملنے کے ایک سال بعد آپ پر قسطوں کی صورت میں واجب الادا ہوگا۔ یہ قسطیں کئی سال تک چلیں گی۔"

"ہمارے مطلوبہ فلیٹ پر کتنا قرضہ ہوگا؟"

"اس سلسلے میں کوئی حتمی بات نہیں کہی جاسکتی۔ ویسے اندازاً" اسی ہزار تک قرضہ منظور ہو جائے گا۔"

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ فلیٹ ہمیں ایک لاکھ انتیس ہزار روپے میں پڑے گا؟"

"جی ہاں' تقریباً"۔"

منظور حسین نے بیوی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "یہ تو بہت زیادہ ہے۔"

کلرک نے منظور حسین کو بدکتے ہوئے دیکھا تو شاطرانہ انداز میں سلمی سے مخاطب ہوا "باجی' ایک تجویز ہے میرے پاس۔ اگر آپ اس پر غور کریں تو آپ کی اچھی خاصی رقم بچ سکتی ہے۔"

سلمی جلدی سے بولی "وہ کیا؟"

"میں نے ہر چھ ماہ بعد آٹھ ہزار روپے کی جس ادائیگی کا ذکر کیا ہے ----- اس میں خاصی رعایت ہوسکتی ہے"

دونوں میاں بیوی سوالیہ نظروں سے بکنگ کلرک کو دیکھنے لگے۔ وہ بولا "یہ ریٹ میں نے آپ کو فرسٹ اور سیکنڈ فلور کے فلیٹوں کے لئے بتایا تھا۔ اگر آپ تھرڈ فلور پر فلیٹ بک کروانا چاہیں تو یہ اماؤنٹ آٹھ ہزار سے گھٹ کر سات ہزار روپے ہر

چھ ماہ بعد ہو جائے گی۔ اسی طرح اگر آپ فورتھ فلور پر چلے جاتے ہیں تو آپ کو ہر چھ ماہ بعد پانچ ہزار روپے ادا کرنا ہوں گے۔ اس حساب سے ہر چھ ماہ بعد والی کل ادائیگی تھرڈ فلور پر اٹھائیں ہزار روپے اور فورتھ فلور پر مزید کم ہوکر بیس ہزار روپے ہو جائے گی۔ اس طرح وہی فلیٹ جو آپ کو فرسٹ اور سیکنڈ فلور پر ایک لاکھ انتیس ہزار روپے میں مل رہا ہے وہ تھرڈ فلور پر ایک لاکھ پچیس ہزار روپے کا ہو جائے گا اور فورتھ فلور پر وہی فلیٹ ایک لاکھ سترہ ہزار روپے کا ہو جائے گا۔ اب آپ خود فیصلہ کرلیں۔ فورتھ فلور پر فلیٹ بک کروانے سے آپ کے بارہ ہزار روپے بچ جائیں گے۔"

"اچھا' ہم آپس میں مشورہ کرکے آپ کو بتاتے ہیں۔" منظور حسین نے کہا اور سلمی کو ساتھ لے کر واپس ویٹنگ روم میں آگیا۔

"یہ چوتھا فلور تو میری سمجھ سے باہر ہے۔" سلمی نے بیٹھتے ہی کہا "اتنی سیڑھیاں کون چڑھے گا۔ پتا نہیں یہ لوگ اس بلڈنگ میں لفٹ بھی لگائیں گے یا نہیں اور پھر لفٹ کا بھی کیا بھروسا' کسی وقت بھی خراب ہوسکتی ہے۔ لائٹ بھی جاسکتی ہے۔ نہ بابا نہ' تم فرسٹ یا سیکنڈ فلور پر ہی فلیٹ بک کرواؤ۔"

سلمی خاموش ہوئی تو منظور حسین نے کہا "بس کہہ چکیں یا کچھ باقی ہے؟"

وہ منظور حسین کی بات کا مطلب نہیں سمجھ پائی' ہونقوں کی طرح اس کا چہرہ دیکھنے لگی۔

وہ بولا "تمہیں زینے چڑھنے اور اترنے کی پڑی ہوئی ہے۔ اور مجھے وہ ہر چھ ماہ بعد والی ادائیگی کی فکر کھائے جا رہی ہے۔ میں نے تم سے پہلے ہی کہا تھا کہ یہ لوگ بہت مکار ہوتے ہیں۔ پہلے اپنے دام میں پھانستے ہیں پھر آہستہ آہستہ نچوڑتے ہیں۔ کہا تھا یا نہیں؟"

"تو تم کیا سمجھتے ہو وہ ہمیں مفت میں فلیٹ دے دیں گے؟"

"تم تو کج بحثی پر اتر آتی ہو۔" منظور حسین نے غصیلے لہجے میں کہا "میرے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ وہ ادائیگی ہم کہاں سے کریں گے؟"

سلمی نے کہا "ہو ہی جائے گا کچھ نہ کچھ۔ میں گھر کے خرچے میں بچت کروں

گی۔ تم بھی زیادہ محنت کرو۔ ہمیں اس موقع کو ضائع نہیں کرنا چاہیے۔" ایک لمحے کو رک کر اس نے اضافہ کیا "اگر کچھ نہ ہوسکا تو میں سلائی کا کام شروع کروں گی۔ تمہیں اس فکر میں زیادہ دبلا ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔"

اب منظور حسین کے پاس اعتراض کی کوئی گنجائش نہیں تھی تاہم اس نے کسی نہ کسی طرح سلمی کو اس بات پر راضی کر ہی لیا کہ وہ فورتھ فلور پر فلیٹ بک کرائیں گے۔ سلمی کی آمادگی کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ اسے معلوم ہوگیا تھا' طور کمپلیکس میں دو لفٹوں کا انتظام تھا۔ اس کے علاوہ بجلی جانے کی صورت میں جنریٹر کا متبادل نظام بھی پروجیکٹ کا باقاعدہ حصہ تھا۔

کچھ ہی دیر کے بعد وہ دونوں ایک مرتبہ پھر بکنگ کلرک کے سامنے بیٹھے تھے۔

کلرک نے روایتی پیشہ ورانہ مسکراہٹ سے گفتگو کا آغاز کیا "مجھے امید ہے کہ آپ کسی فیصلے پر پہنچ گئے ہوں گے؟"

سلمی نے جواب دیا "ہم نے فورتھ فلور والے فلیٹ کی بکنگ کا فیصلہ کیا ہے۔"

"آپ واقعی سمجھ دار اور دور اندیش خاتون ہیں۔" بکنگ کلرک نے مسکا لگایا "فرسٹ اور سیکنڈ فلور پر ایک تو قیمت زیادہ ادا کرو' دوسرے آلودگی کی مصیبت الگ۔ آپ بندر روڈ کے ٹریفک سے بخوبی آگاہ ہیں۔"

سلمی اپنی تعریف سن کر خوشی سے پھول گئی۔ اس نے فخریہ نظروں سے منظور حسین کی طرف دیکھا۔ وہ اپنی ضدی بیوی سے نظریں چرا کر بکنگ کلرک کی جانب متوجہ ہوگیا۔

کلرک نے کہا "ٹھیک ہے' آپ بکنگ کے پانچ ہزار اور اس مہینے کی قسط کی رقم یعنی کل ساڑھے پانچ ہزار روپے ادا کردیں۔ میں ابھی آپ کا **ایگریمنٹ** تیار کروا دیتا ہوں۔"

"ماہانہ قسط بھی اسی ماہ سے شروع ہو جائے گی؟" منظور حسین نے پوچھا۔

"جی ہاں' اس میں آپ ہی کا فائدہ ہے۔" کلرک نے جواباً کہا "یعنی اب آپ کو صرف تیس ماہ قسطیں ادا کرنا ہوں گی۔"

بکنگ کلرک خاصا چرب زبان اور اپنے کام کا ماہر معلوم ہوتا تھا۔ منظور حسین نے گن کر مذکورہ رقم اسے ادا کی' ایک مرتبہ پھر وہ انتظار گاہ میں جاکر بیٹھ گئے۔

آدھے گھنٹے بعد انہیں **ایگریمنٹ** کی کاپی فراہم کردی گئی۔ یہ **ایگریمنٹ** منظور حسین الاٹی اور حاجی بلڈرز کے درمیان طور کمپلیکس کے فورتھ فلور کے سی **کیٹیگری** فلیٹ کے لئے ہوا تھا۔ پہلی قسط کی ادائیگی کی رسید بھی اس اس کے ساتھ منسلک تھی۔ **ایگریمنٹ** کی پشت پر درج شدہ قواعد و ضوابط پڑھ کر تو منظور حسین کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ اس نے پریشان نظروں سے سلمی کی جانب دیکھا مگر اب کچھ نہیں ہوسکتا تھا۔ اب تو وہ راہ پرخار پر پہلا قدم رکھ چکے تھے۔

سب سے زیادہ خطرناک شرائط یہ تھیں کہ اگر ماہانہ قسط متواتر دو ماہ تک نہ دی گئی تو بکنگ خود بخود کینسل ہو جائے گی اور اس وقت تک جمع شدہ رقم پروجیکٹ کی تکمیل کے بعد ڈیفالٹر الاٹی کو ادا کی جائے گی۔ اسی طرح ہر چھ ماہ بعد دی جانے والی بھاری قسط اگر ایک ماہ کے اندر اندر ادا نہ کی گئی تو الاٹی ڈیفالٹر تصور کیا جائے گا۔ اس صورت میں بکنگ کینسل ہو جائے گی اور بلڈر اپنی مرضی سے وہ فلیٹ کسی بھی دوسرے شخص کو الاٹ کرنے کا مجاز ہوگا۔

بکنگ کلرک نے تسلی آمیز لہجے میں کہا "جناب' یہ سب تو بس رسمی کارروائی سمجھ لیں۔ دراصل اس دنیا میں ہر طرح کے لوگ پائے جاتے ہیں۔ یہ شرائط محض پھڈے باز لوگوں کی خاطر ہیں۔ آپ خواہ مخواہ پریشان نہ ہوں۔ آپ اچھے خاصے شریف آدمی ہیں اور حاجی ہدایت اللہ و حاجی شرافت علی (حاجی بلڈرز کے دونوں پارٹنرز) کو تو میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ انشاء اللہ ہمارے درمیان کبھی بدمزگی پیدا نہیں ہوگی۔"

قصہ مختصر' وہ دونوں طور کمپلیکس کے سائٹ آفس سے واپس گھر آگئے۔ چند روز بعد انہی کی دیکھا دیکھی منظور حسین کے ڈرگ کالونی والے بہنوئی عبدالقیوم نے بھی اسی کمپلیکس میں فورتھ فلور پر ایک سی **کیٹیگری** فلیٹ بک کروالیا۔ گویا وہ مستقبل کے پڑوسی ہونے والے تھے۔

اصل مصیبت کا آغاز تین ماہ بعد ہوا جب انہیں حاجی بلڈرز کی جانب سے ایک نوٹس ملا۔ اس نوٹس میں انہیں مطلع کیا گیا تھا کہ بلڈنگ کی باقاعدہ تعمیر کا آغاز ہوچکا

ہے۔ اس لئے ان سے درخواست کی جاتی ہے کہ دو ماہ کے اندر اندر پندرہ ہزار روپے حاجی بلڈرز کے دفتر میں جمع کروا دیں۔

یہ ایک غیر متوقع افتاد تھی۔ منظور حسین نے سب سے پہلے عبدالقیوم سے رابطہ کیا اور اس سے اس نوٹس کے بارے میں دریافت کیا۔ عبدالقیوم کو بھی ویسا ہی نوٹس مل چکا تھا۔ ظاہر ہے، انہوں نے اپنے تمام الاٹیز کو وہ نوٹس بھیجے ہوں گے۔ عبدالقیوم اور منظور حسین دوسرے ہی روز بکنگ آفس پہنچ گئے۔ اس مرتبہ ان کی ملاقات حاجی صاحبان سے بھی ہوگئی۔ انہوں نے اس نوٹس کے بارے میں استفسار کیا۔

حاجی ہدایت اللہ نے جواب دیا "مجھے یقین نہیں آرہا جناب کہ آپ اتنے ہی بے خبر ہیں۔ سب لوگ یہ بات جانتے ہیں کہ تعمیر کے آغاز پر ایک بھاری خصوصی قسط بھی ادا کرنا پڑتی ہے۔ اسی طرح جب بلڈنگ کا اسٹرکچر مکمل ہو جائے گا تو جب بھی آپ کو پندرہ ہزار کی ایک قسط دینا ہوگی اور قبضے کے وقت پندرہ ہزار کی تیسری اور آخری قسط ہوگی۔"

عبدالقیوم نے تند لہجے میں پوچھا "آپ کا مطلب ہے، ہمیں فی فلیٹ پینتالیس ہزار روپے ...... اضافی ادا کرنا ہوں گے؟"

"اضافی نہیں میرے بھائی۔" حاجی شرافت علی نے مشفقانہ لہجے میں کہا "یہ اس فلیٹ کی قیمت میں شامل ہے۔"

"مگر اس رقم کا کوئی ذکر آپ نے بکنگ کے وقت تو نہیں کیا تھا۔" منظور حسین نے تپتے ہوئے لہجے میں کہا۔

حاجی ہدایت نے حلق کی گہرائی سے آواز نکالتے ہوئے کہا "غصہ اچھی چیز نہیں ہے میرے بھائی دوسرے لوگ تو اس قسم کی چار یا پانچ قسطیں لیتے ہیں، ہم تو صرف تین لے رہے ہیں اور اگر آپ کو یہ قسطیں دینے میں کوئی اعتراض ہے یا آپ سمجھ رہے ہیں کہ خدانخواستہ آپ پھنس گئے ہیں تو عزیزم، آپ اپنی بکنگ کینسل کروا دیں۔ یہاں تو ہزاروں لوگ دن رات چکر لگاتے ہیں۔ لگتا ہے، آپ ضرورت مند نہیں ہیں جو اس قسم کے اعتراض کرنے چلے آئے ہیں۔"

عبدالقیوم نے کہا "اس حساب سے تو ہمیں یہ فلیٹ ایک لاکھ باسٹھ ہزار روپے میں پڑے گا؟"

"بجا فرمایا حضرت۔" حاجی ہدایت اللہ نے سر کو اوپر نیچے حرکت دیتے ہوئے کہا "بیاسی ہزار روپے آپ ہمیں مختلف نوعیت کی قسطوں کی صورت میں دو سال میں ادا کریں گے۔ ہاؤس بلڈنگ کا اسی ہزار کا قرضہ اس کے علاوہ ہوگا۔"

یہ آج سے بائیس تیئس سال پہلے کا واقعہ ہے۔ آج کل مذکورہ فلیٹ کی قیمت چھ لاکھ سے کسی بھی طور ..... کم نہ ہوگی۔

منظور حسین اور اس کا بہنوئی دفتر سے نکل آئے۔ منظور حسین کا اصرار تھا کہ بکنگ کینسل کروا دی جائے مگر عبدالقیوم نے اپنے سالے کو سمجھایا کہ اس صورت میں نقصان ہے۔ بکنگ کینسل ہو جانے کے بعد فوری طور پر رقم تو مل نہیں سکتی تھی۔ پروجیکٹ کی تکمیل تک انہیں انتظار کرنا پڑتا۔ عبدالقیوم کا مشورہ یہ تھا کہ بکنگ کو قائم رہنے دیا جائے۔ اللہ مالک ہے جو ہوگا، دیکھا جائے گا۔

"تمہارے لئے تو کوئی فرق نہیں پڑتا۔" منظور حسین نے برہمی سے کہا "تم تو کسی نہ کسی طرح پیسوں کا انتظام کر ہی لو گے مگر یہ تو سوچو کہ میرا کیا بنے گا۔ تمہیں میری مالی حالت کا بخوبی اندازہ ہے۔ مجھے تو ہر چھ ماہ بعد والی پانچ ہزار کی رقم کے بارے میں سوچتے ہوئے بخار چڑھ جاتا ہے۔"

"اب آپ اتنے بھی فکر مند ہوں بھائی صاحب۔" عبدالقیوم نے نہایت ہی محبت سے کہا "میں تو اب بھی اپنے ذاتی گھر میں رہ رہا ہوں۔ مجھ سے زیادہ آپ کے لئے ضروری ہے کہ بکنگ کو چلنے دیں۔ مجھ سے جو بن پڑا، آپ کی مدد کروں گا۔"

"مگر۔"

عبدالقیوم نے منظور حسین کو جملہ مکمل نہیں کرنے دیا۔ "آپ اسے قرض حسنہ سمجھ کر قبول کر لیجئے گا۔"

بہرحال تھوڑی سی ردوکد کے بعد یہ طے ہوگیا کہ یہ غیر متوقع پینتالیس ہزار روپے منظور حسین کے حصے کے بھی عبدالقیوم ہی ادا کرے گا۔ زندگی میں حالات نے کبھی منظور حسین کو توفیق دی تو وہ یہ قرض واپس لوٹا دے گا۔

ابھی پچھلے دنوں میں بھی بلڈرز مافیا کے چنگل میں پھنستے پھنستے بچ گیا ہوں۔ میں نے ان کی ہیرا پھیریوں کی سینکڑوں داستانیں سن رکھی تھیں مگر براہ راست پہلی مرتبہ واسطہ پڑا تھا۔ میں نے ساحل سمندر پر ایک لگژری ہاؤسنگ پروجیکٹ میں ایک اپارٹمنٹ بک کروایا تھا۔ بکنگ کے کچھ عرصے بعد ایک نوٹس کے ذریعے مجھ سے بھاری رقم کا مطالبہ کیا گیا۔ میں نے دوسرے ہی روز سائٹ کا معائنہ کیا۔ وہاں خالی پلاٹ کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ میں نے بلڈرز کو ایک لیگل نوٹس بھجوا دیا۔ جس میں استفسار کیا گیا تھا کہ مجھے بتایا جائے، مجھ سے حاصل کی گئی رقم کہاں خرچ کی گئی ہے۔ جب کہ سائٹ پر کسی بلڈنگ کے آثار نظر نہیں آتے۔ اگر پندرہ دن کے اندر اندر مجھے تسلی بخش جواب نہ ملا تو میں کورٹ میں کیس کر دوں گا۔ نوٹس کی ترسیل کے چند روز بعد بلڈر کا ایک نمائندہ مجھے بکنگ کی رقم واپس کر گیا۔ معذرت اس کے علاوہ کی۔ ہمیشہ سے میرا یہ تجربہ رہا ہے کہ برائی کو یا تو آغاز ہی میں روکا جاسکتا ہے۔ یا پھر کبھی نہیں روکا جاسکتا۔ برا آدمی چاہے کتنا بھی طاقت ور ہو، وہ سچائی کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ جیت آخر کار سچائی ہی کی ہوتی ہے۔

منظور حسین اور عبدالقیوم حسب پروگرام باقاعدگی سے قسطیں ادا کر رہے تھے۔ دو سال میں بلڈنگ کا اسٹرکچر تیار ہوچکا تھا۔ فنشنگ کا کام باقی تھا لیکن تعمیراتی کام کو بریک لگ گئے تھے۔ دراصل ابھی تک ایچ بی ایف سی کی جانب سے لون سنکشن نہیں ہوسکا تھا اور بلڈرز کو ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھے رہنے کا موقع مل گیا تھا۔ اس وقت تک منظور حسین اور عبدالقیوم انفرادی طور پر سترسٹھ ہزار روپے حاجی بلڈرز کو ادا کرچکے تھے۔ پندرہ ہزار والی آخری قسط ابھی باقی تھی جو فنشنگ کے بعد دینا تھی یعنی جب انہیں فلیٹ کا قبضہ ملتا۔

وہ قرضے کی منظوری کا انتظار کر رہے تھے کہ ایک اندوہ ناک خبر نے ان کے ہوش اڑا دیئے۔

حاجی صاحبان میں پھوٹ پڑگئی تھی۔ کسی الاٹی کو یہ پتہ نہ چل سکا کہ ان کے درمیان وجہ نزاع کیا تھی۔ وہ سب تو پہلے ہی تعمیر کے رک جانے اور قرضے کے منظور نہ ہونے کی وجہ سے بہت پریشان تھے۔ اب یہ نئی افتاد آن پڑی تھی۔ منظور حسین

اور عبدالقیوم بھی اپنے ہاتھ کٹوا کر بہت پچھتا رہے تھے۔ مگر اب کیا ہوسکتا تھا۔ ہاتھ سے گئے ہوئے پیسے واپس نہیں آسکتے تھے۔ اس پر ستم یہ ہوا کہ حاجی بلڈرز کے دفتر پر تالا پڑگیا۔ منظور حسین نے حاجی ہدایت اللہ وغیرہ سے صحیح صورت حال معلوم کرنے کے لئے ان کے دفتر میں کئی چکر لگائے مگر ہر دفعہ ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ اب صبر کے سوا کوئی چارہ نہ تھا سو وہ صبر کرنے پر مجبور تھے۔ جن لوگوں سے بات ہوسکتی تھی جب وہی غائب تھے تو پھر کیا ہوسکتا تھا۔

چند ماہ کے بعد حاجی بلڈرز کا دفتر کھل گیا۔ منظور حسین کی جان میں جان آئی۔ وہ دوڑا دوڑا وہاں پہنچا۔ اب اسے معلوم ہوا کہ حاجی ہدایت اللہ اور حاجی شرافت علی کے درمیان گزشتہ عرصے میں نوبت مقدمے بازی تک جاپہنچی تھی اور وہ کورٹ کچہری کے چکروں میں الجھے رہے تھے۔ بہرحال اب حالات قابو میں آچکے تھے۔ حاجی شرافت علی اپنا حصہ لے کر حاجی بلڈرز سے علیحدگی اختیار کرچکا تھا اور حاجی ہدایت اللہ اب بلاشرکت غیرے حاجی بلڈرز کا ..... مالک و مختار تھا۔ کسی نے یہ جاننے کی کوشش نہیں کی کہ ان حاجی صاحبان کے درمیان آخر کس بات پر جھگڑا ہوا تھا اور کس کورٹ میں کس نوعیت کی مقدمے بازی ہوتی رہی تھی۔ یہی کافی تھا کہ ان لوگوں نے جس تعمیراتی کمپنی کو رقم دے رکھی تھی، اس کا دفتر کھل چکا تھا اور صاحب دفتر بھی اب باقاعدگی سے وہاں آنے لگا تھا۔ حاجی شرافت علی کو اس دن کے بعد پھر وہاں نہیں دیکھا تھا۔

یہاں سے حاجی ہدایت اللہ نے ایک نئے ڈرامے کا آغاز کیا۔ اکثر الاٹی اپنے فلیٹوں کے بارے میں آئندہ کی منصوبہ بندی کے متعلق معلومات حاصل کرنے آتے رہتے تھے۔ منظور حسین نے ایک روز حاجی ہدایت اللہ سے دریافت کیا۔ اس وقت اس کا بہنوئی عبدالقیوم بھی اس کے ساتھ تھا۔

”حاجی صاحب، آخر قرضہ کب تک منظور ہو جائے گا؟ ہم تو بہت پریشان ہیں۔“

”میں آپ لوگوں سے بھی زیادہ پریشان ہوں۔“ حاجی ہدایت اللہ نے مسکین صورت بنا کر جواب دیا ”حاجی شرافت علی نے بڑے نازک موقع پر مجھے دھوکا دیا ہے۔ اگر وہ کمپنی سے الگ نہ ہوتا تو میں نے سوچ رکھا تھا کہ اپنی جیب سے رقم خرچ

کرکے طور کمپلیکس کو مکمل کرلوں گا تاکہ آپ لوگ سکون کا سانس لیں مگر اب تو کچھ بھی ممکن نہیں رہا۔ کمپنی کا سرمایہ آدھے سے زیادہ حاجی شرافت کی جیب میں چلا گیا ہے۔ میں بے دست و پا ہو کر رہ گیا ہوں۔ آپ کو یقین نہیں آئے گا' میں اس وقت آپ لوگوں سے زیادہ مجبور ہوں۔"

عبدالقیوم نے پر تشویش انداز میں کہا "حاجی صاحب' اگر ہاؤس بلڈنگ والوں نے قرضہ نہ دیا تو ہمارا کیا ہوگا۔ ہم تو ایک بھاری رقم پھنسا بیٹھے ہیں۔"

"بدگمانی کو دل میں جگہ نہ دو میرے بھائی۔" حاجی ہدایت اللہ نے بزرگانہ انداز میں کہا "آپ کی رقم کہیں نہیں جاتی۔ اس کی طرف سے آپ بے فکر رہیں۔"

"ہم بے فکر کس طرح رہ سکتے ہیں جناب؟" منظور حسین نے تیز آواز میں کہا۔

"اللہ پر بھروسا رکھیں۔"

عبدالقیوم نے کہا "اللہ پر تو ہمارا بھروسا ہے۔"

"پھر تو اللہ ضرور آپ کی مدد کرے گا۔" حاجی ہدایت اللہ نے تسلی آمیز لہجے میں کہا "آپ ہاؤس بلڈنگ والوں کی نظر کرم کا انتظار کریں۔"

"اگر ہم بکنگ ختم کروانا چاہیں تو؟" منظور حسین نے پوچھا۔

"اس سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔"

"ہم نے حاجی بلڈرز کو ایک بھاری رقم ادا کی ہے۔ آپ حاجی بلڈرز کے مالک ہیں۔ آپ چاہیں تو بہت کچھ ہو سکتا ہے۔"

حاجی ہدایت اللہ نے نرمی سے سمجھانے والے انداز میں کہا "دیکھو میرے بھائی' جوش و جذبات سے مسائل حل نہیں ہوتے۔ ذرا ٹھنڈے دل سے سوچو تو بات تمہاری سمجھ میں آجائے گی۔ قانونی طور پر تو تم مجھ سے کسی رقم کا مطالبہ نہیں کرسکتے۔ میں نے اب تک اپنے وعدے کے مطابق تعمیر کا کام جاری رکھا ہے۔ ہاؤس بلڈنگ والے اگر قرضے کے اجرا میں دیر سویر کر رہے ہیں تو اس میں میرا کیا قصور۔ میں نے تو یہاں تک سوچ رکھا تھا کہ خود اپنے پیسوں سے اس پروجیکٹ کو مکمل کرلوں گا مگر حاجی شرافت علی کی علیحدگی کے بعد اب میری مالی حیثیت وہ نہیں رہی۔ اگر آپ بکنگ کینسل کرنا چاہتے ہیں تو بڑے شوق سے کر دیجئے مگر اس صورت میں بھی آپ کو آپ کی ادا کی ہوئی رقم واپس نہیں مل سکے گی۔ نہ تو ایگریمنٹ کی رو سے اور نہ ہی انسانی ہمدردی کے ناتے کیونکہ اس وقت میں مالی طور پر کسی بھی قسم کی ہمدردی کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔"

منظور حسین کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ وہ سخت پریشانی میں مبتلا تھا البتہ اس کی بہ نسبت عبدالقیوم زیادہ فکر مند نظر نہیں آتا تھا۔ اس نے حاجی ہدایت اللہ کی جانب دیکھتے ہوئے کہا "حاجی صاحب' آپ ہمارے مسئلے کا کوئی نہ کوئی حل ضرور نکالیں۔"

"میں آپ کے لئے کیا کرسکتا ہوں؟"

عبدالقیوم نے کہا "آپ کوئی ایسی سبیل کریں کہ ہمیں ہماری رقم مل جائے۔ آپ یقین کریں' ہم نے جن لوگوں سے قرض لے کر فلیٹ کی بھاری قسطیں ادا کی تھیں انہوں نے اب دروازہ کھٹکھٹانا شروع کر دیا ہے۔" ایک لمحے کو رک کر اس نے نہایت جذباتی لہجے میں کہا "حاجی صاحب' ہم عزت دار لوگ ہیں۔ آپ سے زیادہ کون جانتا ہوگا کہ عزت دار کو عزت کتنی پیاری ہوتی ہے۔"

"ہم نے تو یہی سوچا تھا کہ اپنے فلیٹ میں آجائیں گے تو کرائے کی مد میں ہر ماہ جانے والی رقم سے قرضہ اتار دیں گے مگر یہاں تو کوئی آثار ہی نظر نہیں آرہے۔" منظور حسین نے دزدیدہ نظروں سے حاجی ہدایت اللہ کی طرف دیکھا "خدا ایسی ذلت سے تو موت دے دے' اچھا ہے۔"

"کفر کی باتیں نہ کرو میرے بھائی۔" حاجی ہدایت اللہ نے رقت آمیز آواز میں کہا "مایوسی گناہ ہے۔ اس کی ذات سے ناامید نہیں ہونا چاہیے۔"

منظور حسین نے کہا "وہ تو ٹھیک ہے لیکن جب عزت سے زندہ رہنے کا کوئی راستہ نظر نہ آرہا ہو تو انسان موت کی خواہش کرنے ہی لگتا ہے۔"

حاجی ہدایت اللہ آنکھیں بند کرکے کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

منظور حسین نے سوالیہ نظروں سے اپنے بہنوئی کی طرف دیکھا' وہ بھی حیرت آمیز نظروں سے کبھی حاجی ہدایت اللہ اور کبھی منظور حسین کی طرف دیکھ رہا تھا۔

منظور حسین کے چہرے پر تشویش کے سائے لہرا رہے تھے جب کہ عبدالقیوم کی آنکھوں میں اطمینان کی جھلک تھی۔ کچھ دیر بعد حاجی ہدایت اللہ نے آنکھیں کھول کر باری باری دونوں کے چہروں کا جائزہ لیا پھر جذباتی آواز میں بولا۔

"تم فکر نہ کرو۔ تمہاری مجبوریوں نے میری روح کو جھنجوڑ ڈالا ہے۔ میں تمہارے لئے کچھ نہ کچھ ضرور کروں گا۔"

منظور حسین اور عبدالقیوم نے بیک وقت سوالیہ انداز میں حاجی ہدایت اللہ کو دیکھا۔

حاجی ہدایت اللہ نے کہا "تم ایک ہفتے بعد میرے پاس آنا۔ جب تک میں کچھ سوچتا ہوں۔"

وہ دونوں حاجی ہدایت اللہ کو درازی عمر کی دعائیں دیتے ہوئے دفتر سے نکل آئے۔

منظور حسین کا خیال تھا کہ آئندہ ملاقات پر حاجی ہدایت اللہ ان کی رقم واپس کر دے گا۔ عبدالقیوم اتنا خوش گمان نہیں تھا تاہم اسے امید تھی کہ حاجی ہدایت اللہ ڈوبی ہوئی رقم کے سلسلے میں کوئی نیا منصوبہ ان کے سامنے رکھے گا۔ ایک ہفتے بعد جب وہ دوبارہ حاجی بلڈرز کے دفتر پہنچے تو عبدالقیوم کے اندازے کی تصدیق اور منظور حسین کے خیال کی تردید ہوگئی۔

حاجی ہدایت اللہ نے تمہید باندھی "میری مالی پوزیشن سے آپ لوگ بخوبی واقف ہیں۔ اگر آپ مجھ سے یہ توقع رکھتے ہوں کہ میں آپ کی رقم واپس کروں گا تو آپ کو اس سلسلے میں مایوسی ہوگی۔"

"قطع کلامی کی معافی چاہتا ہوں۔" عبدالقیوم نے سلسلہ کلام کو منقطع کرتے ہوئے کہا "آپ یک مشت رقم ادا نہ کرسکتے ہوں تو دو چار قسطوں میں دے دیں۔"

"یہ بھی ناممکن ہے۔" حاجی ہدایت اللہ نے دو ٹوک انداز میں کہا۔

"آپ نے ہم سے وعدہ کیا تھا کہ ایک ہفتے بعد....."

"مجھے اپنا وعدہ یاد ہے۔" حاجی ہدایت اللہ نے ہاتھ کے اشارے سے منظور حسین کو بولنے سے روک دیا "اور میں نے آپ کے مسئلے کا ایک حل بھی نکال لیا

ہے۔"

"وہ کیا؟"

"میرے پاس ایک تجویز ہے۔" حاجی ہدایت اللہ نے کہا "اگر آپ کو وہ تجویز منظور ہو تو جلد یا بدیر آپ اپنی رقم حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔"

عبدالقیوم نے پوچھا "اور وہ تجویز کیا ہے؟"

"سپرہائی وے پر، سہراب گوٹھ سے کچھ آگے میں نے کچھ پلاٹ لے رکھے ہیں۔" حاجی ہدایت اللہ نے بتایا "آپ نے فلیٹ کی بکنگ کے سلسلے میں اب تک حاجی بلڈرز کو جو رقم ادا کی ہے اس کے بدلے میں، میں دو پلاٹ آپ دونوں کے نام کردیتا ہوں۔ آپ میں سے ہر ایک نے حاجی بلڈرز کو سڑسٹھ ہزار روپے ادا کیے ہیں۔ وہاں پر موجود ایک پلاٹ کسی بھی طرح ستر ہزار سے کم کا نہیں ہے۔ آپ پلاٹ دیکھیں گے تو حیران رہ جائیں گے۔ پوری کوٹھی بھی تعمیر کر ڈالو تو پھر بھی بچ رہیں۔"

"نہ بابا نہ۔" منظور حسین نے جلدی سے کہا "ہم اس جنگل بیابان میں تو رہنے سے رہے۔"

حاجی ہدایت اللہ نے کہا "کیا ضروری ہے کہ آپ وہاں جا کر رہیں بھی۔ بھئی انہیں یونہی پڑا رہنے دیں۔ دو تین سال بعد دگنی مالیت کے ہو جائیں گے اور اگر فوری طور پر بھی بیچ ڈالیں تو نقصان میں نہیں جائیں گے۔ کچھ دے کر ہی جائیں گے۔"

کچھ دیر کی بحث و تمحیص اور باہمی صلاح مشورے کے بعد سالا بہنوئی حاجی ہدایت اللہ کی تجویز پر عمل کرنے کے لئے تیار ہوگئے۔ دونوں کو آمادہ پاکر حاجی ہدایت اللہ کے چہرے پر اطمینان جھلکنے لگا۔ وہ اطمینان کسی مسئلے کے حل ہو جانے یا کسی مصیبت کے ٹل جانے کا نہیں تھا بلکہ وہ ایک ایسا اطمینان تھا جو کسی شکاری کے چہرے پر اس وقت نمودار ہوتا ہے جب شکار پوری طرح اس کے بچھائے ہوئے دام میں آپھنستا ہے۔

"بس تو پھر ٹھیک ہے۔" حاجی ہدایت اللہ نے داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "آپ حضرات دو روز بعد تشریف لے آئیں، میں قانونی کاغذات تیار کروا کے رکھوں گا۔" ایک لمحے کے توقف کے بعد اس نے اضافہ کیا۔ "اور ہاں، یہ بات آپ اور کسی

کو نہیں بتائیں گے۔ اب میرے پاس اتنے پلاٹ بھی نہیں ہیں کہ سب کو بانٹتا پھروں۔"

دونوں نے راز داری کا وعدہ کیا اور وہاں سے چلے آئے۔

دو روز بعد وہ حاجی بلڈرز کے دفتر پہنچے تو تمام کاغذات تیار تھے۔ بس ان کے دستخط ہونا باقی تھے۔ کچھ عدالتی کام بھی تھا جو بعد میں ہونا تھا۔ تمام کاغذات کے بغور مطالعہ کرنے کے بعد عبدالقیوم بھڑک اٹھا۔ وہ کاغذات دراصل منظور حسین اور عبدالقیوم کی جانب سے ایک حلفیہ بیان تھا جس میں اسی بات پر زور دیا گیا تھا کہ وہ فلیٹ کی بکنگ کے سلسلے میں ڈی فالٹر ہوگئے تھے جس کی وجہ سے حاجی بلڈرز نے ان کی بکنگ کینسل کردی تھی اور ان کی ادا کی ہوئی رقم انہیں واپس کی جا رہی تھی۔

"یہ کیا ہے حاجی صاحب ؟" عبدالقیوم نے پہلی بار ناگوار نظروں سے حاجی ہدایت اللہ کی طرف دیکھا۔

حاجی ہدایت اللہ نے کہا۔ "بھئی جب تک آپ لوگ بکنگ والی رقم کی وصولی کی رسید نہیں دیں گے، میں وہ پلاٹ آپ کے نام کیسے کرسکتا ہوں۔"

"یہ بھی تو ہوسکتا تھا کہ آپ ہمیں ڈی فالٹر قرار دیئے بغیر وہ رقم واپس کرتے۔" منظور حسین نے کہا۔ "یہ بات آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ ہم باقاعدگی کے ساتھ قسطیں ادا کرتے رہے ہیں۔ آپ ہمیں قصور وار کس طرح ٹھہرا سکتے ہیں؟"

"بات قصور وار ٹھہرانے کی نہیں ہے میرے عزیز، یہ خالصتاً" قانونی معاملہ ہے۔" حاجی ہدایت اللہ نے سمجھانے والے انداز میں کہا "آپ لوگوں کی بکنگ کینسل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ آپ ڈی فالٹر ثابت ہوں۔"

"ہمارے پاس تو ہر ادائیگی کی رسید موجود ہے، ہم ڈی فالٹر کیسے ثابت ہوسکتے ہیں ؟"

"رسیدوں کی اہمیت آپ کے لکھ کر دینے سے زیادہ نہیں ہے۔"

"مگر ہم یہ لکھ کر نہیں دے سکتے۔"

"آپ کو لکھ کر دینے کی ضرورت نہیں ہے بھولے بادشاہ۔" حاجی ہدایت اللہ نے مسکراتے ہوئے کہا "میں نے سب کچھ لکھوا لیا ہے۔ آپ کو تو صرف دستخط کرنا ہیں۔"

منظور حسین نے کہا۔ "یہ تو سراسر زیادتی ہے !"

"میں تو آپ کا بھلا کرنا چاہ رہا تھا۔" حاجی ہدایت اللہ نے کہا "آپ تعاون کے لئے تیار نہیں ہیں تو آپ کی مرضی ہے۔"

عبدالقیوم نے کہا "آپ نے وہ پلاٹ والے معاملے کے کاغذات تیار نہیں کروائے ؟"

"بھئی تم تو بالکل ہی سیدھے ہو۔ لگتا ہے کبھی جائداد کی خرید و فروخت سے واسطہ نہیں پڑا۔" حاجی ہدایت اللہ نے مدبرانہ انداز میں۔ کہا "میرے بھائی، طور کمپلیکس کی بکنگ اور سپرہائی وے والے پلاٹ دو مختلف معاملات ہیں۔ پہلے فلیٹوں کی بکنگ کینسل ہوگی۔ آپ مجھے رقم کی وصولی کی رسید دیں گے پھر اس رقم سے آپ سپر ہائی وے والے پلاٹ خریدیں گے۔ کچھ آئی سمجھ میں بات ؟"

منظور حسین بولا۔ "آپ ہماری بکنگ کینسل کر رہے ہیں۔ رقم کی ادائیگی کی رسید پر ہم سے دستخط ..... لے رہے ہیں مگر وہ رقم کہاں ہے۔ ہمیں تو آپ ایک پیسہ بھی نہیں دے رہے؟"

"یہ سب باہمی اعتماد کا کھیل ہے میرے عزیز۔" حاجی ہدایت اللہ نے وضاحت کی "اگر میری جیب میں رقم رکھی ہوتی تو یہ پلاٹوں کا کھٹ راگ پھیلانے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ میں آپ کو یونہی رقم ادا کردیتا اور قصہ ختم ہو جاتا۔ اگر آپ مجھ پر بھروسا کرسکتے ہیں تو ان کاغذات پر دستخط کردیں۔ چند روز بعد انشاء اللہ پلاٹوں کی آپ کے نام منتقلی کے کاغذات میں تیار کروا لوں گا اور پلاٹ آپ کے ہو جائیں گے۔ اگر مجھ پر اعتبار نہیں ہے تو اللہ اللہ کریں اور ہاؤس بلڈنگ فنانس کارپوریشن والوں کے حق میں دعا کریں۔"

"ٹھیک ہے، ہم آپ کو مشورہ کرکے جواب دیں گے۔" عبدالقیوم نے کہا۔

"جو بھی کرنا ہے، جلدی کرلیں۔" حاجی ہدایت اللہ نے بے رخی سے کہا "مجھے اور بھی بہت سے کام ہوتے ہیں۔ میں آپ کو ایک دن کی مہلت دیتا ہوں۔ آپس میں فائنل کرکے آپ مجھے کل بتا دیں۔"

دوسرے روز وہ حاجی بلڈرز کے دفتر پہنچے اور حاجی ہدایت اللہ کو اپنے فیصلے سے آگاہ کیا۔ عبدالقیوم نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔

"حاجی صاحب' آپ نے فرمایا تھا کہ یہ اعتماد کا کھیل ہے۔ ہم آپ کی بات پر ایمان لے آئے۔ ہم آپ پر اعتماد کرنے کو تیار ہیں۔ آپ بھی ہم پر اعتماد کرنے کا وعدہ کریں۔"

حاجی ہدایت اللہ نے کچھ نہ سمجھنے والے انداز میں کہا "کیا مطلب ہے آپ کا؟"

"میں وضاحت کرتا ہوں۔" عبدالقیوم نے کہا "ہم آپ پر اعتماد کرتے ہوئے بکنگ کینسل کے کاغذات پر دستخط کر دیتے ہیں۔ آپ ہم پر اعتماد کرتے ہوئے رقم کی وصولی پر دستخط نہ لیں۔ بلکہ ان دونوں معاملات کو ایک دوسرے کے ساتھ منسلک کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ اس کے بدلے آپ پکے کاغذ پر کسی اوتھ کمشنر کے سامنے ہم دونوں کو الگ الگ سڑسٹھ ہزار روپے کی ایک رسید دیں گے۔ اس رقم کے بارے میں تحریر میں درج ہوگا کہ آپ یہ رقم ہم سے مذکورہ پلاٹ کی فروخت کے سلسلے میں پیشگی لے رہے ہیں۔ اسٹامپ پیپرز کی تحریر میں یہ بات بھی خاص طور پر شامل ہوگی کہ آپ ایک ماہ کے اندر اندر ہمیں ان پلاٹوں کا قبضہ دینے کے پابند ہوں گے۔"

"یہ کیا بے ہودگی ہے؟" حاجی ہدایت اللہ پوری بات سننے کے بعد ناچ اٹھا "آپ مجھے بلیک میل کرنا چاہتے ہیں۔"

"بخدا ہمارا ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے۔" منظور حسین نے پرسکون لہجے میں کہا "ہم تو باہمی اعتماد کا عملی مظاہرہ کرنا چاہتے ہیں۔"

حاجی ہدایت اللہ بہت کائیاں شخص تھا۔ اس نے باقی تمام الاٹیز کو خدا جانے کیا کیا راگ سنا رکھے تھے۔ اس کے پاس واردات کے بیسیوں طریقے ہوں گے۔ میرے علم میں بس وہی جوڑ توڑ آیا تھا جو اس نے منظور حسین اور عبدالقیوم کے ساتھ کیا تھا۔ حاجی ہدایت اللہ کو اندازہ ہوگیا تھا کہ ان سالا بہنوئی کے معاملے میں گھی سیدھی انگلی سے نہیں نکلے گا۔ اس نے چہرے پر خفگی کے تاثرات سجاتے ہوئے بے مروت

لہجے میں کہا۔

"اب تو آپ لوگوں کا اللہ ہی حافظ ہے۔ آپ نے میرے خلوص کی قدر نہیں کی۔"

واپسی میں منظور حسین نے بہنوئی کو مشورہ دیا کہ انہیں یہ رسک لے ہی لینا چاہیے" اس کے سوا اور کوئی راستہ بھی تو نہیں ہے ہمارے پاس۔" منظور حسین نے کہا۔

"ہاں' فی الحال تو کوئی راستہ نظر نہیں آرہا۔" عبدالقیوم نے جواباً کہا "لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ ہمیشہ کے لئے راستے بند ہوگئے ہوں۔"

"تم کیا کہنا چاہتے ہو؟"

عبدالقیوم نے کہا "بھائی صاحب' میرا تو مشورہ ہے کہ خاموشی سے بیٹھ کر انتظار کرتے ہیں۔ ہوسکتا ہے' ہاؤس بلڈنگ والوں کے دل میں رحم آجائے۔"

"بات تو آپ کی بھی دل کو لگتی ہے۔" منظور حسین نے کچھ سوچتے ہوئے کہا "ہم اس پوزیشن میں بھی نہیں ہیں کہ اپنے طور پر ہی کچھ کر سکیں۔"

پندرہ روز بعد منظور حسین نے اپنے بہنوئی کو اطلاع دی کہ حاجی ہدایت اللہ نے ان دونوں کو کسی ضروری بات کرنے کے لئے اپنے دفتر بلایا ہے۔ دوسرے روز وہ شام کے وقت حاجی بلڈرز کے دفتر میں حاجی ہدایت اللہ کے سامنے بیٹھے تھے۔

حاجی ہدایت اللہ نے چھوٹتے ہی کہا "بھئی مبارک ہو' آپ دونوں کا مسئلہ تو حل ہوگیا۔"

"قرضہ منظور ہوگیا کیا؟" منظور حسین نے کہا۔

حاجی ہدایت اللہ نے پرجوش انداز میں کہا "قرضے کو گولی ماریں جناب۔ میں آپ کے لئے متبادل فلیٹ کا انتظام کرلیا ہے۔"

"متبادل فلیٹ؟" عبدالقیوم نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا "یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟"

حاجی ہدایت اللہ نے وضاحت کرتے ہوئے بتایا "ادھر ناگن چورنگی پر بھی میرا ایک پروجیکٹ تکمیل کے آخری مراحل طے کر رہا ہے۔ بس بجلی' گیس اور ٹیلی فون

کے کنکشن وغیرہ کا مسئلہ باقی ہے۔ فنشنگ کا دیگر کام مکمل ہوچکا ہے۔ اکا دکا لوگوں نے رہائش اختیار کرنا شروع بھی کردی ہے۔ جو چھوٹے موٹے کام رہ گئے ہیں، ایک آدھ ماہ میں مکمل ہو جائیں گے۔ اگر آپ راضی ہوں تو میں وہاں آپ لوگوں کو فلیٹ دے سکتا ہوں۔ ویسے تو تمام فلیٹ بک ہیں مگر پچھلے دنوں دو تین فلیٹوں کی بکنگ کینسل ہوئی ہے۔ الاٹیز نے اپنی کچھ ذاتی مجبوریوں کے تحت چند ادائیگیاں نہیں کی تھیں۔ اس لئے انہیں فلیٹوں سے دست بردار ہونا پڑا۔"

"آپ کے اس پروجیکٹ کا نام کیا ہے؟" منظور حسین نے پوچھا۔

"طور اسکوائر۔" حاجی ہدایت اللہ نے جواب دیا۔

عبدالقیوم نے کہا "نام تو سنا ہوا لگتا ہے۔ پچھلے دنوں کافی اشتہارات آرہے تھے مگر ہے شہر سے بہت دور۔"

"ارے صاحب، کیا بات کرتے ہیں آپ۔ دو چار سال بعد دیکھئے گا، ناگن چورنگی شہر کا دل بن جائے گی۔ نوٹوں سے ناپ کر زمین ملے گی وہاں۔"

منظور حسین نے آمادہ نظروں سے عبدالقیوم کی جانب دیکھا۔ اب ان فلیٹوں کے سلسلے میں اتنی خواری ہوچکی تھی کہ بادل ناخواستہ عبدالقیوم بھی حاجی ہدایت اللہ کی تجویز سے متفق ہوگیا۔ دونوں کو رضا مند پاکر حاجی ہدایت اللہ نے کہا۔

"میں ایک بات کی وضاحت پہلے ہی کردینا چاہتا ہوں۔ طور اسکوائر کے بلاک ڈی میں سی کیٹگری کے دو فلیٹ خالی ہیں۔ جبکہ بلاک اے میں بی کیٹگری کا صرف ایک فلیٹ باقی ہے۔ جس کی اضافی خصوصیت یہ ہے کہ وہ ویسٹ اوپن بھی ہے۔" ایک لمحے کے توقف کے بعد اس نے بتایا "مگر آپ کو پہلے فیصلہ کرنا ہوگا کہ آیا آپ بلاک ڈی والے دو فلیٹ لینا پسند کریں گے یا بلاک اے والا بڑا فلیٹ؟"

"ظاہر ہے، ہمیں دو فلیٹ ہی چاہیں گے۔" عبدالقیوم نے جلدی سے کہا "ہماری بکنگ دو فلیٹ کی ہی تھی۔"

"اس صورت میں آپ کو کچھ اضافی رقم ادا کرنا پڑے گی۔"

"جی!" بیک وقت دونوں کے منہ سے نکلا اور وہ بھونچکا ہوکر حاجی ہدایت اللہ کا منہ تکنے لگے۔

حاجی ہدایت اللہ نے کہا "پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے میرے دوست۔ بات دراصل یہ ہے کہ طور اسکوائر میں سی کیٹیگری فلیٹ کی قیمت اس وقت ایک لاکھ پانچ ہزار روپے ہے۔ اس کے علاوہ منظور شدہ ایک لاکھ کا قرضہ ہے۔ یعنی کل قیمت دو لاکھ پانچ ہزار روپے ہے۔ قیمت زیادہ اس لئے بھی ہے کہ وہ فلیٹ سیکنڈ فلور پر واقع ہیں اور خوش قسمتی سے ان میں سے ایک کارنر فلیٹ ہے۔ ویسے ویسٹ اوپن تو دونوں ہی ہیں۔"

منظور حسین نے پوچھا "اس صورت میں ہمیں اور کتنے پیسے دینا ہوں گے؟"

"بھائی سیدھا سیدھا حساب ہے" حاجی ہدایت اللہ نے کہا "اللہ آپ کا بھلا کرے، آپ طور کمپلیکس کے ایک فلیٹ کے لئے ہمارے پاس سڑسٹھ ہزار روپے جمع کراچکے ہیں۔ طور اسکوائر کا فلیٹ ایک لاکھ پانچ ہزار روپے کا ہے۔ یعنی اڑتیس ہزار روپے آپ کو مزید ادا کرنا ہوں گے۔"

"دونوں کو اڑتیس اڑتیس ہزار دینا ہوں گے۔"

"ظاہر ہے، فلیٹ بھی تو دونوں کو ہی چاہئیں نا۔" حاجی ہدایت اللہ نے مربیانہ لہجے میں کہا۔

عبدالقیوم نے پرخیال انداز میں خیال آرائی کی "یہ تو بہت زیادہ رقم ہے۔ اتنی تو ہم نہیں دے سکیں گے۔"

"ویسے آپ کے لئے میرا ایک مخلصانہ مشورہ ہے۔" حاجی ہدایت اللہ نے سرگوشیانہ انداز میں کہا۔

دونوں نے چونک کر سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

وہ رازدارانہ لہجے میں بولا "آپ دونوں مل کر اے بلاک والی بی کیٹگری کا فلیٹ لے لیں۔"

"صرف ایک فلیٹ؟" منظور حسین کے لہجے میں احتجاج کی آمیزش تھی۔

"جتنا گڑ ڈالیں گے، اتنا ہی میٹھا ہوگا نا صاحب۔" حاجی ہدایت اللہ نے فلسفیانہ انداز میں کہا۔

عبدالقیوم خاصا سنجیدہ نظر آرہا تھا۔ اس نے حاجی ہدایت اللہ سے سوال کیا "بی

کیٹگری کے اس فلیٹ کی کیا قیمت ہے ؟"

"صرف ایک لاکھ چالیس ہزار روپے۔"

"اور قرضہ ؟"

"ایک لاکھ بیس ہزار روپے منظور شدہ ایچ بی ایف سی۔"

عبدالقیوم نے کچھ سوچتے ہوئے کہا "یعنی فلیٹ کی کل مالیت دو لاکھ ساٹھ ہزار روپے ہوگی۔"

حاجی ہدایت اللہ نے عبدالقیوم کو مائل بہ آمادگی دیکھا تو بولا "آپ دونوں نے مجموعی طور پر ہمیں ایک لاکھ چونتیس ہزار روپے اب تک ادا کئے ہیں۔ یعنی صرف چھ ہزار روپے مزید دینا ہوں گے اور ایک لاکھ چالیس ہزار میں فلیٹ آپ کا ہو جائے گا۔"

"یہ فلیٹ کس فلور پر واقع ہے ؟"

اتفاق سے یہ بھی سیکنڈ فلور کا ہی فلیٹ ہے۔" حاجی ہدایت اللہ نے جواب دیا۔

"ویسے میں آپ کو بتا دوں کہ طور کمپلیکس کی بہ نسبت طور اسکوائر کے فلیٹ زیادہ کشادہ ہیں۔ یہ ہر لحاظ سے آپ کے لئے موزوں رہے گا۔ آئندہ چند سال میں شہر میں بسنے والے بھی نارتھ ہی کا رخ کریں گے۔ آگے آپ کی مرضی ہے۔"

عبدالقیوم نے منظور حسین سے کہا "بھائی صاحب' میں تو اپنے ذاتی گھر میں رہ رہا ہوں۔ زیادہ مسئلہ آپ کا ہے۔ آپ کرائے کے گھر کی صعوبتیں کب تک اٹھائیں گے۔ ایسا کرتے ہیں' آپ طور اُسکوائر والا فلیٹ لے لیں۔ میری خیر ہے۔"

"مگر میں اتنی بڑی مالیت کا فلیٹ کس طرح لے سکتا ہوں؟"

"اس کا بھی ایک مناسب حل موجود ہے۔" حاجی ہدایت اللہ نے کہا "عبدالقیوم کی جانب سے ایک الفی ڈیوٹ تیار کروا لیتے ہیں۔ جس میں وہ طور کمپلیکس والے فلیٹ کی بکنگ کو آپ کے نام منتقل کردیں گے۔ اس طرح آپ دو فلیٹ کے الاٹی ہو جائیں گے۔ بعد ازاں آپ کے دونوں فلیٹوں کی بکنگ کینسل کر دیں گے اور آپ کو طور اسکوائر والے فلیٹ کا قبضہ دے دیا جائے گا۔"

"اور طور کمپلیکس کی بکنگ کینسل کرنے کے لئے مجھے ڈی فالٹر ثابت کیا جائے

گا؟" منظور حسین نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔

"اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں ہے۔" حاجی ہدایت اللہ نے کہا "اگر میں بغیر کسی وجہ کے الاٹیز کی جمع شدہ رقمیں واپس کرنے لگا تو میرے دفتر کے سامنے ایک میلا سا لگ جائے گا۔ پھر شاید اس جم غفیر سے جان چھڑانے کے لئے مجھے کسی بینک کے پاس خود کو گروی رکھنا پڑے گا۔"

"اور اگر بعد میں کوئی گڑ بڑ ہوگئی تو ؟" عبدالقیوم نے ممکنہ خدشے کی جانب اشارہ کیا۔

حاجی ہدایت اللہ نے کہا "میں آپ کے اطمینان کے لیے یہ کرسکتا ہوں کہ تمام قسم کی دستاویزات ایک ساتھ تیار کروا لیتا ہوں اور ایک ہی نشست میں تمام قانونی اور دفتری کارروائی نمٹا لیتے ہیں۔ ادھر آپ نے ایک لاکھ چونتیس ہزار روپے کی وصولی کے کاغذات پر دستخط کیے' ادھر میں طور اسکوائر والا بی کیٹگری فلیٹ آپ کو الاٹ کردوں گا لیکن اس کے لئے آپ کو مزید چھ ہزار روپے ادا کرنا ہوں گے ..... اور اس سے بھی پہلے عبدالقیوم صاحب اپنے فلیٹ کی بکنگ آپ کے نام ٹرانسفر کریں گے۔"

"ہاں' ایسے ہو جائے تو ٹھیک ہے۔" منظور حسین نے مطمئن انداز میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ پھر عبدالقیوم کی طرف دیکھ کر بولا "بھائی قیوم' چھ ہزار کا انتظام بھی آپ ہی کو کرنا ہوگا ..... اور میں آپ کے یہ تہتر ہزار روپے کیسے ادا کروں گا!" اس کی آنکھوں میں ایک مرتبہ پھر الجھن کے سائے لہرانے لگے تھے۔

منظور حسین کی بہ نسبت عبدالقیوم معاشی طور پر زیادہ خوش حال تھا۔ اس نے تسلی آمیز لہجے میں کہا "کوئی بات نہیں' میں ہی حاجی صاحب کو چھ ہزار روپے ادا کردوں گا اور جہاں تک ان تہتر ہزار روپے کا تعلق ہے تو وہ ہماری گھر کی بات ہے۔ آپ جتنا کرایہ سعید منزل والے گھر کا دیتے ہیں وہی ماہانہ قسط کے طور پر مجھے دیتے رہیں۔ انشاء اللہ ایک نہ ایک دن یہ قرض بھی ختم ہو ہی جائے گا۔"

"خدا سب کو ایسے بہنوئی دے۔" حاجی ہدایت اللہ نے عبدالقیوم کے ایثار کی تعریف کرتے ہوئے کہا۔

پھر سب کچھ طے شدہ پروگرام کے تحت انجام پاگیا۔ وہ دونوں جاکر طور اسکوائر والا بی کیٹگری فلیٹ بھی دیکھ آئے۔ حاجی ہدایت اللہ نے ایک ماہ بعد قبضہ دینے کا وعدہ کیا تھا لیکن ایک ماہ پورا ہونے سے پہلے ہی وہ سب کچھ ہوگیا جس کے نتیجے میں وہ دونوں سالا بہنوئی اس وقت میرے سامنے بیٹھے تھے۔

یہ قبضہ ملنے والی تاریخ سے چند روز پہلے کا ذکر ہے۔ منظور حسین مع اہل و عیال نیو کراچی میں اپنے کسی رشتے دار سے ملنے گیا ہوا تھا۔ واپسی میں بچوں نے ضد کی کہ وہ اپنا فلیٹ دیکھتے ہوئے جائیں گے۔ منظور حسین بیوی بچوں کی ضد سے مجبور ہوکر طور اسکوائر کے بلاک اے میں اپنے فلیٹ پر پہنچ گیا۔ پھر جیسے اس کے پاؤں تلے سے زمین کھسک گئی۔ اسے اپنے اردگرد کی ہر چیز گھومتی ہوئی نظر آرہی تھی۔

مطلوبہ فلیٹ میں ایک پٹھان فیملی آباد تھی!

○

اپنی داستان غم کے آخری مرحلے پر عبدالقیوم نے بتایا۔ ”منظور حسین نے مجھے اس واقعے کی اطلاع دی‘ دوسرے روز ہم دونوں حاجی بلڈرز کے دفتر میں پہنچ گئے۔ وہاں جاکر معلوم ہوا کہ حاجی ہدایت اللہ حج پر تشریف لے گئے ہیں۔ دفتری عملے کے ایک رکن سے معلوم ہوا کہ ان کی واپسی ایک ماہ بعد ہوگی۔“

میں نے پوچھا ”حاجی صاحب سے ملاقات پر انہوں نے کیا جواب دیا ؟“

”جواب کیا دینا تھا وکیل صاحب‘ وہ اس مغالطے پر بہت افسوس کا اظہار کر رہے تھے۔“ منظور حسین نے کہا۔

”کیسا مغالطہ ؟“

”حاجی صاحب کا خیال ہے کہ وہ مذکورہ فلیٹ کی بکنگ کے بارے میں بھول گئے تھے۔ دراصل وہ خالی فلیٹ جس کی بکنگ کینسل ہوئی تھی‘ وہ بلاک بی میں تھا۔“

”اتنا بڑا دھوکا۔“ مجھے ان دونوں پر غصہ آرہا تھا ”وہ فریبی آپ دونوں کو شروع ہی سے دھوکے پہ دھوکے دیئے چلا جا رہا ہے اور آپ انتہائی سادگی سے اس کے ہاتھوں کھلونا بنے ہوئے ہیں ؟“

”اب انہوں نے وعدہ کیا ہے کہ جلد ہی بلاک بی کے مذکورہ فلیٹ کا قبضہ دے دیں گے۔“

”جیسے پہلے وعدہ کیا تھا ؟“ میں نے طنزیہ لہجے میں کہا ”اگر آپ اسی طرح بے وقوف بنتے رہے تو قیامت تک ایک پائی وصول نہیں کرسکیں گے۔“

عبدالقیوم نے کہا ”اسی لیے تو ہم آپ کے پاس آئے ہیں۔“

”اب آپ ہمیں اپنی فیس بتائیں۔“ منظور حسین نے بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا ”اور یہ بھی صاف صاف بتا دیں کہ آپ ہمارے لیے کیا کرسکتے ہیں۔“

”کر تو میں بہت کچھ سکتا ہوں۔“ میں نے پرخیال انداز میں کہا۔ ”مگر اس کے لئے مجھے آپ کے بھرپور تعاون کی ضرورت ہوگی۔“

”ہم ہر طرح کے تعاون کے لئے تیار ہیں۔“ انہوں نے بیک وقت مجھے یقین دلایا۔

میں نے انہیں اپنی فیس بتائی۔ منظور حسین نے فوراً وہ رقم ادا کر دی۔ میں نے وکالت نامے پر ضروری اندراج کرکے منظور حسین کے دستخط کروا لیے۔ میرا موکل منظور حسین ہی تھا..... کیونکہ کیس کی نوعیت کے اعتبار سے وہی مدعی ہوسکتا تھا۔ اس کارروائی کے بعد میں نے کہا۔

”حاجی ہدایت اللہ جیسے فراڈ بلڈرز سے نمٹنا مجھے بخوبی آتا ہے۔ میں نے آپ کی فائل کا تفصیلی معائنہ کرلیا ہے۔ تمام کاغذات مکمل ہیں۔ ان کی بنیاد پر ہمارا کیس خاصا مضبوط ہے۔ مجھے امید ہے کہ ہم عدالت میں جانے کی زحمت سے بھی بچ جائیں گے۔ ممکن ہے اسی دفتر میں مک مکا ہو جائے۔“

”کیا ایسا..... ممکن ہے ؟“ منظور حسین حیرت کے سمندر میں غوطہ زن تھا۔

”میں نے کہا ”جو لوگ بیک وقت کئی لوگوں سے فراڈ کرتے ہیں وہ کورٹ کچہری میں جانے سے ذرا گھبراتے ہیں کیونکہ اس طرح ان کا پول کھل جاتا ہے اور وہ سارے لوگ جن کی وہ رقمیں کھائے بیٹھے ہوتے ہیں‘ وہ ان فراڈ لوگوں کی جان کو آجاتے ہیں۔ ایسے دھوکے باز لوگ اس اصول پر کاروبار کرتے ہیں کہ اپنے سے کمزور کو ہڑپ کر جاؤ اور خود سے زیادہ طاقتور کے سامنے جھک جاؤ۔ فی زمانہ یہی ان کی

کامیابی کا راز ہے۔ مجھے یقین ہے کہ حاجی ہدایت اللہ بھی آپ سے صلح صفائی کی کوشش کرے گا۔ کورٹ میں جانا وہ افورڈ نہیں کرسکے گا۔"

"مگر اب ہم نے فیصلہ کرلیا ہے کہ فلیٹ وغیرہ کے جھانسے میں نہیں آئیں گے۔" عبدالقیوم نے کہا "ہمیں ہماری رقم چاہیے۔"

"ایسا ہی ہوگا۔ انشاء اللہ۔"

منظور حسین نے شکرگزار نظروں سے مجھے دیکھا، میں نے کہا "میں ایک دو روز میں حاجی ہدایت اللہ کو نوٹس بھیج دوں گا۔ آپ حضرات پندرہ بیس روز بعد میرے پاس آئیں اور ہاں، اس دوران میں اگر حاجی براہ راست آپ میں سے کسی سے بھی رابطہ کرے تو اس کے ساتھ کسی قسم کا معاملہ نہ کیا جائے۔ یہ بہت ضروری ہے۔"

"ایسا ہی ہوگا بیگ صاحب!" عبدالقیوم نے پریقین لہجے میں کہا۔

پھر وہ دونوں مجھے سلام کرکے وہاں سے رخصت ہوگئے۔ میں روزمرہ کے کاموں میں مشغول ہوگیا۔

دو روز بعد میں نے حاجی ہدایت اللہ کے نام حاجی بلڈرز واقع بندر روڈ کے ایڈریس پر ایک لیگل نوٹس بہ ذریعہ رجسٹری بھجوا دیا۔ اس نوٹس کا مضمون کچھ یوں تھا۔

"میرے موکل مسمی منظور حسین ولد عبدالغفور رہائشی سعید منزل جو کہ آپ کے پروجیکٹ طور کمپلیکس کا سابق الاٹی اور طور اسکوائر کا موجودہ الاٹی ہے، نے مجھے بتایا ہے کہ آپ نے مختلف مرحلوں پر پے در پے فراڈ کرکے اس سے ایک لاکھ چالیس ہزار روپے ہتھیا لئے ہیں جن کی تفصیل کچھ یوں ہے (رقم کی ادائیگی کی مرحلہ وار تفصیل) لیکن اس کے باوجود ابھی تک اپنا وعدہ پورا نہیں کیا بلکہ مسلسل فریب دہی کو وطیرہ بنا رکھا ہے۔ آپ کا یہ فعل سراسر غیراخلاقی، غیرانسانی اور خاص طور پر غیر قانونی ہے۔ لہٰذا نوٹس ہذا کے ذریعے آپ کو متنبہ کیا جاتا ہے۔ کہ عرصہ پندرہ یوم کے اندر میرے موکل کی رقم واپس کردیں۔ بصورت دیگر آپ کے خلاف قانونی چارہ جوئی کی جائے گی۔"

نوٹس میں کچھ اور باتیں بھی تھیں جو خالصتاً قانونی نوعیت کی تھیں اس لیے

یہاں ان کا ذکر ضروری نہیں ہے۔

نوٹس کی ترسیل کے پانچویں روز ایک باریش شخص میرے دفتر میں داخل ہوا۔ اس کی عمر پچپن اور ساٹھ کے درمیان رہی ہوگی۔ وہ اپنی وضع قطع سے انتہائی معزز اور دین دار نظر آتا تھا۔ اس نے سفید رنگ کا بے داغ شلوار کرتہ پہن رکھا تھا، سر پر دو پلی ٹوپی تھی، ہاتھ میں جگمگاتے دانوں والی تسبیح اور پاؤں میں سادہ سی لیکن قیمتی چپل تھی۔ وہ پہلی نظر میں کوئی اللہ والا نیک بندہ دکھائی دیتا تھا مگر اس وقت اس کے چہرے پر برہمی کے آثار پائے جاتے تھے۔ اس کے ہاتھوں میں سیم سونائٹ کا بریف کیس تھا۔

میں نے پیشہ ورانہ مسکراہٹ سے اس کا استقبال کیا۔ وہ نہایت ہی غصیلے انداز میں ایک کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا تو میں نے کہا "جی فرمائیے، میں آپ کی کیا خدمت کرسکتا ہوں؟"

"خدمت تو آپ کی میں کرنے آیا ہوں۔" وہ تپتے ہوئے نرم لہجے میں گویا ہوا "آر یو مرزا امجد بیگ ایڈووکیٹ؟"

مجھے اس کا طرز تخاطب انتہائی ناگوار گزرا تاہم میں نے اپنی ناگواری کو ظاہر کرنے کے بجائے جواباً انگریزی میں ہی جواب دیا "یس، آئی ایم!"

اس نے میز پر رکھے ہوئے بریف کیس کو کھولا پھر ایک سفید لفافہ اس میں سے برآمد کرکے میرے سامنے پھینکتے ہوئے پوچھا "یہ نوٹس آپ ہی نے مجھے بھیجا ہے؟"

میں سمجھ گیا، وہ ذات شریف حاجی ہدایت اللہ کے سوا اور کوئی نہیں تھی۔ میں نے لفافے پر سرسری سی نظر ڈالنے کے بعد کہا "ہاں، یہ نوٹس میں نے ہی آپ کو بھیجا ہے۔"

وہ مجھے گھورتے ہوئے بولا "مسٹر بیگ، میں ایسی دھمکیوں کو خاطر میں نہیں لاتا ہوں۔"

"بجا فرمایا آپ نے۔" میں نے اس کی برافروختگی سے لطف اندوز ہوتے ہوئے کہا "ایسی دھمکیوں میں وہ لوگ آتے ہیں جو بزدل ہوتے ہیں۔ آپ تو ماشاء اللہ خاصے مضبوط اور طاقتور نظر آتے ہیں۔"

وہ میرے طنز سے متاثر ہوئے بغیر بولا ”آخر اس نوٹس کا مقصد کیا ہے ؟“

”مقصد نہایت ہی آسان الفاظ میں اسی نوٹس کے اندر بیان کیا گیا ہے۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

”گویا آپ مجھے یہ باور کرانا چاہتے ہیں کہ یہ نوٹس عدالتی کارروائی کا ابتدائیہ ہے ؟“

میں نے کہا ”آپ چاہیں تو میرے موکل کے ساتھ تصفیہ کرلیں۔ عدالتی کارروائی کی ضرورت ہی نہیں پڑے گی۔“

”وھاٹ اے نان سینس یو آر۔“ اس نے چیخ کر کہا۔ ”مسٹر کونسلر‘ تمہارا مطلب ہے کہ میں تمہارے کسی نامعلوم موکل کا بے جا مطالبہ پورا کردوں ؟“

میں نے ضبط کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا ”میرا موکل نہ تو کوئی نامعلوم شخص ہے اور نہ ہی اس کا مطالبہ بے جا ہے۔ اس کے پاس اس مطالبے کے تمام قانونی ثبوت موجود ہیں۔ ایک لاکھ چالیس ہزار روپے آپ کی طرف نکلتے ہیں۔ آپ یہاں ادا کردیں یا عدالت میں جاکر‘ یہ آپ کی مرضی پر منحصر ہے۔“

”ایک لاکھ چالیس ہزار ! مائی شو۔“ اس نے میز پر مکا مارتے ہوئے کہا ”یہ غریب لوگ جب مانگنے پر آتے ہیں تو منہ پھاڑ کر مانگتے ہیں۔“

میں نے اس کے تبصرے کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ ”ماشاء اللہ‘ حاجی صاحب‘ آپ کی انگلش بہت اچھی ہے۔“

وہ سمجھا‘ شاید میں اس سے متاثر ہوگیا ہوں۔ پر غرور انداز میں بولا ”میری فارسی بھی بہت اچھی ہے۔“

میں نے چوٹ کی ”پھر تو آپ کو اس شعر کا مفہوم بھی بخوبی معلوم ہوگا۔“

پھر میں نے ترنم سے یہ شعر پڑھا۔

در جوانی توبہ کردن شیوہ پیغمبر ایست
وقت پیری گرگ ظالم می شود پرہیز گار

وہ سنبھل کر بیٹھ گیا۔ اسے احساس ہوگیا تھا کہ میں اسے بہت دور تک جانتا ہوں۔ میں نے شروع ہی میں اندازہ لگا لیا تھا کہ اس کا سارا رعب داب اور غصہ مجھے

متاثر کرنے کے لئے تھا اسی لئے میں نے اس کے غیر مہذب جملوں کے جواب میں بھی شائستگی کا دامن تھامے رکھا تھا۔ میں نے اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کہا۔

”حاجی صاحب! غصے میں آپ اپنا نقصان کرلیں گے۔ میرے موکل کا کیس بہت مضبوط ہے۔ اگر یہ کیس داخل عدالت ہوگیا تو آپ کے لئے جان چھڑانا مشکل ہوجائے گی۔“ پھر میں نے ایک لمحے کے توقف سے اس کی ریڑھ کی ہڈی پر ضرب لگائی ”ابھی تک تو یہ ایک الاٹی کا معاملہ ہے۔ اگر طور کمپلیکس کے تمام الاٹیز نے آپ کو عدالت میں گھسیٹ لیا تو خود سوچیں‘ کیا میدان حشر برپا ہوگا۔“

اس کی آنکھوں میں تفکر کی پرچھائیں لہرائی۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ بولتا‘ میں نے اگلا وار کردیا ”آپ چاہیں تو میں اس معاملے کو یہیں دبا دیتا ہوں۔“

حاجی ہدایت اللہ اچھی طرح جانتا تھا کہ اس کیس میں اس کی پوزیشن بہت کمزور تھی۔ اگر ایک مرتبہ مقدمہ عدالت میں لگ جاتا تو اس کی گت بن جاتی۔ میں نے محسوس کیا کہ اس کا سارا کرد فر غائب ہوچکا تھا۔ پریشانی میں وہ اپنی انگریزی دانی بھی بھول بیٹھا تھا۔ اس نے مصالحت آمیز لہجے میں کہا۔

”آپ اس سلسلے میں کیا کرسکتے ہیں ؟“

میں نے کہا ”سیدھی سی بات ہے۔ آپ اس کی رقم واپس کردیں‘ وہ قانونی کارروائی سے باز آجائے گا۔“

”مگر میں فوری طور پر اتنی رقم کا بندوبست نہیں کرسکتا۔“

میں نے چالاکی سے کہا ”آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ آج کل واقعی اتنے پیسوں کا انتظام کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ میں آپ کی خاطر اپنے موکل کو کچھ دنوں کے لئے ٹالنے کی کوشش کرتا ہوں۔ آپ مجھے بتا دیں‘ کتنے دنوں تک رقم کا بندوبست کرلیں گے ؟“

وہ سمجھا‘ میں اس کی باتوں میں آگیا ہوں۔ میں نے بھی اسے خوش فہمی سے نکالنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ پرامید لہجے میں بولا۔ ”رقم کا بندوبست کرنے میں کچھ دن تو لگیں گے ہی مگر میں چاہتا ہوں کہ منظور حسین سے کچھ **بارگیننگ** بھی کی جائے۔“

"آپ کا خیال خاصا معقول ہے۔" میں نے اس کے دلی جذبات کی ترجمانی کرتے ہوئے کہا "میں اس سلسلے میں اپنے موکل کو ہموار کرنے کی کوشش بھی کروں گا۔"

"آپ کے خیال میں وہ جوڑ توڑ کے لئے آمادہ ہو جائے گا؟"

"چہ نسبت خاک را با عالم پاک۔"

وہ کھسیانی ہنسی ہنستے ہوئے بولا "میں انگریزی سے تائب ہوا' آپ بھی فارسی کا باب بند کریں۔ ہمیں اب دوستانہ ماحول میں قومی زبان میں بات کرنا چاہیے۔" پھر اس نے ایک آنکھ دبا کر راز دارانہ انداز میں کہا "بس یوں سمجھیں کہ اب آپ میرے وکیل ہیں۔ میں آپ کو منظور حسین سے دگنی فیس دوں گا۔ آپ کی قانونی صلاحیتیں میرے مفاد کے لئے استعمال ہوں گی۔"

وہ میری توقع سے زیادہ ہوشیار ثابت ہو رہا تھا۔ اس وقت وہ پوری طرح میری گرفت میں تھا۔ میں نے مسکراتے ہوئے کہا "فیس کے تکلف کی ضرورت نہیں ہے حاجی صاحب! وہ میں اپنے موکل سے وصول کرچکا ہوں۔"

"پھر بھی میں آپ کو مشورہ فیس تو ضرور دوں گا۔" اس نے اپنے پرس میں سے پانچ سو روپے کے نوٹ نکال کر میری طرف بڑھا دیئے پھر اٹھتے ہوئے بولا "اچھا' اب میں اجازت چاہوں گا۔"

میں نے وہ رقم میز کی دراز میں ڈالتے ہوئے کہا "جاتے جاتے ایک چھوٹا سا کام بھی کرتے جائیں۔"

اس نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا' میں نے وضاحت کی "دراصل ہمیں اپنی فائلوں کو بھی مکمل رکھنا پڑتا ہے۔ آپ اسے رسمی سی کارروائی سمجھ لیں۔ اس نوٹس کا مختصر سا جواب تحریر کردیں۔"

وہ چونک کر بولا "اس کی کیا ضرورت ہے؟"

"حاجی صاحب' سمجھا کریں۔ آپ تو جہاں دیدہ آدمی ہیں۔ مجھے اپنے موکل کو بھی تو مطمئن کرنا ہے۔ وہ اتنی ہی بات پر خوش ہو جائے گا کہ میرے نوٹس پر آپ پریشان ہوکر یہاں چلے آئے۔"

وہ تامل کرتے ہوئے بولا "بات تو آپ کی دل کو لگتی ہے۔ اب آپ یہ بتائیں کہ لکھوں کیا؟"

"آپ بھی خواہ مخواہ پریشان ہوگئے حاجی صاحب۔" میں نے حوصلہ بڑھانے والے انداز میں کہا "جو دل چاہے لکھ دیں۔ یہ کوئی فوج داری مقدمہ تو ہے نہیں۔ محض خانہ پری کی بات ہے بلکہ میرا تو خیال ہے کہ جو سچ ہے' وہی لکھ دیں۔ آپ نے سنا ہی ہوگا.... سانچ کو آنچ نہیں۔"

وہ گرگ باراں دیدہ آہستہ آہستہ میرے جال میں آرہا تھا۔ میں نے اس کے انداز سے محسوس کرلیا تھا کہ وہ آسانی سے قابو میں آنے والا شخص نہیں تھا۔ مجھے امید نہیں تھی کہ وہ شرافت سے میرے موکل کی رقم ادا کرے گا۔ یہ سارا انتظام اسے اعتماد میں لے کر میں محض اس لئے کر رہا تھا کہ بوقت ضرورت اسے عدالت میں گھسیٹا جاسکے۔ وہ رفتہ رفتہ میرے نادیدہ جال میں آرہا تھا۔ اس نے میرے مشوروں کی روشنی میں نوٹس کا جواب تحریر کردیا۔ اس کا خلاصہ کچھ یوں تھا۔

"جناب وکیل صاحب مرزا امجد بیگ! آپ کا نوٹس بہ نام حاجی بلڈرز بہ تاریخ پچیس جولائی موصول ہوا۔ آپ نے اپنے موکل اور میرے الاٹی منظور حسین کے حوالے سے مجھ پر جو سنگین الزامات عائد کئے ہیں وہ مبنی بر دروغ ہیں۔ اس بات میں کسی شک کی گنجائش نہیں کہ منظور حسین نے مجھے فلیٹ کے سلسلے میں ایک لاکھ چالیس ہزار روپے دیئے ہیں۔ جن کے بدلے میں اسے اس کا مطلوبہ فلیٹ الاٹ کرنے کا پابند ہوں۔ یہ ایک الاٹی اور بلڈرز کا آپس کا معاملہ ہے۔ میرا الاٹی منظور حسین ایک نہایت ہی معقول شخص ہے۔ جانے کس کے اکسانے پر وہ آپ کے پاس جا پہنچا۔ بہرحال میں اسے سمجھانے کی کوشش کروں گا .... اور ہاں' وکیل صاحب۔ میں ایسے دھمکی آمیز نوٹسوں سے خوف زدہ ہونے والا نہیں ہوں۔ والسلام' حاجی ہدایت اللہ۔"

نیچے حاجی ہدایت اللہ کے دستخط اور بریکٹ میں مالک "حاجی بلڈرز" کے الفاظ تھے۔

میں لگے ہاتھوں حاجی ہدایت اللہ کو نوٹری پبلک کے پاس لے گیا اور اس کے بیان پر تصدیق مہر لگوائی۔ وہ میرے اس فعل پر تھوڑا جز بز ہوا تو میں نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ "حاجی صاحب! یہ سب آپ کی سیفٹی کے لئے ہے۔ آپ کا یہ تصدیق

شدہ بیان سراسر آپ کی حمایت میں ہے۔"

وہ میرے جواب سے مطمئن ہوکر مجھ سے ہاتھ ملا کر چلا گیا۔

◆

میری توقع کے عین مطابق حاجی ہدایت نے رقم کی ادائیگی میں پس و پیش کا مظاہرہ شروع کردیا۔ وہ ہر ملاقات پر مجھے یہ بات سمجھانے کی کوشش کرتا کہ میں اپنے موکل کو پچاس ہزار روپے لے کر معاملہ رفع دفع کرنے پر تیار کروں۔ اس سلسلے میں اس نے مجھے دس ہزار روپے بطور "انعام" دینے کا بھی وعدہ کیا۔ اب مزید ڈھیل دینا وقت ضائع کرنے کے مترادف تھا۔ میں نے حاجی ہدایت اللہ کے علم میں لائے بغیر پوری تیاری کے ساتھ مقدمہ عدالت میں دائر کر دیا۔

عدالت نے آئندہ روز مدعا علیہ یعنی حاجی ہدایت اللہ کو عرضی دعوی کی نقل کے ساتھ سمن روانہ کردیا۔ پہلی سماعت کی تاریخ دو ہفتے بعد کی رکھی گئی تھی۔ میں نے درخواست دعوی میں مدعا علیہ کے دفتر کا ایڈریس دیا تھا اور سمن کی تعمیل کروانے والے بیلف کی مٹھی گرم کرکے خصوصی طور پر یہ ہدایت کردی تھی کہ سمن کی تعمیل شام سات بجے کے قریب کروائی جائے۔ یہ وہ وقت تھا جب دفتر میں الاٹیز کا اچھا خاصا رش ہوتا تھا۔ اس سے میرا مقصد یہ تھا کہ الاٹیز کی موجودگی میں حاجی ہدایت اللہ سمن وصول کرے۔ میں اس طرح اس پر نفسیاتی اثر ڈالنا چاہتا تھا۔ میں نے بیلف کو تاکید کی تھی کہ وہ دفتر کے ویٹنگ روم میں داخل ہوتے ہی بہ آواز بلند یہ فقرہ ادا کرے "حاجی ہدایت اللہ پر کسی نے مقدمہ کردیا ہے۔ اس کے سمن آئے ہیں۔"

میں ایک بات کا ذکر کرنا بھول گیا کہ میں نے منظور حسین کی ڈیوٹی لگا دی تھی کہ وہ طور اسکوائر کے بلاک اے میں اس کے نام سے منسوب فلیٹ میں بسنے والی پٹھان فیملی کے سربراہ گل بادشاہ کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرے۔ منظور حسین نے مجھ سے وعدہ کیا تھا۔ اور اسی روز سے اس کوشش میں لگ گیا تھا۔

پہلی پیشی پر جب میں عدالت پہنچا تو برآمدے میں حاجی ہدایت اللہ پہلے ہی موجود تھا۔ وہ ایک بینچ کے سرے پر ٹکا ہوا تھا۔ اس نے مجھے برآمدے میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا تو اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ میں اس کے قریب پہنچا تو اس نے غصہ آمیز تیز لہجے میں کہا۔

"مسٹر بیگ، آپ تو بہت بدمعاش نکلے!"

"چہ معنی دارد؟" میں نے اسے گھورتے ہوئے سخت لہجے میں کہا پھر مسکرا کر اضافہ کیا "اگر میرے مدمقابل کوئی حاجی شرافت علی ہوتا تو میں بھی شرافت کا مظاہرہ کرتا۔ بدمعاشوں سے نمٹنے کے لئے بدمعاشی کرنا ہی پڑتی ہے۔ وہ کیا کہتے ہیں .... ڈائمنڈ کٹس ڈائمنڈ!"

حاجی شرافت علی کے ذکر پر اس نے ہراساں نظروں سے میری طرف دیکھا پھر سنبھل کر بولا "وکیل صاحب! میں آپ سے تنہائی میں کچھ بات کرنا چاہتا ہوں۔ آپ تو میری توقع سے بھی زیادہ اونچے کلاکار ثابت ہو رہے ہیں۔"

"میں آپ لوگوں کی خدمت کے لئے پیدا ہوا ہوں۔" میں نے ذومعنی انداز میں کہا۔

وہ مجھے بازو سے پکڑ کر ایک کونے میں لے گیا پھر سرگوشیانہ انداز میں بولا "میں زیادہ سے زیادہ اسی ہزار روپے دینے کو تیار ہوں۔ آپ اپنے موکل سے کہیں وہ مقدمے بازی سے باز آجائے۔"

"اس سلسلے میں منظور حسین سے میری کئی بار بات ہوچکی ہے۔" میں نے بظاہر اس سے ہمدردی جتاتے ہوئے کہا "میں ایک کوشش اور کرکے دیکھ لوں گا۔ ویسے میرے خیال میں یہ رقم بھی بہت کم ہے۔ وہ راضی نہیں ہوگا۔"

"میں مزید پانچ دس ہزار کا نقصان برداشت کرنے کو تیار ہوں۔ آپ اپنے موکل کو سمجھانے کی کوشش کریں۔"

وہ اپنے نقصان کا ذکر اس انداز میں کر رہا تھا جیسے اس کے ساتھ بہت ظلم ہو رہا ہو۔ اسی پچاسی ہزار دینے پر بھی وہ محض اس لئے آمادہ ہوگیا تھا کہ ہم مقدمہ واپس لے لیں۔ اس مقدمے بازی کا چرچا ہوتا تو دیگر الاٹیز اس کا جینا حرام کردیتے۔ پتہ نہیں اس شخص نے کس کس معصوم آدمی کو کیا کیا فریب دے رکھا تھا۔

اتنی دیر میں ہمارے مقدمے کی آواز پڑگئی۔ ہم عدالت کے کمرے میں پہنچے تو تھوڑی ہی دیر میں حاجی ہدایت اللہ کا وکیل بھی آگیا۔ جب اس کے وکیل نے عدالت میں جواب دعوی دائر کر دیا تو میں نے اس کے کان میں سرگوشی کی۔

"وکیل صاحب! آپ کا موکل مصالحت کا ارادہ رکھتا ہے۔ وہ جلد از جلد اس کیس کو ختم کرنا چاہتا ہے اس لئے آپ چند روز بعد کی کوئی تاریخ لے لیں۔"

وکیل صفائی نے سوالیہ نظروں سے حاجی ہدایت اللہ کی طرف دیکھا' اس نے میری بات کی تقلید میں کہا "بیگ صاحب ٹھیک کہتے ہیں۔ ہم سمجھوتے کے بارے میں سوچ رہے ہیں۔ عدالتی بکھیڑوں سے جلدی جان چھڑا لیں۔"

وکیل صفائی نے ایک ہفتے بعد کی تاریخ لے لی۔

ابتدائی چند پیشیاں عدالت کی محض تکنیکی کارروائی کی نذر ہو گئیں۔ حاجی ہدایت اللہ کے وکیل نے جواب دعوی میں کم و بیش وہی باتیں دہرائی تھیں جو حاجی ہدایت اللہ میرے نوٹس کے جواب میں لکھ کر مجھے دے چکا تھا۔ کیس کی باقاعدہ سماعت کا آغاز ہوا تو میں نے حاجی ہدایت اللہ کو جرح کے لیے طلب کرلیا۔

وہ اس طلبی پر پریشان ہوگیا۔ نہ تو اسے اس بات کی توقع تھی اور نہ ہی وہ ذہنی طور پر سوالوں کے جواب دینے کے لئے تیار تھا۔ اس نے امداد طلب نظروں سے وکیل صفائی کی جانب دیکھا لیکن اس نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ وہ کٹہرے میں آکر کھڑا ہوا تو جج نے فرد جرم پڑھ کر سنائی۔ اس کے بعد حاجی ہدایت اللہ نے سچ بولنے کا حلف اٹھایا پھر بلا کم و کاست جواب دعوی کو اپنے بیان کی صورت میں دہرا دیا۔

میں نے جرح کا آغاز کرتے ہوئے کہا "حاجی ہدایت اللہ صاحب! آپ کا مزاج کیسا ہے؟"

"الحمد للہ۔" وہ حلق کی گہرائی سے بولا۔ میں نے پوچھا "آپ حاجی بلڈرز کے مالک ہیں؟"

اس نے اثبات میں جواب دیا۔ میں نے اگلا سوال کیا۔ "حاجی صاحب! اس شہر میں آپ کے کتنے پروجیکٹ پر کام ہو رہا ہے؟"

"دو پروجیکٹ پر۔" اس نے بتایا "اللہ کے فضل و کرم سے طور اسکوائر تو تیار ہوچکا ہے اور طور کمپلیکس بھی تعمیر کے آخری مراحل میں ہے۔"

"حاجی صاحب! آپ حاجی بلڈرز کے اکیلے مالک ہیں یا کوئی دوسرا شخص یا اشخاص بھی آپ کے پارٹنرز ہیں؟"

وکیل صفائی نے فوراً" حق فیس ادا کرتے ہوئے کہا۔ "جناب عالی! اس قسم کے بے سروپا سوالات سے وکیل استغاثہ کیا ثابت کرنا چاہتے ہیں؟"

میں نے کہا "میرے فاضل دوست' ابھی تو سلسلہ سوالات کا آغاز ہوا ہے۔ جلد ہی سر اور پاؤں بھی نظر آنے لگیں گے۔" پھر میں نے جج کی جانب مڑتے ہوئے استدعا کی۔ "یور آنر' وکیل صفائی کو عدالتی کارروائی میں مداخلت سے باز رکھا جائے۔"

جج نے وکیل مخالف کے اعتراض کو مسترد کرتے ہوئے مجھے جرح جاری رکھنے کا اشارہ کیا۔

"حاجی صاحب! میں نے آپ سے کچھ دریافت کیا تھا؟"

اس نے چند لمحوں کے تذبذب کے بعد جواب دیا "میں اکیلا ہی حاجی بلڈرز کا مالک ہوں۔"

"حاجی صاحب! کیا یہ غلط ہے کہ سال بھر پہلے حاجی بلڈرز میں کوئی حاجی شرافت علی صاحب آپ کے شراکت دار ہوا کرتے تھے؟"

"یہ ماضی کا قصہ ہے۔" اس نے مختصر جواب پر اکتفا کیا۔

"میں نے سنا ہے' آپ دونوں حاجی صاحبان کے درمیان کسی بات پر جھگڑا ہوگیا تھا اور حاجی شرافت علی نے آپ کو عدالت میں کھینچ لیا تھا؟"

"سنی سنائی باتوں پر ایمان لانا مسلمان کو زیب نہیں دیتا۔" حاجی ہدایت اللہ نے مبلغانہ لہجہ اختیار کرتے ہوئے کہا۔

میں نے ٹھوس انداز میں کہا "میرے پاس اس کا ثبوت بھی ہے۔ آپ معزز عدالت کو بتانا پسند کریں گے کہ مذکورہ مقدمے کی سماعت کس عدالت میں ہوئی تھی؟"

"آبجیکشن یور آنر۔" وکیل صفائی نے اپنی جگہ سے اٹھ کر کہا "اگر ماضی میں میرے موکل کا اپنے کسی شراکت دار سے مقدمے بازی کا معاملہ رہا ہے تو اس سے

موجودہ کیس پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔“

”بڑا گہرا اثر پڑتا ہے مائی ڈیئر کونسلر۔“

وہ تیز آواز میں بولا ”آپ گڑے مردے اکھاڑ کر کیا ثابت کرنا چاہتے ہیں ؟“

”مردوں کو اکھڑ تو جانے دو میرے بھائی۔“ میں نے خفیف مسکراہٹ ہونٹوں پر سجاتے ہوئے کہا ”سب کچھ خود ہی ثابت ہو جائے گا۔“

”آرڈر پلیز!“ جج نے ہمیں آپس میں الجھنے سے باز رہنے کی تلقین کی پھر مجھ سے کہا ”بیگ صاحب! آپ جرح جاری رکھیں۔“

میں نے پوچھا ”حاجی صاحب ' ابھی آپ نے میرے ایک سوال کے جواب میں ”یہ ماضی کا قصہ ہے“ کہہ کر اس کے بات کی تصدیق کی ہے کہ واقعی حاجی شرافت علی آپ کے بزنس پارٹنر رہ چکے ہیں ؟“

”تو پھر؟“

”حاجی صاحب !“ میں نے جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا ”ایک کاروباری آدمی کی حیثیت سے آپ یہ بات اچھی طرح جانتے ہوں گے کہ جب کسی سے پارٹنر شپ کی جاتی ہے تو مذکورہ کاروبار پارٹنر شپ بزنس کہلاتا ہے۔“ ایک لمحے کو توقف کر کے میں نے اضافہ کیا ”بھلا آپ جیسے انگلش ایکسپرٹ کو میں کیا بتا سکتا ہوں۔ خیر، جب کسی پارٹنر شپ بزنس کا آغاز کیا جاتا ہے یا پارٹنر شپ بزنس کو ختم کیا جاتا ہے تو اس کے لئے باقاعدہ لیگل ڈاکومنٹس تیار کیے جاتے ہیں۔ کیا آپ نے حاجی شرافت علی کے ساتھ شراکت داری کرتے وقت یا اس سے علیحدگی اختیار کرتے وقت ایسی قانونی دستاویزات تیار کی تھیں ؟“

حاجی ہدایت اللہ نے عجیب سا جواب دیا ”ایک مسلمان کو دوسرے مسلمان کی زبان پر یقین کرنا چاہئے۔ ہم اللہ والے بندے ہیں۔ اس کاغذی کارروائی کی ہماری نظر میں کوئی اہمیت نہیں ہے۔“

”آپ جس اللہ کے بندے ہیں، اس کی نازل کردہ کتاب مبارک میں ہے کہ جب بھی آپس میں لین دین کرو تو اس کو لکھ لیا کرو۔“ اس نے پریشان نظروں سے اپنے وکیل کو دیکھا، میں نے جرح جاری رکھتے ہوئے کہا ”آپ بلڈرز ہیں۔ درجنوں

بلکہ سینکڑوں فلیٹ تعمیر کرواتے ہیں اور قسطوں پر انہیں بیچتے ہیں۔ یہ شیطان کی آنت کے مانند اتنا طویل اور پیچیدہ حساب کتاب ہے کہ قدم قدم پر، چھوٹی سے چھوٹی رقم کا بھی کاغذی ریکارڈ رکھنا پڑتا ہے۔ اگر کاغذی کارروائی کی آپ جیسے روشن ضمیر شخص کی نظر میں کوئی اہمیت نہیں ہے تو مجھے حیرت ہے !“

وکیل صفائی فوراً اس کی مدد کو دوڑا ”مجھے سخت اعتراض ہے جناب عالی۔ وکیل استغاثہ حد سے تجاوز کر رہے ہیں۔“

”حد کا تعین بھی آپ ہی کر دیں میرے فاضل دوست۔“ میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

وہ جج کی جانب روئے سخن موڑتے ہوئے بولا ”یور آنر' وکیل مخالف غیر ضروری اور غیر متعلق باتوں میں الجھ کر معزز عدالت کا قیمتی وقت برباد کر رہے ہیں۔ میں نے سنا ہے، موصوف کسی مقامی ڈائجسٹ میں کہانیاں بھی لکھتے ہیں مگر یہ عدالت کا کمرا ہے۔ یہاں ایسی افسانہ طرازیوں کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ عدالت کا ایک ایک لمحہ بہت قیمتی ہے۔ وہ تو اپنے زور بازو اور الفاظ کی جادوگری میں اپنے موکل کو بھی بھول گئے ہیں۔“

”اوہ ...... آئی سی !“ میں نے چہرے پر مصنوعی حیرت سجاتے ہوئے کہا ”شکریہ میرے فاضل دوست۔ ڈیئر ڈیفنس کونسلر۔ میں تو واقعی اپنے موکل کو بھول بیٹھا تھا۔ بہت شکریہ۔“

جج نے مجھ سے کہا ”وکیل صاحب! آپ استغاثہ سے متعلق سوال کریں تو زیادہ مناسب ہو گا۔“

”سرٹینلی یور آنر۔“ میں نے سر جھکا کر کہا، پھر کٹہرے میں کھڑے حاجی ہدایت اللہ سے پوچھا۔

”حاجی صاحب! میں آپ کو الحاج کہہ لوں تو آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں ہو گا؟“

”یہ تو میرے لئے بڑی خوشی کی بات ہو گی۔“ اس نے دراز داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے جواب دیا ”اللہ کے فضل سے ہر سال طواف بیت اللہ کی سعادت

نصیب ہوتی ہے۔"

"ماشاء اللہ' سبحان اللہ۔" میں نے عدالت کے وقار کو ملحوظ رکھتے ہوئے ممکنہ بلند آواز میں کہا پھر حاجی ہدایت اللہ سے سوال کیا "الحاج صاحب! آپ کو یاد ہوگا کچھ عرصہ قبل میں نے اپنے موکل مسمی منظور حسین کی طرف سے آپ کو ایک رجسٹرڈ نوٹس بھیجا تھا؟"

اس نے اثبات میں سرہلایا' میں نے کہا "اور آپ نے اس نوٹس کا جواب بھی دیا تھا؟"

"جی ہاں' وہ تحریر آپ کے دفتر ہی میں لکھی گئی تھی' بعد میں ہم دونوں نے جاکر نوٹری پبلک سے تصدیق مہر بھی لگوا لی تھی۔"

"شکریہ الحاج ہدایت اللہ صاحب۔" میں نے کہا پھر اپنی فائل میں سے مذکورہ نوٹس اور اس کے جواب کی نقول نکال کر جج کی جانب بڑھاتے ہوئے استدعا کی "جناب عالی! میں یہ نوٹس اور اس کا جواب شامل مسل کروانا چاہتا ہوں۔"

جج متردد ہوا "بیگ صاحب! آپ نے یہ چیزیں عرضی دعویٰ کے ساتھ دائر کیوں نہیں کیں؟"

بعض ناگزیر وجوہات کی بناء پر یور آنر۔ میں اس کی وضاحت دوران جرح کردوں گا۔" میں نے کہا "فی الحال میری لرنڈ کورٹ سے اتنی سی درخواست ہے کہ اس نوٹس کے حوالے سے میں مدعا علیہ سے چند ضروری سوالات پوچھنے کی اجازت چاہتا ہوں۔"

جج نے وہ نوٹس اور اس کا جواب عرضی دعویٰ کے ساتھ شامل کرتے ہوئے مجھے سوالات کی اجازت دے دی۔

اس کے ساتھ ہی عدالت کا وقت ختم ہوگیا۔

○

ہم عدالت کے کمرے سے باہر آئے تو حاجی ہدایت اللہ نے کھا جانے والی نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا "بیگ صاحب! آپ نے میرے ساتھ دھوکا کیا ہے۔"

"آمدم بر سر مطلب!" میں نے روکھے پھیکے انداز میں کہا۔

وہ جوشیلے لہجے میں بولا "آپ نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ اپنے موکل سے معاملہ سیٹل کروا دیں گے لیکن آپ نے مجھے خبر بھی نہیں ہونے دی اور مقدمہ عدالت میں بھی پیش کردیا۔"

"اس کا موقع آپ نے خود فراہم کیا ہے جناب۔" میں نے تلخ لہجے میں کہا "آپ میرے موکل کے واجبات ادا کردیتے تو یہاں تک نوبت ہی نہیں آتی۔"

وہ قدرے نرم پڑتے ہوئے بولا "میں ایک لاکھ تک دینے کو تیار ہوں۔ آپ کیس ختم کردیں۔"

"اب یہ کیس اتنی آسانی سے ختم نہیں ہوگا حاجی صاحب۔"

"اگر مدعی اور مدعا علیہ آپس میں راضی نامہ کرلیں تو؟"

"ہاں' یہ ہوسکتا ہے۔" میں نے کہا "مگر اس کے لئے آپ کو میرے موکل کو پورے ایک لاکھ چالیس ہزار روپے دینا ہوں گے۔ اس سے ایک پیسہ کم پر بھی وہ راضی نہیں ہوگا بلکہ وہ تو یہاں تک تلا بیٹھا ہے کہ عدالت کا خرچہ اور وکیل کی فیس بھی وہ آپ ہی سے نکلوائے گا۔"

"یو آر اے اسمارٹ گائی مسٹر امجد بیگ۔" وہ اکھڑے ہوئے لہجے میں بولا "مجھے یقین ہے کہ اسے یہ پٹی آپ ہی نے پڑھائی ہوگی؟"

"آف کورس۔" میں نے کندھے اچکاتے ہوئے جواب دیا "میرا کام اپنے موکل کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچانا ہے۔ اگر میں نے ایسا کیا ہے تو یہ میرے پیشے کا تقاضا ہے۔"

"میں آپ کو اپنا وکیل کرنا چاہتا ہوں۔"

"اس کیس میں تو یہ ممکن ہے۔" میں نے کہا۔ "ہاں' آئندہ کبھی آپ کو میری ضرورت محسوس ہوئی تو میں خدمت کے لئے حاضر ہوں مگر اپنی اولین شرط کے ساتھ۔"

اس نے وضاحت طلب نظروں سے مجھے دیکھا' میں نے بتایا "جب تک مجھے یقین نہ ہو جائے کہ میری خدمات حاصل کرنے والا حق پر ہے' میں اس کی وکالت کے

لئے تیار نہیں ہوتا۔"

"یوں کیوں نہیں کہتے کہ آپ صرف آسان اور حلوا قسم کے کیس ہی میں ہاتھ ڈالتے ہیں۔ جہاں آپ کو اپنی کامیابی کے روشن امکانات نظر آرہے ہوں تاکہ آپ کا ریکارڈ بے داغ رہے ؟"

میں نے کہا "اپنا اپنا دماغ ہے' جو جی چاہے سوچتے پھریں۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔" پھر میں اس پر ایک اچٹتی سی نظر ڈال کر اپنے موکل کے ساتھ آگے بڑھ گیا۔

اگلی پیشی دس روز بعد تھی۔ اس دوران میں منظور حسین نے دو بار میرے دفتر کے چکر لگائے تھے اور گل بادشاہ کے بارے میں نہایت ہی مفید معلومات مہیا کی تھیں جن کا ذکر سردست مناسب نہیں ہے۔ عدالتی کارروائی کے دوران میں آپ خود بخود آگاہ ہو جائیں گے۔

آئندہ دو تین پیشیوں میں کوئی قابل ذکر کارروائی نہیں ہوئی۔ لہٰذا ہم آگے بڑھتے ہیں۔

◆

منظر سیشن کورٹ کے اسی کمرے کا تھا اور ملزموں کے کٹہرے میں الحاج ہدایت اللہ کھڑا تھا۔

پچھلی پیشی پر استغاثہ کے گواہ مسمیٰ عبدالقیوم اور مدعی منظور حسین کے بیانات بھی ہوگئے تھے اور وکیل صفائی نے حسب توفیق ان پر جرح بھی کی تھی۔ وکیل صفائی کے سوالات کے جواب میں انہوں نے اپنی اپنی باری پر نہایت ہی نپے تلے الفاظ میں مناسب اور موزوں جوابات دیئے تھے۔ اس کیس کو عدالت میں لگے ہوئے اب کوئی آٹھ ماہ سے زیادہ عرصہ ہوچکا تھا۔

میں جج کی اجازت حاصل کرنے کے بعد جرح کے لئے کٹہرے کے نزدیک گیا اور حاجی ہدایت اللہ کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔

"حاجی صاحب! آج سے تقریباً" ساڑھے تین چار سال قبل میرے موکل نے آپ کے ایک پروجیکٹ "طور کمپلیکس" میں ایک سی کیٹگری فلیٹ بک کروایا تھا۔ اس کے ساتھ ہی میرے موکل کے بہنوئی اور اس مقدمے کے اکلوتے گواہ عبدالقیوم نے بھی مذکورہ ٹائپ کا ایک فلیٹ بک کروایا تھا۔ کیا آپ اس بات کو تسلیم کرتے ہیں ؟"

اس نے الٹا مجھ سے سوال کر دیا "میں کوئی جواب دینے سے پہلے یہ جاننا چاہوں گا کہ آپ منظور حسین کے وکیل ہیں یا عبدالقیوم کے؟"

"منظور حسین کا۔"

"تو پھر آپ اپنے موکل کی ہی بات کریں۔"

میں نے کہا "بجا فرماتے ہیں آپ۔ مجھے اپنے موکل ہی کے حوالے سے سوالات کرنا چاہئیں۔ گویا آپ تسلیم کرتے ہیں کہ میرے موکل نے آپ کے پروجیکٹ میں مذکورہ عرصہ قبل فلیٹ بک کروایا تھا ؟"

"دریں چہ شک۔"

"شکریہ۔" میں نے کہا پھر اپنی فائل میں سے منظور حسین اور حاجی بلڈرز کے درمیان طور کمپلیکس کے فلیٹ کی بکنگ کے سلسلے میں تیار کیا جانے والا اگریمنٹ نکال لیا۔ اس اگریمنٹ کی ایک فوٹو کاپی میں نے جج کی طرف بھی بڑھا دی اور کہا "یور آنر' اس اگریمنٹ کی پشت پر قواعد و ضوابط کی تفصیل درج ہے۔ معزز عدالت سے میری درخواست ہے کہ ان نکات کا جائزہ لیا جائے۔"

جج چند لمحوں تک اگریمنٹ کو الٹ پلٹ کر دیکھتا رہا پھر سوالیہ نظروں سے میری جانب دیکھنے لگا۔

میں نے اگریمنٹ کے پہلے اصول کو بہ آواز بلند پڑھتے ہوئے حاجی ہدایت اللہ سے سوال کیا "حاجی صاحب! آپ کی کمپنی کے طبع شدہ اصول نمبر ایک کے تحت اگر کوئی الاٹی متواتر دو ماہ تک ماہانہ قسط ادا نہ کرسکے تو قواعد و ضوابط کی روشنی میں وہ ڈی فالٹر ہو جائے گا۔ اس کے بعد آپ کو اختیار حاصل ہوگا کہ آپ اس کی بکنگ کینسل کر کے مذکورہ فلیٹ کسی بھی ایکس وائی زیڈ شخص کو الاٹ کردیں۔ میرا آپ سے یہ سوال ہے کہ آیا کبھی میرے موکل سے یہ کوتاہی سرزد ہوئی ؟"

اس نے جواب دینے میں تامل کیا۔ میں نے فوراً کہا۔ "واضح رہے کہ عدالت کے کمرے میں آپ کے منہ سے نکلنے والا ایک ایک لفظ ریکارڈ ہو جائے گا۔ اس لئے سوچ سمجھ کر بولیے گا۔" پھر میں نے اپنی فائلوں کو تھپتھپاتے ہوئے اضافہ کیا۔ "ان کے اندر تمام ریکارڈ موجود ہے جو بوقت ضرورت معزز عدالت کی خدمت میں پیش کیا جاسکتا ہے۔"

بہت سوچ بچار کے بعد اس نے جواب دیا "آپ کے سوال کا جواب میں "نہیں" دوں گا۔"

میں نے اگلا سوال کیا "حاجی صاحب! آپ کے اصول نمبر دو میں یہ بات درج ہے کہ اگر کوئی الاٹی ششماہی قسط ایک ماہ کے اندر اندر ادا نہیں کرے گا تو اس صورت میں وہ ڈی فالٹر تصور کیا جائے گا۔ میرے موکل نے ششماہی والی کوئی بھاری قسط مس کی تھی؟"

اس نے مختصر جواب پر اکتفا کیا "نہیں۔"

میں نے دیکھا' جج بڑی دلچسپی سے ہمارے سوال و جواب سن رہا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ وہ اگریمنٹ کی فوٹو کاپی کا بھی جائزہ لے رہا تھا۔ یہ صورت حال ہمارے حق میں جاتی تھی۔

"حاجی صاحب!" میں نے سوالات کے سلسلے کو دراز کرتے ہوئے پوچھا "آپ کے ایگریمنٹ کا اصول نمبر تین بکنگ کے اس پہلو پر روشنی ڈالتا ہے کہ تعمیراتی مراحل کی مختلف حالتوں میں آپ الاٹی سے جو تین بڑی بڑی قسطیں وصول کرتے ہیں' اگر ان میں سے کوئی ایک پے منٹ بھی دو ماہ کے عرصے کے اندر اندر آپ کے دفتر میں جمع نہ کرائی جاسکے تو آپ کو یہ حق حاصل ہوجائے گا کہ آپ الاٹی کی بکنگ کینسل کرسکتے ہیں۔ کیا میرے موکل نے وہ تینوں مطلوبہ قسطیں ادا کردی تھیں؟"

"دو قسطیں مقررہ وقت کے اندر ادا کردی تھیں۔ تیسری کا موقع ہی نہیں آسکا۔"

"یعنی ازروئے اگریمنٹ میرا موکل آپ کے قواعد و ضوابط پر پورا اترتا ہے۔ آپ اسے کسی بھی طرح ڈی فالٹر قرار نہیں دے سکتے؟"

"جی ہاں' آپ درست کہہ رہے ہیں۔" حاجی ہدایت اللہ نے جواب دیا۔

"ہیر از پوائنٹ یور آنر۔" میں نے جج کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "ملزم کے آخری جواب کو من و عن عدالت کے ریکارڈ پر لایا جائے۔"

اس کے بعد میں گردن جھکا کر خاموشی سے اپنے فائلوں میں کچھ تلاش کرنے لگا۔ عدالت میں ایک دم سناٹا چھا گیا۔ وہاں موجود ہر شخص (جج سمیت) مجھے ایسی نظروں سے دیکھ رہا تھا جیسے میں کوئی مداری ہوں اور اچانک اپنے تھیلے میں سے کوئی انتہائی خطرناک سانپ برآمد کرنے والا ہوں۔

میں نے اپنی فائل میں سے مطلوبہ کاغذ نکال کر جج کی جانب بڑھا دیا پھر کھنکھار کر گلا صاف کرتے ہوئے کہا۔ "جناب عالی! یہ دستاویز ظاہر کرتی ہے کہ میرے موکل کو حاجی بلڈرز نے ڈی فالٹر قرار دے دیا تھا۔ یعنی قواعد و ضوابط کے مطابق اب میرے موکل کی ادا کی ہوئی رقم اسے تعمیراتی منصوبے کی تکمیل کے بعد واپس کی جاتی جو ایک لاکھ چونتیس ہزار روپے سکہ پاکستان رائج الوقت بنتی ہے جبکہ میرے موکل نے مختلف چھوٹی بڑی قسطوں کی صورت میں ملزم کی تعمیراتی کمپنی "حاجی بلڈرز" کو صرف سڑسٹھ ہزار روپے ادا کیے تھے۔"

"آپ کہنا کیا چاہتے ہیں بیگ صاحب!" جج نے چشمے کے پیچھے سے آنکھیں سکیڑ کر مجھے دیکھا "اپنی بات کی وضاحت کریں۔"

میں نے کھنکھار کر گلا صاف کرتے ہوئے کہا "یور آنر' میرے موکل نے واقعی ملزم کو سڑسٹھ ہزار روپے ادا کیے تھے۔"

"پھر وہ ایک لاکھ چونتیس ہزار روپے کا کیا قصہ ہے۔ یہ رقم دگنی کیسے ہوگئی؟"

"حاجی صاحب کی مہربانی ہے۔" میں نے کٹہرے میں کھڑے حاجی ہدایت اللہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "جناب عالی! ملزم کے مشورے پر میرے موکل کا بہنوئی عبدالقیوم جو اس کیس کا معزز گواہ بھی ہے' اس نے اپنا فلیٹ میرے موکل کے نام ٹرانسفر کردیا تھا اس طرح میرا موکل دو فلیٹوں کا الاٹی بن گیا۔ سڑسٹھ اور سڑسٹھ ہزار مل کر ایک لاکھ چونتیس ہزار روپے بن گئے۔" ایک لمحے کو رک کر میں نے اپنی فائل میں سے ایفی ڈیوٹ کی نقل نکال کر جج کی جانب بڑھا دی پھر کہا "یور آنر' معزز عدالت

ملاحظہ کرسکتی ہے کہ کس طرح میرا موکل ایک فلیٹ کی قسطیں ادا کرکے دو فلیٹوں کا الاٹی بن گیا۔"

جج نے کاغذات کا اچھی طرح جائزہ لینے کے بعد مجھ سے سوال کیا "بیگ صاحب! بات کچھ سمجھ میں نہیں آئی۔ ملزم نے آپ کے موکل اور گواہ عبدالقیوم کو ایسا کرنے پر کیوں آمادہ کیا۔ یہ کیا بھید ہے؟"

"اس کا مناسب جواب تو حاجی صاحب ہی دے سکتے ہیں جناب عالی۔"

جج نے روئے سخن حاجی ہدایت اللہ کی جانب موڑتے ہوئے اس بارے میں استفسار کیا تو وہ اچانک پھٹ پڑا۔ اس نے جج کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ اس وقت اس کا لہجہ جذبات سے مغلوب تھا۔ اور آنکھوں سے غصے کی چنگاریاں چھوٹ رہی تھیں۔

"جناب عالی! لوگ سچ کہتے ہیں کہ آج کل کے دور میں کسی کے ساتھ نیکی نہیں کرنا چاہئے مگر میرے دل میں اللہ نے جو درد رکھ دیا ہے وہ مجھے کسی کروٹ چین نہیں لینے دیتا۔ میں کسی کو دکھی اور پریشان نہیں دیکھ سکتا۔ اگر طور کمپلیکس کی تعمیر کا کام رک گیا تھا تو اس میں میرا کوئی قصور نہیں تھا۔ ایک تو حاجی شرافت علی کی کاروبار سے علیحدگی نے مجھے مالی طور پر بہت کمزور کر دیا تھا' اوپر سے ہاؤس بلڈنگ والے قرضہ دینے میں تاخیری حربے آزما رہے تھے۔ اس قسم کی سنگین صورتحال میں یہ دونوں احسان فراموش" اس نے باری باری عدالت میں موجود منظور حسین اور عبدالقیوم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اپنا بیان جاری رکھا "جی' یہ دونوں طوطا چشم میرے پاس گڑگڑانے چلے آئے اور رو رو کر منتیں کرنے لگے کہ انہوں نے قرض ادھار اٹھا کر بکنگ اور فلیٹ کی بھاری قسطیں ادا کی تھیں۔ میں ان پر یہ احسان کردوں کہ یا تو ان کی دی ہوئی رقم واپس کردوں یا پھر کوئی دوسرا حل نکالوں۔ میرا خدا بہتر جانتا ہے' اگر اس وقت میرے ہاتھ میں پیسہ ہوتا تو میں ان کی ضرورت پوری کردیتا۔ لیکن ایسا ممکن نہیں تھا۔ میں نے انہیں تجویز دی کہ ان میں سے کوئی ایک دوسرے کے نام اپنی بکنگ منتقل کر دے۔ اس طرح اس رقم کے بدلے میں' میں انہیں اپنے دوسرے پروجیکٹ میں بڑا فلیٹ دے دوں گا۔ انہوں نے آپس میں مشورہ کیا پھر دونوں کی رضامندی سے منظور حسین دو فلیٹوں کا الاٹی بن گیا۔ بعد ازاں اس کی بکنگ کینسل کرکے میں نے اسے طور اسکوائر میں اتنی ہی مالیت کا بی کیٹگری کا ایک فلیٹ دے دیا۔ اس مد میں اس نے مجھے چھ ہزار مزید بھی دیئے تھے کیونکہ طور اسکوائر کا فلیٹ ایک لاکھ چالیس ہزار روپے کی مالیت کا تھا' بخدا' میری نیت میں کوئی کھوٹ نہیں تھا۔"

اس کا طویل جذبات انگیز بیان ختم ہوا تو میں نے اپنی جگہ سے اٹھ کر کہا "حاجی صاحب' اگر آپ کی نیت میں کوئی کھوٹ نہیں تھا تو آپ کو ڈی فالٹر بکنگ کینسل' بکنگ منتقل اور طور اسکوائر میں متبادل فلیٹ جیسے ڈرامے رچانے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ آپ سیدھے سیدھے ان کی ادا شدہ رقم واپس کرکے یہ قصہ ختم کرسکتے تھے۔"

وکیل صفائی کو جیسے ہوش آگیا۔ اس نے اپنی فیس حلال کرنے کی غرض سے کہا "جناب عالی! مجھے اعتراض ہے۔ میرا موکل معزز عدالت کو یہ بات وضاحت کے ساتھ بتاچکا ہے کہ اس وقت اس کی مالی حالت اس بات کی اجازت نہیں دیتی تھی۔ وکیل استغاثہ بار بار ایک سوال دہرا کر میرے موکل کو ہراساں کر رہے ہیں۔ انہیں اس حرکت سے باز رکھا جائے۔"

میں نے طنزیہ لہجے میں کہا "جن لوگوں کی مالی حالت پتلی ہوتی ہے اور خصوصاً وہ لوگ جو ہزاروں اللہ کے بندوں کے مقروض ہوں ان پر حج فرض نہیں ہوتا مگر ملزم تو ہر سال باقاعدگی سے حج بیت اللہ کے لئے بڑے اہتمام کے ساتھ تشریف لے جاتے ہیں۔ چند ماہ بعد ان کی سواری پھر روانہ ہونے والی ہے۔"

"یور آنر' یہ میرے موکل کی ذاتیات پر حملہ کرنے کے مترادف ہے۔" وکیل صفائی نے تیز آواز میں کہا "میرا موکل اگر ہر سال حج پر جاتا ہے تو وکیل استغاثہ کو کیا تکلیف ہے۔"

میں نے ترکی بہ ترکی جواب دیا "مجھے یہ تکلیف ہے کہ میرے موکل کو تکلیف ہے۔ موکل کسی وکیل کے لئے وہی حیثیت رکھتا ہے جو ایک بچہ اپنی ماں کے لئے۔ جس طرح کوئی ماں اپنے بچے کو تکلیف پہنچتے ہوئے نہیں دیکھ سکتی' ہر وقت اس کا خیال رکھتی ہے اسی طرح ایک اچھے وکیل [illegible] بھی فرض بنتا ہے کہ وہ اپنے موکل کے

فائدے اور نقصان پر گہری نظر رکھے۔ مجھے فخر ہے کہ میں ایک اچھا وکیل ہوں۔"

"ہر وکیل کو خود پر فخر ہوتا ہے۔"

جج نے ہماری گفتگو میں مداخلت کرتے ہوئے کہا "آپ آپس میں بحث و تکرار سے پرہیز کریں۔" پھر مجھے تنبیہہ کرتے ہوئے کہا "بیگ صاحب! آپ ٹو دی پوائنٹ سوال کریں۔"

میں نے حاجی ہدایت اللہ کو مخاطب کرتے ہوئے سوال کیا "حاجی صاحب! آپ نے ابھی معزز عدالت کو بتایا ہے کہ آپ ایک لاکھ چالیس ہزار روپے میں میرے موکل کو طور اسکوائر میں کوئی بی کیٹیگری فلیٹ الاٹ کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ میرے نوٹس کے جواب میں بھی آپ نے اس رقم کی تصدیق کی ہے اور خود کو پابند ظاہر کیا ہے کہ آپ مطلوبہ فلیٹ میرے موکل کو دینے کے لئے پابند ہیں اور ان کاغذات ...." میں نے فائل میں سے چند کاغذات نکال کر الٹ پلٹ کرتے ہوئے سلسلہ کلام جاری رکھا "ان کاغذات سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ آپ نے میرے موکل کو طور اسکوائر کے بلاک اے میں کوئی فلیٹ الاٹ کیا تھا جس کا قبضہ ایک ماہ بعد دینے کا وعدہ کیا تھا۔ آپ اس بات کی بھی تصدیق کرتے ہیں؟"

"یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے۔ میں اس سے انکار کس طرح کرسکتا ہوں۔"

"تھینک یو حاجی صاحب۔" میں نے کہا پھر وہ کاغذات جج کی طرف بڑھا دیئے "یور آنر' میری معزز عدالت سے استدعا ہے کہ وہ ان کاغذات کا بغور جائزہ لے۔"

جج نے میری درخواست کے بموجب ان کاغذات کو دیکھا پھر مجھ سے پوچھا "بیگ صاحب! آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟"

"میں یہ کہنا چاہتا ہوں جناب عالی!" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے اپنا مقصد واضح کیا "کہ حاجی ہدایت اللہ کے وعدے کے مطابق ابھی قبضے کی تکمیل میں چند روز باقی تھے کہ میرا موکل اپنے بیوی بچوں کے ساتھ مذکورہ فلیٹ کے معائنے کے لئے گیا اور وہاں اس نے ایک عجیب تماشا دیکھا۔"

میں نے رک کر ڈرامائی انداز میں حاضرین پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی۔ سب کی نظریں مجھ پر لگی ہوئی تھیں۔ جج کی آواز نے عدالت کے کمرے میں چھائے ہوئے سناٹے کو توڑا۔

"وکیل صاحب! اس عجیب تماشے کی وضاحت کریں۔"

میں نے کہا "جناب عالی! میرے موکل کو بلاک اے کا جو فلیٹ الاٹ کیا گیا تھا وہاں پہلے سے ایک پختون فیملی آباد تھی۔ گھر کے سربراہ گل بادشاہ کا دعوی ہے کہ وہ فلیٹ انہوں نے قسطوں پر بک کرایا تھا اور حال ہی میں اس کا قبضہ حاصل کیا ہے۔"

جج نے ناگوار نظروں سے حاجی ہدایت اللہ کو گھورا "آپ کو شرم نہ آئی اتنا بڑا فراڈ کرتے ہوئے؟"

وہ جلدی سے بولا "جناب عالی! یہ سب کچھ ایک غلط فہمی کی بناء پر ہوا تھا۔" اس کا انداز گھگیانے والا تھا۔

"کیسی غلط فہمی؟"

"وہ بات یہ ہے جناب۔" وہ لرزیدہ آواز میں کہنے لگا۔ "ان دنوں میں حج پر جانے کی تیاریوں میں مصروف تھا اس لئے یہ غلط فہمی ہوگئی۔ دراصل طور اسکوائر کے بلاک بی میں ایک فلیٹ خالی تھا جو میں منظور حسین کو دینے کا ارادہ رکھتا تھا مگر جلدی میں بلاک اے کے فلیٹ کے کاغذات بنوا بیٹھا جو پہلے ہی گل بادشاہ نے بک کروا رکھا تھا۔"

"یہ جھوٹ ہے یور آنر۔" میں نے ٹھوس لہجے میں کہا "میرا موکل اور اس کا بہنوئی عبدالقیوم کاغذات کی تیاری سے قبل دو تین مرتبہ مذکورہ فلیٹ کا جائزہ لے آئے تھے اور ان کو فلیٹ دکھانے ملزم بہ نفس نفیس ان کے ساتھ گیا تھا۔ پھر کسی بھی قسم کی غلط فہمی کا کیا سوال؟"

حاجی ہدایت اللہ نے رونی صورت بنا کر جج کی طرف دیکھا' جج نے سخت لہجے میں پوچھا "تم اس سلسلے میں کیا کہتے ہو؟"

حاجی ہدایت اللہ کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ بولے تو کیا بولے۔ وہ کبھی امداد طلب نظروں سے اپنے وکیل کو دیکھتا تھا اور کبھی غصیلی نگاہوں سے مجھے۔ وکیل صفائی نے اس کی حمایت میں آخری کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"یور آنر' انسان خطا کا پتلا ہے۔ اس سے بھول چوک ہو جانا کوئی غیر معمولی

بات نہیں ہے۔ اگر میرے موکل کو کوئی غلط فہمی ہوگئی تھی تو میرے فاضل دوست کو اس پر کیا اعتراض ہے۔ کیا زندگی میں کبھی ان سے کوئی غلطی سرزد نہیں ہوئی؟"

میں نے اپنی جگہ سے اٹھ کر کہا "جناب عالی! کٹہرے میں کھڑا ملزم پکا دھوکے باز اور فراڈیا ہے۔ اس کی نیت میں شروع ہی سے فتور تھا۔ اگر وہ میرے موکل اور اس کے بہنوئی سے واقعی مخلص تھا اور دلی طور پر ان کے کام آنا چاہتا تھا تو اس کے لئے یہ کوئی مشکل بات نہ تھی کہ اس سے حاصل کی ہوئی رقم انہیں واپس کردیتا۔ یہ بات کوئی بھی ذہن قبول نہیں کرے گا کہ وہ مطلوبہ رقم کا انتظام کرنے سے قاصر تھا۔ جس شخص کے شہر میں دو رہائشی پروجیکٹ تیزی سے تکمیل کی طرف بڑھ رہے ہوں، اس کی تو ساکھ ہی بہت بڑی قوت ہوتی ہے۔ وہ چٹکی بجاتے میں لاکھ دو لاکھ کا بندوبست کرسکتا ہے مگر سچی بات یہ ہے کہ ملزم ایسا چاہتا ہی نہیں تھا۔"

میں نے مزید دلائل دیتے ہوئے کہا "یور آنر! وہ شخص ایک دو کے نہیں بلکہ سینکڑوں لوگوں کے پیسے دبائے بیٹھا ہے۔ اس نے میرے موکل کو ڈی فالٹر ظاہر کرنے کے لئے ایک نادیدہ جال بچھایا حالانکہ وہ کسی بھی مرحلے پر ڈی فالٹر نہیں تھا۔ ملزم نے ایک طویل چکر چلا کر اسے اپنی لچھے دار باتوں سے بے وقوف بنایا۔ میرا سادہ دل موکل بے خبری میں اس فریبی کی گرفت میں آتا چلا گیا۔ پھر اس نے میرے بے وقوف موکل کو ایک ایسا فلیٹ الاٹ کر دیا جو پہلے ہی سے کسی گل بادشاہ نامی شخص نے بک کروا رکھا تھا۔ یہ تو اس دھوکے باز کا وہ طریقہ واردات ہے جو اس نے میرے موکل پر آزمایا تھا۔ باقی لوگوں کو اس نے کیا کیا چکر دے رکھے ہوں گے، یہ خدا ہی بہتر جانتا ہے۔"

حاجی ہدایت اللہ ساری چوکڑی بھول چکا تھا حتی کہ فارسی اور انگریزی کو بھی بہت پیچھے چھوڑ آیا تھا۔ میں نے اپنے دلائل کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے کہا "جناب عالی! اب تمام حالات معزز عدالت کے علم میں آچکے ہیں۔ صورت حال روز روشن کی طرح عیاں ہو چکی ہے۔ ملزم نے میرے نوٹس کے جواب میں اور پھر معزز عدالت کے سامنے بھی اس بات کا اقرار کیا ہے کہ وہ میرے موکل کا ایک لاکھ چالیس ہزار روپے کا مقروض ہے۔ اس نے میرے موکل سے جو بھی وعدہ کیا، اسے پورا نہ کیا حتی کہ آخری مرحلے پر اسے ایک ایسا فلیٹ الاٹ کر دیا جو قسطوں پر پہلے ہی گل بادشاہ نے بک کروا رکھا تھا۔"

میں نے دلائل کو اختتامی مرحلے کی طرف لاتے ہوئے کہا "یور آنر، گل بادشاہ نامی شخص کا دعوی ہے کہ اس نے مذکورہ فلیٹ دو سال قبل بک کروایا تھا اور تمام قسطیں ادا کرنے کے بعد اس نے قبضہ حاصل کرلیا ہے۔ میری فاضل عدالت سے اتنی سی درخواست ہے کہ وہ ملزم حاجی ہدایت اللہ سے معلوم کرے کہ اس نے گل بادشاہ کا فلیٹ میرے موکل کو کیوں اور کس مقصد کے تحت الاٹ کیا تھا؟"

جج نے یہی سوال حاجی ہدایت اللہ سے کیا۔ اس نے میری گرفت سے نکلنے کیلئے آخری بار پروں کو پھڑپھڑایا، رقت آمیز لہجے میں بولا "جناب عالی! دراصل یہ سب کچھ ہنگامی حالات کے تحت ہوا تھا۔"

جج نے پوچھا "ہنگامی حالات سے تمہاری کیا مراد ہے؟"

"جناب عالی! طور اسکوائر کے بلاک اے کا وہ فلیٹ میں درحقیقت منظور حسین کو ہی دینا چاہتا تھا۔ میں نے اس سلسلے میں تمام ضروری کاغذات بھی تیار کروا لیے تھے مگر عین موقع پر گڑبڑ ہوگئی اور ہنگامی حالات میں مجھے وہ فلیٹ گل بادشاہ کو دینا پڑا۔"

میں نے اور جج نے بیک وقت چونک کر اس کی طرف دیکھا، جج نے پوچھا "گویا وہ فلیٹ گل بادشاہ نے قسطوں پر بک نہیں کروایا تھا؟"

"نہیں جناب، کبھی بھی نہیں۔"

"اور وہ ہنگامی حالات کیا تھے؟"

"مجھے ایک نہایت ہی طاقت ور سیاسی شخصیت کی طرف سے دھمکی ملی تھی کہ اگر میں نے وہ فلیٹ گل بادشاہ کے نام الاٹ نہ کیا تو میرے بیوی بچوں کی لاشیں بھی شناخت کے قابل نہیں رہیں گی۔ میں اس سیاسی شخصیت کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ درجنوں غنڈے اور خطرناک بدمعاش اس کی آنکھ کے ایک اشارے پر لاشیں گرانے کو تیار رہتے ہیں۔ اپنی جان کسے پیاری نہیں ہوتی جناب۔ مجھے اپنے بیوی بچوں سے بہت محبت ہے میں نے فوراً اس سیاسی شخصیت کی بات مان لی۔ میں نے سوچا تھا بعد میں منظور حسین کو کسی مناسب موقع پر سمجھا دوں گا۔"

"واہ، بہت خوب۔" میں نے تعریفی انداز میں کہا۔ "آپ .... حاجی صاحب! فکشن رائٹر کے طور پر بہت زیادہ کامیابی حاصل کرسکتے ہیں۔"

"یہ شعبہ آپ ہی کو مبارک ہو۔"

میں نے کہا "حاجی صاحب! یہ مت سمجھیں کہ عدالت آنکھیں بند کرکے آپ کی بات کا یقین کرلے گی۔ آپ کے بیان کی تصدیق کے لئے گل بادشاہ کو گواہ کے طور پر یہاں بلایا بھی جاسکتا ہے۔"

وہ بری طرح جھنجلایا ہوا تھا، اچانک پھٹ پڑا۔ "بیگ صاحب! مجھے یقین ہو گیا ہے کہ آپ بہت ہوشیار وکیل ہیں۔ آپ نے بڑی خوب صورتی سے مجھے بے دست و پا کر دیا ہے۔ لیکن ایک بات میری بھی ذہن میں بٹھالیں کہ بعض اوقات انسان پر بہت بھاری وقت آن پڑتا ہے۔ ایسی صورت میں جان بچانے کے لئے حرام چیز بھی اس پر حلال ہو جاتی ہے۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ کبھی آپ پر بھی ایسی گھڑی لائے تاکہ آپ کو دوسروں کی مجبوریوں کا اندازہ ہوسکے اور اب میں کسی کے سوال کا بھی کوئی جواب نہیں دوں گا چاہے مجھے توہین عدالت کے جرم میں سزا ہی کیوں نہ ہو جائے۔"

جج نے ڈانٹنے والے انداز میں کہا۔ "مسٹر حاجی ہدایت اللہ، زیادہ جذبات میں آنے کی ضرورت نہیں ہے ورنہ میں واقعی تمہیں توہین عدالت کے جرم میں جیل بھجوا دوں گا۔"

"میں اپنے رویئے کے لئے معذرت خواہ ہوں۔" وہ مسمسی سی صورت بنا کر بولا۔

میں نے کہا۔ "جناب عالی! ملزم کے تازہ ترین بیان کی تصدیق صرف ایک شخص کرسکتا ہے اور وہ ہے گل بادشاہ۔ اس لیے میری معزز عدالت سے درخواست ہے کہ وہ گل بادشاہ کو پابند گواہ کی حیثیت سے بذریعہ سمن عدالت میں بلائے تاکہ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہوسکے۔"

جج نے ہدایت اللہ سے پوچھا "آپ اپنے بیان کی تصدیق کے لئے گل بادشاہ کو عدالت میں پیش کرسکتے ہیں؟"

"میرے لئے یہ بہت مشکل ہوگا۔ وہ میری بات ماننے سے انکار بھی کرسکتا ہے۔ میں اس قسم کے لوگوں سے دشمنی مول نہیں لے سکتا۔"

"ٹھیک ہے۔" جج نے کہا پھر متعلقہ عدالتی عملے کو گل بادشاہ کے نام سمن جاری کرنے کا حکم دے دیا۔

اس کے بعد جج نے آئندہ پانچ روز بعد کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کر دی۔

* * *

اگلی پیشی پر گل بادشاہ عدالت میں موجود تھا مگر ملزم حاجی ہدایت اللہ غائب۔ وکیل صفائی نے بیماری کا سرٹیفکیٹ دے کر تاریخ لے لی۔ عدالت کے کمرے سے نکلتے ہوئے میں نے مخالف وکیل سے پوچھا "کیا بیماری ہوگئی آپ کے موکل کو؟"

"کچھ دل کا معاملہ ہے۔" وہ بے رخی سے بولا "دل کے ڈاکٹر سے علاج ہو رہا ہے۔"

"خدا خیر کرے۔" میں نے آہ بھر کر کہا اور آگے بڑھ گیا۔

چھ روز بعد ہم سب پھر عدالت میں موجود تھے۔ عدالت کے کمرے میں کسی اور کیس کی سماعت ہو رہی تھی۔ میں اپنے موکل کے ساتھ برآمدے میں کھڑا باتیں کر رہا تھا کہ حاجی ہدایت اللہ پر میری نظر پڑی۔ وہ چند روز میں خاصا جھک گیا تھا۔ اس کا چہرہ دیکھ کر مجھے بھی یقین ہوگیا کہ واقعی وہ کسی عارضے میں مبتلا ہوچکا تھا۔

وہ ہمارے نزدیک سے گزرنے لگا تو میں نے خاص طور پر اسے سنانے کے لئے منظور حسین سے کہا "کل میرے دفتر میں طور کمپلیکس کے چند الاٹیز آئے تھے۔ وہ بھی حاجی بلڈرز پر مقدمے کا ارادہ رکھتے ہیں۔"

حاجی مجھے خونخوار نظروں سے گھورتے ہوئے گزر گیا۔ منظور حسین نے پوچھا "کیا واقعی بیگ صاحب؟"

اس سے پہلے کہ میں اپنے موکل کو صورت حال سے آگاہ کرتا ہمارے مقدمے کی آواز پڑ گئی۔

تھوڑی دیر بعد جج نے کارروائی کا آغاز کیا اور گل بادشاہ کو بیان کے لئے کٹہرے میں بلالیا۔ پچھلی پیشی پر اسے کیس کی نوعیت کا علم ہوچکا تھا اور یہ بھی پتہ چل چکا تھا کہ اس کی عدالت میں طلبی کس سلسلے میں ہوئی ہے۔

گل بادشاہ نے سچ بولنے کا حلف اٹھانے کے بعد جو بیان عدالت کے رو بہ رو دیا' اس نے حاجی ہدایت اللہ کے تابوت میں آخری کیل ٹھونک دی۔ اس کے بیان کا خلاصہ یہ تھا کہ وہ بھی طور کمپلیکس کا ایک ویرینہ الاٹی تھا۔ اس نے سیکنڈ فلور پر ایک بی کیٹیگری فلیٹ بک کروا رکھا تھا مگر جب اس نے دیکھا کہ وہ پروجیکٹ کسی بھی طور پر مکمل ہونے کے آثار دکھائی نہیں دیتے تو وہ غصے میں تلملاتا ہوا حاجی ہدایت اللہ کے پاس پہنچ گیا۔ اس نے حاجی سے کہا' یا تو وہ ایک ماہ کے اندر اندر طور کمپلیکس کو مکمل کرے یا پھر اس کی رقم واپس کردے۔ حاجی کے لئے پروجیکٹ کو اس قلیل مدت میں مکمل کرنا ممکن نہ تھا اور رقم واپس کرنے کا وہ کوئی ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ اس صورت حال میں گل بادشاہ کا غصہ دو چند ہوگیا۔ اس کی رگوں میں دوڑنے والا جوشیلا پٹھان خون حاجی کی "بے مروتی" کے باعث سیدھا دماغ پر چڑھ گیا۔ ان میں خاصی تلخ کلامی ہوئی۔ حاجی نے یہاں تک کہہ دیا کہ اگر گل بادشاہ چاہے تو اس پر مقدمہ کردے۔ گل بادشاہ نے خالص پٹھانی لہجے میں کہا۔

"ہم عدالت مدالت کے چکر میں اپنا ٹیم برباد نہیں کرے گا۔ ام اپنے بازو کے زور سے پیسہ وصول کرے گا۔ خوچا' تم خود کو سمجھتا کیا ہے؟"

حاجی کو اکثر اپنی ہیرا پھیریوں کے نتیجے میں ایسی دھمکیاں ملتی رہتی تھیں۔ اس نے گل بادشاہ کی دھمکی بھی ایک کان سے سن کر دوسرے سے اڑا دی لیکن گل بادشاہ نے خالی خولی دھمکی نہیں دی تھی۔ اس نے جمرود سے اپنے کسی عزیز کو بلالیا۔ وہ خاندان میں رقم وصول کرنے کا "اسپیشلسٹ" سمجھا جاتا تھا چنانچہ ایک رات وہ دونوں حاجی کے گھر پہنچ گئے۔ گل بادشاہ کا مذکورہ عزیز پوری طرح مسلح تھا۔ اس کے پاس ہتھیار نہ بھی ہوتے تو وہ اپنے چہرے مہرے سے خاصا ہیبت ناک دکھائی دیتا تھا۔ قصہ مختصر' حاجی پر ان کی "کارروائی" کا خاطر خواہ اثر ہوا اور اس نے گل بادشاہ کو "طور اسکوائر" والے فلیٹ کا قبضہ دے کر اپنی اور اہل خانہ کی جان بچائی۔

گل بادشاہ کا بیان ختم ہوا تو میں جج سے اجازت لے کر جرح کے لئے آگے بڑھا۔ میں نے گل بادشاہ کے پاس آکر چند رسمی سے سوالات کیے۔ میں نے پوچھا "گل بادشاہ' آپ نے دعویٰ کیا ہے کہ طور اسکوائر کے بلاک اے کا مذکورہ فلیٹ آپ کا ہے۔ آپ نے اس سلسلے میں قانونی دستاویزات بھی عدالت میں پیش کی ہیں۔ میرے موکل کا بھی دعویٰ ہے کہ وہ متنازعہ فلیٹ حاجی ہدایت اللہ نے اسے دینے کا وعدہ کر رکھا تھا۔ آپ اس سلسلے میں کیا کہتے ہیں؟ کیا میرے موکل کا فلیٹ پر حق نہیں بنتا"؟

وہ لٹھ مار لہجے میں بولا "خو وکیل صیب! ام کسی کا ذمے دار نئیں اے۔ اگر آپ کے بندے (موکل) میں تپڑ ہے تو وہ اپنا پیسہ وصول کرلے یا پلیٹ ملیٹ لے' اگر تپڑ نہیں ہے تو برداش (برداشت) کرے۔" ایک لمحے کو رک کر اس نے کہا "وہ آپ نے بسوں مسوں کے پیچھے لکھا ہوا نئیں دیکھا۔ تپڑو ہے تو پاس کرو ورنہ برداش کر۔"

اس کی ذہنی سطح اور سوچ کے معیار کا اندازہ ایک ہی سوال کے جواب میں ہوگیا تھا۔ میں نے ذرا سخت لہجے میں کہا "گل بادشاہ' میں تپڑ کی بات نہیں' حق کی بات کر رہا ہوں۔"

"حق تو بنتا ہے۔" وہ آنکھیں سکیڑ کر بولا "مگر اس دنیا میں حق ملتا نئیں وکیل صیب چھیننا پڑتا ہے۔ جیسا ام نے چھینا اے۔"

میں نے جج کی جانب مڑتے ہوئے کہا "یور آنر' ملزم کے فراڈ کی قلعی کھل چکی ہے۔ اس نے معزز عدالت کے سامنے پے در پے جھوٹ بولے ہیں اور کئی بار اپنے بیان کو بھی تبدیل کیا ہے۔ وہ ایک غاصب' ظالم اور دھوکے باز شخص ہے۔ میرے موکل کے ساتھ ایک طویل عرصے سے زیادتی بلکہ ظلم ہو رہا ہے۔ اب کوئی بات بھی معزز عدالت سے ڈھکی چھپی نہیں ہے۔ میری فاضل عدالت سے درخواست ہے کہ میرے موکل کو انصاف مہیا کیا جائے۔ دیٹس آل یور آنر۔"

اس کے بعد میں..... اپنی سیٹ پر جاکر بیٹھ گیا۔

جج نے وکیل صفائی کی طرف دیکھتے ہوئے "وکیل صاحب! آپ اپنے موکل کی

حمایت میں کچھ کہنا چاہتے ہیں؟"

"اب کچھ کہنے سننے کی گنجائش ہی کہاں ہے جناب عالی۔" وہ بے بسی سے کندھے جھٹک کر بولا۔

جج نے اپنا رُوئے سخن ملزم حاجی ہدایت اللہ کی جانب موڑا اور یہی سوال اس سے بھی پوچھا۔ حاجی صاحب کے تعزیئے ٹھنڈے ہوچکے تھے۔ وہ بس منہ میں منمنا کر رہ گئے۔

جج نے فیصلے کے لئے تاریخ دے کر عدالت برخاست کردی۔ آئندہ پیشی پانچ روز بعد تھی۔

○

ہمارا کیس بہت واضح تھا۔ ساری بات جج کی سمجھ میں آچکی تھی۔ اب بس رسمی سی عدالتی کارروائی باقی تھی۔ اگلی پیشی پر جج نے میرے موکل کے حق میں فیصلہ سنا دیا۔ اس موقع پر جج نے منظور حسین سے خصوصی طور پر پوچھا۔

"مسٹر منظور حسین، آپ اپنی رقم واپس لینا چاہیں گے یا فلیٹ کی الاٹ منٹ؟"

وہ کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے بولا "جناب عالی! میری توبہ۔ میری آنے والی سات نسلوں کی توبہ۔ میں فلیٹ کی الاٹ منٹ سے باز آیا۔ حضور مجھے میری رقم دلوا دیں۔ خدا نے زندگی میں کبھی توفیق دی تو یکمشت ادائیگی کرکے ہی کوئی فلیٹ خریدوں گا چاہے کتنا بھی مہنگا کیوں نہ ہو۔"

جج کرسی عدالت سے اٹھ کر تھوڑی دیر کے لئے اپنے چیمبر میں چلا گیا پھر واپس آکر میرے موکل کی درخواست کے مطابق فیصلہ صادر فرما دیا۔

ہم عدالت سے باہر آئے تو منظور حسین کے چہرے پر دنیا جہان کی خوشیاں رقصاں تھیں جبکہ حاجی ہدایت اللہ کا چہرہ سوگوار انداز میں لٹکا ہوا تھا۔

منظور حسین کے حق میں فیصلہ ہونے کے باوجود بھی حاجی ہدایت اللہ نے رقم کی ادائیگی میں خاصا عرصہ لگا دیا تھا اور اس نے یہ رقم چار قسطوں کی صورت میں ادا کی تھی۔ اس کا واسطہ دن رات قسطوں سے رہتا تھا۔ ایسے معاشرتی ناسوروں کے

بارے میں سوچ کر میں اکثر کڑھتا رہتا ہوں جنھوں نے زندگی بھر لوگوں کی بددعاؤں کے سوا کچھ نہیں لیا۔ ایسے لوگ اپنے کاروبار کو چمکانے کے لئے ہر حد سے گزر جاتے ہیں۔ خدا ہی ان سے سمجھے۔

میرا ذاتی مشاہدہ یہ ہے کہ ایسے قسط خور دھوکے بازوں کی موت بھی قسط وار واقع ہوتی ہے۔

○

# آئینہ خانہ

میں واش روم کے دیوار گیر آئینے کے سامنے کھڑا شیو بنانے میں مصروف تھا۔ میں نے کہیں پڑھا تھا کہ آئینہ ہماری زندگی کی ایک اہم ضرورت بن کر رہ گیا ہے۔ شیشے کا یہ معمولی سا ٹکڑا ایک جانب تو خواتین کے میک اپ میں معاون ہوتا ہے اور دوسری طرف روزانہ شیو بناتے وقت حضرات اسے استعمال میں لاتے ہیں۔ عکس دکھانے میں یہ تھوڑا بہت مبالغہ ضرور کرتا ہے مگر رہتا آئینہ ہی ہے' کبھی حقیقت نہیں بن سکتا۔

میری پیشہ ورانہ زندگی کے مشاہدے اور تجربے نے مجھے جس آئینے سے متعارف کروایا ہے اسے دکھانے سے اکثر خواتین و حضرات برا مان جاتے ہیں۔ دراصل اس آئینے کا منہ ہے اور نہ منہ میں جھوٹ بولنے والی زبان۔ یہ تصور کی آنکھ سے تصویر کے دونوں پہلو اجاگر کرتا ہے۔ اسی نوعیت کا ایک آئینہ انسان کے اندر بھی فٹ ہوتا ہے جو دل کی آنکھوں سے دیکھتا ہے۔ دل میں اگر میل اتر آئے تو آنکھیں بھی دھندلا جاتی ہیں پھر ہر شے دھندلی دھندلی نظر آنے لگی ہے۔ ایسے ہی آئینوں کے بارے میں شاعر نے کہا ہے۔

آنکھ ہو تو آئینہ خانہ ہے دہر
منہ نظر آتے ہیں دیواروں کے بیچ

اچانک فون کی گھنٹی نے مجھے چونکا دیا۔ اس وقت صبح کے سات بجے تھے۔ وہ جنوری کی کوئی ابتدائی تاریخ تھی اور سورج ابھی طلوع نہیں ہوا تھا۔ میں نے شیو کو اُدھورا چھوڑا اور تیسری گھنٹی پر ریسیور اٹھا لیا۔

ہیلو' بیگ صاحب!" ایک شناسا آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ مجھے پہچاننے میں ذرا بھی دیر نہ لگی۔ دوسری جانب میرا ایک دیرینہ دوست مشتاق زبیری بول رہا تھا۔ مشتاق

زبیری شہر کا ایک معزز اور ممتاز بزنس مین تھا۔

"جی زبیری صاحب! خیریت! یہ صبح ہی صبح میری یاد کیسے آ گئی؟"

مشتاق زبیری نے کہا۔ "ویسے تو سب خیریت ہے لیکن میرا ایک یار مصیبت میں پھنس گیا ہے۔ آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔"

"کس قسم کی مدد زبیری صاحب؟"

"جاوید عثمانی کو پولس نے گرفتار کر لیا ہے۔" زبیری صاحب نے بتایا۔ "اسی سلسلے میں آپ کا تعاون درکار ہے۔" زبیری صاحب نے اپنے جس دوست کا ذکر کیا تھا' اس کا نام جاوید عثمانی تھا۔

میں نے پوچھا۔ "معاملہ کیا ہے؟"

"جاوید عثمانی پر اپنے بزنس پارٹنر جلیس احمد کے قتل کا الزام ہے۔"

"یہ کب کی بات ہے؟"

"گزشتہ رات کا واقعہ ہے بیگ صاحب!" زبیری صاحب نے بتایا۔ "ابھی تھوڑی دیر پہلے جاوید کی بیوی نے مجھے فون پر ساری صورتحال بتائی ہے۔ وہ سخت پریشان ہے۔ میں نے اس سے وعدہ کیا ہے کہ کسی بہت ہی قابل وکیل کا بندوبست۔۔۔"

"قطع کلامی کی معافی چاہتا ہوں زبیری صاحب!" میں نے کہا۔ "آپ کے خیال میں آپ کا دوست جاوید عثمانی کیسا آدمی ہے؟ میرا مطلب ہے' کیا آپ کو یقین ہے کہ وہ بے گناہ ہے' قتل اس نے نہیں کیا۔ آپ تو جانتے ہیں زبیری صاحب! میں پوری طرح مطمئن ہونے کے بعد ہی کیس کو اپنے ہاتھ میں لیتا ہوں۔"

"مجھے اچھی طرح معلوم ہے بیگ صاحب!" زبیری صاحب نے پُراعتماد لہجے میں کہا۔ "اگر مجھے رتی برابر شک ہوتا تو میں آپ سے رابطہ نہ کرتا۔ جاوید عثمانی کو میں سال ہا سال سے جانتا ہوں۔ وہ انتہائی شریف اور صلح جو شخص ہے۔ قتل جیسا اقدام اس کے بس کی بات نہیں ہے۔ مجھے سو فی صد یقین ہے کہ جاوید کو کسی گہری سازش میں پھانسنے کی کوشش کی گئی ہے۔"

میں نے پوچھا۔ "جاوید عثمانی کو کس تھانے میں رکھا گیا ہے؟"

زبیری صاحب نے متعلقہ تھانے کا نام بتایا۔ میں نے سوال کیا۔ "آپ جاوید سے

مل چکے ہیں؟"

"ابھی کہاں جناب۔" زبیری صاحب نے جواب دیا۔ "مجھے بھی تھوڑی دیر پہلے ہی اطلاع ملی ہے۔ سب سے پہلے میں نے آپ ہی کو فون کیا ہے۔"

"پھر تو آپ اس واقعے کے بارے میں زیادہ نہیں جانتے ہوں گے؟"

"آپ کا خیال درست ہے لیکن مجھے ایک بات کا یقین ہے کہ جاوید قتل نہیں کر سکتا۔" زبیری صاحب نے کہا۔ "آپ جاوید کی بیوی سے ملاقات کر لیں۔ میں آپ کو اس کے گھر کا پتہ بتا دیتا ہوں اور کہیں تو میں خود بھی آپ کے ساتھ چلتا ہوں۔"

میں نے کہا۔ "اس کی ضرورت نہیں ہے زبیری صاحب! دراصل آج عدالت میں میرے ایک نہایت ہی اہم کیس کی ساعت ہے اس لئے مجھے ذرا جلدی عدالت پہنچنا ہو گا۔ آپ ایسا کریں، دو بجے کے بعد اپنے دوست کی بیوی کو میرے دفتر بھیج دیں۔ میں خود اس سے ساری معلومات حاصل کر لوں گا۔"

"یہ ٹھیک ہے، میں ابھی فون کر کے اسے آپ کے دفتر کا ایڈریس سمجھا دیتا ہوں۔" زبیری صاحب نے جلدی سے کہا۔ "اور بیگ صاحب! فیس کی فکر نہ کیجئے گا۔ وہ آپ کو پوری ملے گی۔ پارٹی کمزور نہیں ہے۔"

"فیس تو خیر میں لوں گا ہی۔" میں نے کہا۔ "لیکن فیس سے زیادہ فکر مجھے کیس کی نوعیت کی ہوتی ہے اور اس کا تعین میں پورا واقعہ سننے کے بعد ہی کر سکوں گا۔ اگر آپ کا دوست واقعی بے گناہ ہے تو پھر سمجھئے کہ کوئی اس کا بال بھی بیکا نہیں کر سکتا۔"

"خدا آپ کی زبان مبارک کرے۔"

دو چار رسمی باتوں کے بعد میں نے ریسیور کریڈل کر دیا اور ادھورے شیو کی تکمیل کیلئے دوبارہ واش روم میں گھس گیا۔

○

روزمرہ کے عدالتی بکھیڑوں سے فارغ ہوتے ہوتے ڈھائی بج گئے۔ میں اپنے دفتر میں پہنچا تو مسز جاوید عثمانی وہاں پہلے سے موجود تھی۔ میری سیکریٹری صبیحہ نے بتایا کہ وہ خاصی دیر سے میرا انتظار کر رہی تھی۔ میں نے اسے اپنے چیمبر میں بلا لیا۔

وہ انتیس تیس سال کی ایک معقول صورت عورت تھی۔ اس نے مجھے اپنا نام فیروزہ بتایا۔ رسمی علیک سلیک کے بعد اس نے پہلے مشتاق زبیری کا حوالہ دیا پھر اپنی آمد کا مقصد بیان کیا۔ وہ خاصی پریشان نظر آ رہی تھی۔ ایک ہی سانس میں وہ اپنی بات کہہ چکی تو میں نے پوچھا۔ "یہ واقعہ کتنے بجے پیش آیا؟"

وہ گلوگیر آواز میں بولی۔ "مجھے تو تھانے والوں نے فون کر کے بتایا تھا۔ گزشتہ رات جب جاوید اپنے وقت پر گھر نہیں پہنچا تو مجھے فکر ہوئی۔ میں نے فیکٹری فون کیا تو پتہ چلا کہ وہ وہاں سے رخصت ہو چکا ہے۔ میں جانتی تھی کہ وہ روزانہ واپسی میں اپنے بزنس پارٹنر جلیس احمد کے پاس کچھ وقت گزارتا ہے پھر گھر آتا ہے۔ عام طور پر وہ دس بجے تک گھر پہنچ جاتا تھا۔ جب ساڑھے دس سے زیادہ ہو گئے تو میری پریشانی میں اضافہ ہونے لگا پھر گیارہ بجے میری پریشانی دو چند ہو گئی۔ بچے سو چکے تھے۔ میں نے سوچا، جاوید کے دوستوں کو فون کرتی ہوں لیکن اس سے پہلے ہی تھانے سے فون آ گیا۔ جاوید نے مجھ سے بات کی اور بتایا کہ اسے پولیس نے جلیس احمد کے قتل کے الزام میں گرفتار کر لیا ہے۔"

اپنی بات ختم کرتے کرتے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ ٹیکسی کر کے میرے پاس آئی تھی۔ جاوید عثمانی کی گاڑی بھی پولیس کی تحویل میں تھی۔ میں نے فیروزہ سے پوچھا۔ "جب آپ کا شوہر حسب معمول گھر نہیں پہنچا تو آپ کو چاہئے تھا کہ جلیس احمد کے گھر فون کرتیں۔ آپ نے بتایا کہ وہ روزانہ باقاعدگی سے وہاں جاتا تھا؟"

"ہاں، مجھے کرنا تو یہی چاہئے تھا مگر میں ایسا کرنا نہیں چاہتی تھی۔" اس نے الجھا ہوا مختصر سا جواب دیا۔

"اس کی کوئی خاص وجہ؟"

فیروزہ نے بتایا۔ "وجہ جلیس احمد کی بیوی ہے۔ وہ بہت نک چڑھی اور بدتمیز عورت ہے۔ میں اس سے بات کرنا بھی پسند نہیں کرتی۔ جب سے جلیس احمد کو حادثہ پیش آیا ہے، وہ خود تو عضو معطل ہو کر رہ گیا ہے لیکن پورے گھر پر اس کی بیوی نے اپنا منحوس سایہ پھیلا دیا ہے۔ سارے فون وہی اٹینڈ کرتی ہے۔ حتیٰ کہ ملازم کو بھی فون کو ہاتھ لگانے کی اجازت نہیں ہے۔ میری آواز فون پر سنتے ہی وہ فوراً فون بند کر دیتی ہے۔"

مجھے فیروزہ کے جواب پر حیرت ہوئی۔ میں نے استفسار کیا۔ "آپ نے ایسی بھی کیا

دشمنی ہے اس کی؟“

”دشمنی مجھ سے نہیں' جاوید سے ہے۔“ وہ بیزاری سے بولی۔ ”اسی حوالے سے وہ مجھ سے بھی نفرت کرتی ہے۔“

میں نے الجھے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ ”جاوید سے دشمنی! کچھ بات سمجھ میں نہیں آئی۔“

”نیکی کا تو کوئی زمانہ ہی نہیں رہا وکیل صاحب!“ وہ ٹھنڈی آہ بھر کر بولی۔ ”وہ کیا کہتے ہیں 'کر بھلائی' ہو برائی لیکن یہ اپنے جاوید عثمانی صاحب ہیں نا' اس کے دل میں تو ہمدردی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ یہ تو کسی بلی کے بچے کو پریشان نہیں دیکھ سکتا۔ جلیس احمد تو پھر اس کا بزنس پارٹنر تھا۔ دن رات اسی کی فکر کھائے جا رہی تھی۔ میں نے کئی بار سمجھایا بھی مگر وہ میری سنتا ہی کہاں ہے۔ اب اسے اپنی غلطی کا احساس ہو رہا ہے۔ میں صبح تھانے بھی گئی تھی۔ پولیس نے رات اس پر بہت تشدد کیا ہے۔ اس کی حالت خاصی ناگفتہ بہ ہو رہی تھی۔ مجھے تو دیکھ کر رونا آگیا۔“

وہ اپنے شوہر کو آپ کے بجائے تم کہہ کر مخاطب کرنے کی عادی معلوم ہوتی تھی۔ یہ کوئی ایسی قابل اعتراض بات نہ تھی۔ اس کی زبانی مجھے معلوم ہوا کہ وہ سولجر بازار کے علاقے میں رہتے تھے۔ ان کے دو بچے تھے۔ بڑا بیٹا کاشف پانچ سال کا تھا۔ اس سے چھوٹی ایک بیٹی نورین تھی۔ نورین کی عمر دو سال تھی۔ یہ مختصر آسودہ حال خاندان ایک شاندار بنگلے میں رہائش پذیر تھا۔ جلیس احمد کا گھر نرسری میں تھا جب کہ ان کی مشترکہ فیکٹری بلوچ کالونی میں تھی۔ یہ ایک گارمنٹ فیکٹری تھی جس کی مصنوعات جے۔ جے گارمنٹس کے نام سے فروخت ہوتی تھیں۔

میں نے فیروزہ سے پوچھا۔ ”آپ نے ابھی بتایا ہے کہ آپ اپنے شوہر سے تھانے میں ملاقات کر چکی ہیں۔ اس نے اس گرفتاری کے بارے میں کیا بتایا ہے؟“

”جاوید کا خیال ہے کہ اسے سوچی سمجھی سازش کے تحت شکار کیا گیا ہے۔“ فیروزہ نے بتایا۔ ”پولیس نے اس کے قبضے سے وہ پستول بھی برآمد کر لیا ہے جس سے جلیس احمد کو قتل کیا گیا ہے اور پریشانی کی بات یہ ہے کہ وہ پستول جاوید ہی کی ملکیت ہے۔ وہ اپنی حفاظت کے خیال سے ایک پستول ہمیشہ اپنے پاس رکھتا تھا۔ آج کل گاڑیاں چھیننے کے

واقعات بہت زیادہ ہونے لگے ہیں پھر جب سے جلیس احمد کو حادثہ پیش آیا تھا' کیس ڈیلنگ کی ساری ذمے داری بھی جاوید پر آ گئی تھی۔ اس بات کے پیش نظر ہی اس نے ایک پستول خرید لیا تھا۔“

وہ پہلے بھی جلیس احمد کو پیش آنے والے حادثے کا ذکر کر چکی تھی۔ میں نے پوچھا۔ ”جلیس احمد کو کس قسم کا حادثہ پیش آیا تھا؟“

”اس کی گاڑی کو سپرہائی وے پر ایک ٹرک والے نے بری طرح کچل دیا تھا۔“ فیروزہ نے بتایا۔ ”وہ ایک پارٹی سے ضروری ملاقات کرنے حیدر آباد جا رہا تھا۔ قسمت اچھی تھی کہ اس حادثے نے جلیس احمد کی جان نہیں لی مگر وہ ہمیشہ ہمیشہ کیلئے وہیل چیئر کا ہو کر رہ گیا تھا۔ اس کی ریڑھ کی ہڈی پر شدید چوٹ آئی تھی جس کی وجہ سے اس کا نچلا دھڑ مفلوج ہو گیا تھا اور اب تو وہ۔۔۔۔“

وہ اپنی بات ادھوری چھوڑ کر اچانک خاموش ہو گئی۔ میں نے پوچھا۔ ”پولیس نے جاوید عثمانی کو کہاں سے گرفتار کیا؟“

دراصل ابھی تک جاوید عثمانی کی طرف سے میرا ذہن صاف نہیں ہوا تھا۔ پولیس نے اسے ایک ایسے پستول کے ساتھ گرفتار کیا تھا جو اس کی ملکیت تھا اور تھوڑی دیر پہلے اسی پستول سے ایک شخص کا قتل کیا گیا تھا۔ یہ بات بھی مجھے ہضم نہیں ہو رہی تھی۔ لیبارٹری تجزیے کے بغیر یہ بات کس طرح ثابت ہو گئی کہ جلیس احمد کا قتل اسی پستول سے ہوا تھا۔ بہرحال فیروزہ نے مجھے یہی بتایا تھا اور اسی بات کی تصدیق کے لئے میں نے سوال کیا تھا۔

وہ بولی۔ ”جاوید نے مجھے بتایا ہے کہ جب وہ جلیس احمد کے گھر سے نکل کر مین شارع فیصل پر پہنچا تو نرسری کے سگنل کے قریب ایک پولیس موبائل نے اسے گھیر لیا تھا۔“

یہ ایک اور حیرت انگیز انکشاف تھا۔ ہمارے ملک کی پولیس سے اتنی سریع کارکردگی کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی۔ میں نے فیروزہ پر سوالات کی بوچھاڑ کر دی مگر وہ کسی بھی سوال کا واضح اور تسلی بخش جواب نہ دے سکی۔ میں نے اندازہ لگایا کہ وہ میرے پے در پے سوالات سے بوکھلا گئی تھی اور اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کس سوال

کا کیا جواب دے۔ آخر گھبرا کر اس نے کہا۔ "باقی باتیں آپ جاوید سے پوچھ لیں۔ میں اس سے زیادہ کچھ نہیں جانتی۔"

اس کی بات معقول تھی۔ میں نے اسے تسلی دی کہ وہ زیادہ پریشان نہ ہو۔ "آپ بے فکر ہو جائیں۔ میں آج ہی دفتر سے فارغ ہو کر تھانے جاؤں گا۔ جاوید سے ملاقات کے بعد اگر مجھے محسوس ہوا کہ وہ واقعی بے گناہ ہے تو میں اس کی مدد کیلئے اپنی بہترین صلاحیتیں صرف کر دوں گا۔"

وہ تشکر آمیز نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔ "آپ کی فیس کیا ہو گی وکیل صاحب؟"

"فیس کی بات بھی ہو جائے گی۔" میں نے کہا۔ "اس کا فیصلہ میں جاوید سے ملاقات کے بعد کروں گا۔ آپ کل چار بجے کے بعد تشریف لے آئیں اور پریشان ہونے کی قطعی ضرورت نہیں ہے۔ اللہ پر بھروسہ رکھیں، سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

فیروزہ نے مجھے دعائیں دیں اور پر نم آنکھوں کے ساتھ رخصت ہو گئی۔

دفتری مصروفیات سے فارغ ہو کر شام کو میں حسب وعدہ جاوید عثمانی سے ملاقات کرنے متعلقہ تھانے پہنچ گیا۔ اس وقت سورج غروب ہو چکا تھا اور تھانے میں خاصی چہل پہل نظر آ رہی تھی۔ ایس ایچ او تھانے میں موجود نہیں تھا۔ مجھے پتہ چلا کہ وہ کسی ہنگامی سلسلے میں ایس پی آفس گیا ہوا تھا۔ میں نے جاوید عثمانی کے خلاف کاٹی جانے والی ایف آئی آر کی نقل حاصل کی۔ اس کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد میں حوالات میں جاوید عثمانی کے پاس چلا آیا۔

تھانے میں کسی حوالاتی سے ملاقات کرنا کوئی آسان کام نہیں ہوتا اور خاص طور پر کسی وکیل کا ملاقات کرنا اور وہ بھی کسی قتل کے ملزم سے مگر ہم بھی پولیس والوں کی رگ رگ سے واقف ہوتے ہیں اور انہیں رام کرنے کے ایک سو ایک طریقے جانتے ہیں۔ طوعاً" و کرہاً" وہ ہم پر تھوڑی بہت مہربانی کے لئے تیار ہو ہی جاتے ہیں۔ ایس آئی نے مجھے جاوید عثمانی سے پندرہ منٹ کی ملاقات کی "اجازت" دے دی۔ مجھے پتہ چلا کہ تھانے والوں نے آج صبح جاوید عثمانی کو عدالت میں پیش کر کے اس کا پانچ روزہ ریمانڈ حاصل کر لیا تھا۔ ملزم ریمانڈ پر ہو تو تھانے والے کسی کو اس کی ہوا بھی نہیں لگنے دیتے۔ ایسی صورت میں پندرہ منٹ کی مہلت بھی کافی تھی۔

میں حوالات پہنچا تو ایک کانسٹیبل موت کے فرشتے کے مانند میرے سر پر سوار ہو گیا۔ اس کی موجودگی میں کھل کر بات نہیں ہو سکتی تھی۔ میں نے اس سے نجات کا مجرب نسخہ آزمایا۔

میں نے پچاس روپے کا ایک نوٹ اس کی مٹھی میں تھماتے ہوئے کہا۔ "سنتری بادشاہ، آپ کا "مہمان" رات سے بھوکا ہے۔ آپ نے تو جھوٹے منہ بھی اسے نہیں پوچھا ہو گا۔ ذرا اس کیلئے ناشتے کا بندوبست کر دو تو مہربانی ہو گی۔"

اس زمانے میں دس پندرہ روپے میں ٹھیک ٹھاک ناشتے کا انتظام ہو جاتا تھا۔ اس حساب سے تیس پینتیس روپے کی رشوت اس معمولی کانسٹیبل کیلئے کافی تھی۔ اس نے دانت نکال کر خوشی کا اظہار کیا، نوٹ کو پتلون کی جیب میں ٹھونسا اور وہاں سے چلا گیا۔ میں فی الفور جاوید عثمانی کی جانب متوجہ ہو گیا۔

"میرا نام مرزا امجد بیگ ایڈووکیٹ ہے۔" میں نے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ "مشتاق زبیری صاحب نے مجھے آپ پر نازل ہونے والی مصیبت کے بارے میں بتایا تھا اور آج دن میں آپ کی مسز بھی میرے پاس آئی تھیں۔"

جاوید عثمانی کا عمر کا اندازہ میں نے سینتیس اور اڑتیس کے درمیان لگایا۔ وہ ایک عام سی شکل والا شخص تھا اور اپنی وضع قطع سے خاصا معقول نظر آتا تھا۔ اس وقت وہ چوں کہ پولیس کسٹڈی میں تھا اس لئے اس کی حالت خاصی ابتر تھی۔ میں نے ایک ہی نظر میں بھانپ لیا کہ پولیس نے گزشتہ رات اس کی خوب "خاطر داری" کی تھی۔ اس کے چہرے پر اداسی کھنڈی ہوئی تھی اور آنکھوں میں مایوسی کی پرچھائیاں جھلک رہی تھیں۔

خاصی دیر خاموش رہنے کے بعد اس نے کہا۔ "وکیل صاحب! میں بالکل بے قصور ہوں۔ میں نے جلیس احمد کو قتل نہیں کیا۔"

"صرف آپ کے کہنے سے یہ بات نہیں بنے گی مسٹر جاوید عثمانی۔" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے نرم لہجے میں کہا۔ "عدالت میں ہر چیز کو ثابت کرنا پڑتا ہے۔ ایف آئی آر کی رپورٹ سراسر آپ کے خلاف جاتی ہے۔ چند معزز افراد نے فائرنگ کی

آواز سنی تھی اور آپ کو جائے واردات سے فرار ہوتے ہوئے بھی دیکھا تھا۔"

وہ خواب ناک لہجے میں بولا۔ "میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے، یہ میرے ساتھ ہو کیا رہا ہے؟"

"آپ کی وائف بتا رہی تھی کہ یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ قتل آپ کے ذاتی پستول ہی سے کیا گیا ہے۔ بعد ازاں جب آپ کو گرفتار کیا گیا تو وہ پستول آپ کے پاس سے برآمد بھی ہو گیا۔ کیا پستول کا لیبارٹری ٹیسٹ ہو چکا ہے یا یہ محض پولیس کا قیاس ہے؟"

"لیبارٹری ٹیسٹ کے بارے میں تو میں کچھ نہیں جانتا البتہ پولیس والوں کا خیال یہی ہے کہ قتل میرے پستول ہی سے ہوا ہے۔" جاوید عثمانی نے بتایا۔ "جب پولیس موبائل نے گھیر کر مجھے گرفتار کیا اور میری جامہ تلاشی لی گئی تو میرے کوٹ کی جیب سے وہ پستول برآمد ہو گیا تھا حالانکہ مجھے اچھی طرح یاد ہے، میں نے وہ پستول اپنی گاڑی کے ڈیش بورڈ میں رکھا تھا۔"

یہ ایک اہم انکشاف تھا۔ میں نے پوچھا۔ "جب آپ نے پستول کو ڈیش بورڈ میں رکھا تھا تو پھر وہ آپ کی جیب میں کیسے پہنچ گیا؟"

"میں خود حیران ہوں۔" وہ کمزور سی آواز میں بولا۔ "پولیس والوں نے مجھے گرفتار کرتے وقت میری گاڑی کی بھی تلاشی لی تھی۔ مجھے تو لگتا ہے کہ انہوں نے ہی کوئی گڑبڑ کی ہو گی۔"

اس نے ایک کمزور جواز پیش کیا تھا۔ میری تسلی ہوئی۔ میں نے استفسار کیا۔ "جب آپ کو گرفتار کیا گیا تو اس وقت یقیناً آپ مقتول جلیس احمد کے گھر سے آ رہے تھے۔ موقع پر موجود گواہوں نے آپ کو جلیس احمد کے گھر سے اندھا دھند روانہ ہوتے ہوئے دیکھا تھا اور اس سے قبل انہوں نے گھر کے اندر سے فائرنگ کی آواز بھی سنی تھی۔ ایف آئی آر کے مطابق موقع پر موجود افراد نے دو فائروں کی آواز سنی تھی پھر جب پولیس افسر نے آپ کا پستول چیک کیا تو اس کے میگزین سے واقعی دو گولیاں چلی ہوئی تھیں۔ ایسی صورت میں آپ کی ذات کو شک سے بالاتر نہیں سمجھا جا سکتا۔ آپ اس سلسلے میں کیا کہتے ہیں؟"

"پولیس والے بھی اسی بنیاد پر مجھے قاتل ثابت کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔" چند لمحے سوچنے کے بعد اس نے جواب دیا۔ "انہوں نے گزشتہ رات مجھے بری طرح مارا پیٹا تھا۔ یہ لوگ مجھ سے اقبالی بیان حاصل کرنا چاہتے تھے۔ ایک اے ایس آئی رات مجھ سے کہہ رہا تھا کہ اگر میں کسی طرح دو لاکھ روپے کا بندوبست کر لوں تو وہ نرم کیس بنائیں گے۔ اس طرح میں پھانسی سے بچ جاؤں گا اور مجھے محض دو تین سال کی سزا ہو گی۔"

"یہ پولیس والوں کے پرانے ہتھکنڈے ہیں۔" میں نے کہا۔ "آپ نے ابھی تک پولیس والوں کو کوئی رقم وغیرہ دی تو نہیں؟"

"نہیں جناب۔" اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ "نہ تو کوئی رقم دی ہے اور نہ ہی اقبالی بیان دیا ہے۔ مگر جناب، اب تو انہوں نے ریمانڈ حاصل کر لیا ہے۔ مجھ سے اقبال کروانے کیلئے یہ مجھے ادھیڑ کر رکھ دیں گے۔ میں ان کے تشدد کی تاب نہ لا سکوں گا۔ میں نے فیصلہ کیا ہے کہ -- فی الحال میں اقبال جرم کر لیتا ہوں۔ اس طرح ان کے تشدد کا نشانہ بننے سے بچ جاؤں گا۔ بعد میں عدالت میں جا کر اپنا بیان بدل لوں گا۔ میں نے سنا ہے، پولیس تشدد کی وجہ سے دیئے گئے بیان کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ آپ کا کیا مشورہ ہے؟"

"آپ کا فیصلہ خاصا معقول ہے۔" میں نے کہا۔ "ملزم کے اقراری یا انکاری بیان سے زیادہ فرق نہیں پڑتا۔ عدالت حالات و واقعات کا جائزہ لیتی ہے، شہادتوں کو دیکھتی ہے پھر وکلا کی جرح سے جو حقائق سامنے آتے ہیں ان کو مدنظر رکھتے ہوئے کوئی فیصلہ دیتی ہے۔"

جاوید عثمانی نے پوچھا۔ "آپ کا کیا خیال ہے، آپ مجھے رہا کروانے میں کامیاب ہو جائیں گے؟"

"یہ سب کچھ آپ پر منحصر ہے۔" میں نے دو ٹوک انداز میں کہا۔ "میری کامیابی و ناکامی کا دارومدار آپ کی طرف سے فراہم کردہ معلومات پر ہے اور ابھی تک آپ نے مجھے کام کی کوئی بات نہیں بتائی۔ جب تک میں اپنے طور پر مطمئن نہ ہو جاؤں، میں کوئی کیس لیتا ہی نہیں ہوں۔"

"میں آپ کو کس طرح مطمئن کر سکتا ہوں؟"

”حقائق سے آگاہ کر کے۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ”یہ بات تو طے ہے کہ جب آپ مقتول کے گھر سے روانہ ہوئے تو اس وقت وہ قتل ہو چکا تھا اگر جلیس احمد کو آپ نے قتل نہیں کیا تو پھر آپ یقیناً جانتے ہوں گے کہ اس کا قاتل کون ہے؟“

جاوید عثمانی نے کہا۔ ”اگر میں قاتل سے واقف ہوتا تو پولیس کو نہیں بتا دیتا۔ خواہ مخواہ اپنی جان کو مصیبت میں کیوں ڈالتا؟“

میں نے اچانک سوال کیا۔ ”مقتول کے گھر میں کتنے افراد ہیں؟“

جاوید عثمانی نے جواب دیا۔ ”جلیس احمد کی بیوی فرخندہ' فرخندہ کا ایک نام نہاد چچا کلیم الدین اور ایک گھریلو ملازم آفتاب۔“

”ان میں سے کوئی جلیس احمد کو قتل کر سکتا ہے؟“

”میں نے کسی کو اپنی آنکھوں سے تو فائر کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔ ویسے کسی سے کچھ بعید بھی نہیں ہے۔ ان میں سے کوئی بھی مقتول سے مخلص نہیں لگتا۔“

میں نے پوچھا۔ ”جس وقت جلیس احمد کو قتل کیا گیا' آپ کہاں تھے؟“

”میں اس کے سامنے ہی بیٹھا ہوا تھا۔“

میں چونک اٹھا۔ ”کیا مطلب؟“

”مطلب یہ کہ ہم دونوں اس وقت ڈرائنگ روم میں آمنے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ میں ایک صوفے کی پشت سے ٹیک لگائے نیم دراز تھا اور جلیس احمد میرے سامنے وہیل چیئر پر موجود تھا۔“

”اس کے باوجود آپ قاتل کو نہیں دیکھ سکے؟“

”حقیقت یہی ہے۔“

مجھے اس کے الجھے ہوئے جوابات سے کوفت محسوس ہونے لگی۔ میں نے ذرا سخت لہجے میں کہا۔ ”دیکھیں جاوید عثمانی صاحب! اگر آپ واقعی یہ چاہتے ہیں کہ میں آپ کی قانونی مدد کروں اور آپ کو حالات کے اس بھنور سے نکالوں تو پھر یہ گھماؤ پھیراؤ کا انداز ترک کر کے مجھے ساری صورتحال صاف صاف بتائیں۔ ڈاکٹر سے مرض اور وکیل سے جرم نہیں چھپ سکتا۔“

کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد اس نے میرے سوال کے جواب میں ایک طویل داستان سنا دی۔ میں غیر ضروری باتوں کو حذف کر کے اس طولانی داستان کا خلاصہ آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں تاکہ عدالتی کارروائی کے دوران میں آپ کا ذہن کسی الجھن کا شکار نہ ہو اور آپ اس کیس کے پس منظر سے پوری طرح آگاہ ہو جائیں۔ پیش منظر سے لطف اندوز ہونے کیلئے پس منظر سے واقفیت بہت ضروری ہوتی ہے۔

* * *

جے جے گارمنٹس (جلیس' جاوید گارمنٹس) کی بنیاد پانچ سال قبل رکھی گئی تھی۔ جلیس احمد اور جاوید عثمانی نے ایک لاکھ کے سرمائے سے بلوچ کالونی کا ایک بنگلہ کرائے پر لے کر گارمنٹس فیکٹری کھولی تھی۔ شراکت کے اس کاروبار میں جاوید عثمانی نے اکیاون ہزار روپے اور جلیس احمد نے انچاس ہزار روپے ملائے تھے۔ گویا وہ ففٹی ون اور فورٹی نائن پرسنٹ کے پارٹنر تھے۔ ابتدا میں چند مشینیں لگائی گئی تھیں لیکن آنے والے دو سال میں فیکٹری نے بہت تیزی سے ترقی کی اور مشینوں اور ملازمین کی تعداد میں اضافہ ہوا۔ فیکٹری میں کام کرن والے ورکرز میں غالب تعداد عورتوں اور لڑکیوں کی تھی۔ اس کے پیچھے جلیس احمد کی پالیسی کارفرما تھی۔ مقتول جلیس احمد کا خیال تھا اور یہ خیال بڑی حد تک درست بھی تھا کہ مردوں کی بہ نسبت عورتوں میں بغاوت اور سیاست کے جراثیم قدرے کم ہوتے ہیں اور وہ کم تنخواہ پر زیادہ کام کرنے کی بھی اہلیت رکھتی ہیں۔

فیکٹری صحیح معنوں میں دن دونی اور رات چوگنی ترقی کر رہی تھی۔ دونوں کی پارٹنر شپ بڑی مبارک ثابت ہو رہی تھی۔ جلیس احمد اگرچہ عمر میں جاوید عثمانی سے چار چھے سال بڑا ہی تھا مگر ابھی تک وہ غیر شادی شدہ تھا۔ جب کہ جاوید عثمانی نہ صرف شادی شدہ تھا بلکہ ایک بچے کا باپ بھی بن چکا تھا اور عن قریب دوسرے مہمان کی آمد کے آثار بھی پیدا ہو چکے تھے۔ جلیس احمد فطری طور پر خشک اور کم آمیز تھا جس کی وجہ سے عورتوں کی جانب اس کا جھکاؤ نہ ہونے کے برابر تھا۔ شاید اسی سبب اس نے ابھی تک شادی نہیں کی تھی۔

تین سال قبل فیکٹری میں ایک نئی ورکر کا اضافہ ہوا۔ فرخندہ بے مثال حسن و

جمال کی مالک تھی۔ اس کی عمر اس وقت بتیس سال سے تجاوز کر چکی تھی لیکن وہ کسی بھی طور پچیّس سے زیادہ کی دکھائی نہیں دیتی تھی۔ اس کی جسمانی ساخت ایسی تھی کہ بیس سال بعد بھی وہ ایسی ہی رہتی۔ ہلکے گندمی رنگ کے باوجود وہ بلا کی پر کشش اور حسین تھی۔ اس کا شمار ان عورتوں میں ہوتا تھا جو سدا بہار جوانی کی مالک ہوتی ہیں اور پہلی نظر میں دیکھنے والے کو اپنی زلف گرہ گیر کا اسیر بنا لیتی ہیں۔

فرخندہ کی آمد نے فیکٹری میں ایک بھونچال کی سی کیفیت پیدا کر دی تھی۔ اس کی تقرری ایک ٹائپسٹ کی حیثیت سے ہوئی تھی۔ جس دن فرخندہ نے سروس جوائن کی‘ اس کے دوسرے دن سے فیکٹری کے مرد ملازمین کی حالت بھی حیرت انگیز طور پر تبدیل ہو چکی تھی حتیٰ کہ عام مشین مین جو پہلے میلے کچیلے دھبے دار لباس میں نظر آتے تھے‘ اب وہی کام صاف ستھرے کپڑے پہن کر کر رہے تھے۔ تقریباً ہر شخص فرخندہ کی نگاہ ناز کا منتظر اور اس کے التفات کا خواہاں تھا اور اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ فرخندہ مطلقہ تھی۔ ہمارے معاشرے میں ایسی عورت کو عموماً ایک کٹی پتنگ سے زیادہ حیثیت نہیں دی جاتی اور ہر کوئی موقع محل کی تلاش میں رہتا ہے۔

فرخندہ نے خود کو اس طرح لئے دیئے رکھا کہ بیشتر افراد کے حوصلے جواب دینے لگے۔ اب ان کا گزارہ محض ٹھنڈی آہیں بھرنے پر تھا۔ انگور کھٹے ہیں کے مصداق بعض لوگوں کا خیال تھا کہ اس کے شوہر اصغر کمال نے اسے خواہ مخواہ تو طلاق نہیں دی ہو گی‘ آخر اسے کوئی تو عیب نظر آیا ہی ہو گا اپنی بیوی میں ورنہ اتنی خوب صورت بیوی کو بھلا چھوڑنے کا تصور کون کر سکتا ہے۔ ایسی عورت جو نہ صرف حسین ہو بلکہ اس کا ایک دانت سونے کا بھی ہو۔

سونے کے دانت کا بھی عجیب قصہ تھا۔ فرخندہ کے اوپر کے سامنے والے دانتوں میں سے ایک پر سنہری خول چڑھا ہوا تھا۔ فرخندہ کے بقول اس کا شوہر ایک نشے باز شخص تھا۔ جب وہ نشے میں ہوتا تو اسے زدوکوب بھی کرتا۔ ایسی ہی ایک مار پیٹ کے دوران میں اصغر کمال کے ایک گھونسے نے اس کا سامنے کا ایک دانت مجروح کر دیا۔ اس عیب کو چھپانے کیلئے فرخندہ نے اس مضروب دانت پر سنہری خول چڑھوا لیا۔ فرخندہ کے بیان کے مطابق اس کے شوہر نے اسے طلاق نہیں دی تھی بلکہ اس نے خود عدالت سے خلع

حاصل کیا تھا۔ وہ ایسے شوہر کے ساتھ زندگی گزارنے پر تیار ہی نہیں تھی جو دن رات اس کی پٹائی بھی کرتا اور گھر کو چلانے کیلئے معاون بھی ثابت نہ ہوتا ہو۔ ایک ڈیڑھ سالہ اس ازدواجی رفاقت میں گھر کی معیشت کا سارا بوجھ فرخندہ کے کندھوں پر رہا تھا۔ اصغر کمال دن بھر گھر میں پڑا رہتا اور وہ بے چاری دفتروں میں نوکریاں کرتی پھرتی۔

ایک سال کے اندر اندر فرخندہ نے جے جے گارمنٹس میں اتنی ترقی کر لی کہ اسے خواتین کے سلائی کے شعبے کا انچارج بنا دیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی اس کی حیثیت میں بھی نمایاں اضافہ ہوا۔ بہت سے لوگ پہلے اسے آسان شکار سمجھ کر ٹرائی کرتے رہے تھے‘ اب ”میڈم فرخندہ میڈم فرخندہ“ کہتے ان کی زبان نہیں سوکھتی تھی۔

فیکٹری کے معاملات میں فرخندہ کے اثر و رسوخ میں اضافہ ہوا تو ایک نئے کھیل کا آغاز ہوا۔ اس کھیل کو سب سے پہلے جاوید عثمانی نے محسوس کیا۔ فرخندہ کی جلیس احمد میں دلچسپی زیادہ عرصے چھپی نہ رہ سکی۔ فیکٹری میں جگہ جگہ چہ میگوئیاں ہونے لگیں اور ملازمین سرگوشیوں میں ان کے بارے میں باتیں کرنے لگے۔ جاوید عثمانی نے یہ صورتحال دیکھی تو براہ راست ایک روز اپنے پارٹنر سے بات کی مگر جلیس احمد نے بڑی شدومد کے ساتھ تردید کر دی۔

”نہیں یار‘ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔“ جلیس احمد نے سرسری سے لہجے میں کہا۔

جاوید عثمانی نے تھوڑی دیر سوچنے کے بعد کہا۔ ”اگر کوئی ایسی بات ہے تو مجھ سے نہ چھپائیں۔“

”بھلا آپ سے کیا چھپا ہوا ہے؟“ جلیس احمد نے الٹا سوال کر دیا۔

”میرا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا۔“ جاوید عثمانی نے جلدی سے کہا۔ ”میں صرف آپ کا بزنس پارٹنر ہی نہیں بلکہ سچا خیر خواہ بھی ہوں۔ آپ کو یہ زیب نہیں دیتا کہ ایک ورکر۔۔۔ میرا مطلب ہے‘ یہ آپ کے شایان شان نہیں ہے۔ ہمارے ملازمین پر اس سے اچھا تاثر نہیں پڑے گا۔“

جلیس احمد نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔ ”جاوید صاحب! اول تو ایسا کوئی سلسلہ ہی نہیں ہے اور بالفرض اگر ایسا کچھ ہے بھی تو کیا میں اپنے ملازمین کی سوچ کا پابند ہوں کہ وہ میرے بارے میں کیسے تاثرات رکھتے ہیں؟“

”آپ ہرگز اس بات کے پابند نہیں ہیں۔“ جاوید عثمانی نے بات کو ختم کرنے والے انداز میں کہا۔ ”میں نے تو جو محسوس کیا‘ وہ آپ کو بتا دیا۔ باقی آپ اپنا فائدہ نقصان خود بہتر جانتے ہیں۔ آپ مجھ سے بڑے ہیں۔ میں آپ کو بھلا کیا سمجھا سکتا ہوں۔“

”اس عزت افزائی کا شکریہ۔“ جلیس احمد نے خوش دلی سے کہا اور ایک زور کا قہقہہ لگایا۔ جواباً“ جاوید عثمانی بھی ہنسنے لگا۔ گویا یہ بات ہنسی خوشی میں ٹل گئی۔

دوسرے روز سے جاوید عثمانی نے فرخندہ کے رویئے میں اپنے لئے ایک واضح سرد مہری محسوس کی۔ جاوید عثمانی بہرحال اس فیکٹری کا ایک مالک تھا۔ کسی ورکر کی کیا مجال کہ وہ اپنے مالک سے ایسا رویہ ظاہر کرے۔ پہلے تو جاوید عثمانی نے اسے نظرانداز کیا مگر جب فرخندہ اس سے بدستور کھچی کھچی رہی تو وہ سوچنے پر مجبور ہو گیا۔ کافی سوچ بچار کے بعد اس کی سمجھ میں یہی بات آئی کہ ہو سکتا ہے‘ جلیس نے فرخندہ سے اس روز والی گفتگو کا ذکر کر دیا ہو جب جاوید نے جلیس کی فرخندہ میں دلچسپی کی مخالفت کی تھی۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ کسی مناسب موقع پر اپنے بزنس پارٹنر سے بات کرے گا۔“

مناسب موقع کی آمد سے پہلے ہی ایک ایسا واقعہ پیش آگیا کہ جاوید عثمانی کا شک یقین میں بدل گیا۔ فرخندہ نے اپنے کسی دور پار کے چچا کو فیکٹری میں ملازم رکھوا دیا تھا۔ فرخندہ کے چچا کلیم الدین کی تقرری جلیس احمد نے جاوید عثمانی کے علم میں لائے بغیر کی تھی‘ اسی روز لنچ کے وقفے میں جاوید نے جلیس سے پوچھا۔

”جب ایک پیکنگ انچارج موجود ہے تو پھر کلیم الدین کو آپ نے خواہ مخواہ بھرتی کر لیا؟“

جلیس احمد نے دوستانہ لہجے میں کہا۔ ”یار‘ وہ سخت ضرورت مند ہے اس لئے میں نے اسے رکھ لیا۔“

”اس شہر میں سیکڑوں ضرورت مند اور بھی ہوں گے۔“ جاوید عثمانی نے بھی معتدل لہجے میں کہا۔ ”ہم سب کو تو نہیں رکھ سکتے نا۔ آخر ہمیں اپنا حساب کتاب بھی تو دیکھنا ہوتا ہے۔“

”بجا فرمایا عثمانی صاحب!“ جلیس احمد نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔ ”آپ فکر نہ کریں‘ کلیم الدین ہماری فیکٹری پر بوجھ نہیں بنے گا۔“

”کیا مطلب؟“ جاوید نے چونک کر اپنے پارٹنر کی جانب دیکھا۔ ”کیا کلیم الدین بغیر تنخواہ کے کام کرے گا۔ آپ نے ابھی بتایا ہے کہ وہ بہت ضرورت مند ہے۔“

”ہاں‘ میں نے ٹھیک کہا ہے۔“ جلیس احمد نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”وہ واقعی ضرورت مند ہے-- اور اس کی ضرورت میں پوری کروں گا۔ اپنے ذاتی اکاؤنٹ سے۔ فیکٹری کے حساب سے اسے تنخواہ نہیں دی جائے گی اور آپ یہ بات کسی کو نہیں بتائیں گے۔“

اب ساری صورتحال واضح ہو گئی تھی۔ فرخندہ نے اتنی خاموشی سے سیندھ لگائی تھی کہ جلیس احمد جیسا زاہد خشک پوری طرح اس کے شکنجے میں نظر آ رہا تھا۔ فرخندہ کی کنول کٹورا آنکھوں کے بان نے جلیس احمد کو گھائل کر دیا تھا۔ وہ چیز ہی ایسی تھی کہ جنس مخالف کو نہ چاہتے ہوئے بھی اپنی جانب کھینچتی تھی۔ معاملات اس حد تک بڑھ چکے تھے کہ جاوید عثمانی نے اپنے پارٹنر سے اس موضوع پر بحث و تکرار فضول سمجھی اور اس معاملے کی طرف سے خاموشی اختیار کر لی۔ وہ زمانے کی اونچ نیچ سمجھانے کے چکر میں ایک اچھے بزنس پارٹنر کو برگشتہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس کا یہ اعتقاد بن گیا تھا کہ جلیس احمد کے ساتھ ہی شراکت داری اس کی کامیابی کا سبب ہے۔ اگر اس نے تنہا یا کسی اور شخص کے ساتھ مل کر کاروبار کیا تو نقصان اٹھائے گا۔ اب یہ اس کا وہم تھا یا جو کچھ بھی تھا‘ بہرحال گزشتہ چار سال میں جے جے گارمنٹ فیکٹری نے روز افزوں ترقی کی تھی جو کاروبار انہوں نے ایک لاکھ کے سرمائے سے شروع کیا تھا‘ اب اس کی کل مالیت چالیس لاکھ سے تجاوز کر چکی تھی اور کرائے کا وہ بنگلہ جہاں انہوں نے کام کا آغاز کیا تھا‘ اب فیکٹری ہی کی پراپرٹی تھا۔ اس صورت حال کے پیش نظر جاوید عثمانی کا وہم کچھ زیادہ غلط بھی نہیں تھا۔

قصہ مختصر جلیس احمد نے فرخندہ سے شادی کر لی۔ اب وہ مسز جلیس احمد تھی اور فیکٹری والوں کیلئے حقیقی میڈم کا مقام حاصل کر چکی تھی۔ جاوید عثمانی نے ماضی کی ہر بات بھلا کر فرخندہ کو عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھنا شروع کر دیا تھا۔ مگر یہ بات اس نے خاص طور پر نوٹ کی تھی کہ فرخندہ کے رویئے میں اس کیلئے ایک کھچاؤ کی سی کیفیت بدستور قائم تھی۔

شادی کے دو ماہ بعد جلیس احمد کو وہ خوفناک حادثہ پیش آ گیا۔ وہ ایک پارٹی سے ضروری میٹنگ کرنے حیدر آباد جا رہا تھا کہ سپرہائی وے پر ایک ٹرک والے نے اس کی گاڑی کو بری طرح کچل دیا۔ اس کی جان تو بچ گئی مگر زندگی بھر کے لئے وہ مفلوج ہو کر رہ گیا۔ ویسے تو اس کے پورے بدن پر ان گنت چوٹیں آئی تھیں مگر ریڑھ کی ہڈی پر لگنے والی شدید ترین چوٹ سے ہڈی چٹخ گئی تھی اور چند مہرے بھی اپنی جگہ سے کھسک گئے تھے۔ شہر کے مہنگے ترین ہسپتال میں طویل علاج کے بعد وہ ویسے تو بھلا چنگا ہو گیا تھا لیکن اس کا نچلا دھڑ ہمیشہ ہمیشہ کیلئے مفلوج ہو کر رہ گیا تھا۔ اب وہ باپ بننے کے بارے میں خواب میں بھی نہیں سوچ سکتا تھا۔ ایک مستقل معذوری اس کے مقدر میں لکھ دی گئی تھی۔ اس کا اور وہیل چیئر کا ناتا اب زندگی بھر کا تھا۔

جاوید عثمانی نے اپنے بزنس پارٹنر کی طرف سے ایک لمحے کی غفلت نہیں برتی تھی۔ وہ روزانہ فیکٹری سے گھر جاتے ہوئے جلیس احمد کے گھر جاتا۔ گھنٹہ' آدھا گھنٹہ اس کے ساتھ گزارتا۔ اسے کاروبار کے سلسلے میں فکر مند نہ ہونے کی تلقین کرتا۔ اس کی دل جوئی کی ہر ممکن کوشش کرتا۔ دن بھر فیکٹری میں ہونے والی سرگرمیوں کا حال سناتا۔ پارٹیوں سے لین دین کے حسابات اس کے علم میں لاتا اور نہایت ایمان داری کے ساتھ جلیس احمد کے حصے کا منافع اس کو ہر ماہ پہنچا دیتا۔ وہ اپنی دانست میں حق دوستی نبھا رہا تھا لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس کی مصروفیات میں بھی بے پناہ اضافہ ہوتا جا رہا تھا جو کام کچھ عرصے پہلے دو آدمی مل کر سنبھالتے تھے اب وہ اکیلے جاوید عثمانی کو سنبھالنا پڑ رہا تھا۔ اس مسئلے سے نمٹنے کیلئے اس نے جلیس احمد کے سامنے ایک تجویز رکھی۔

"کل ایک نوجوان میرے پاس ملازمت کیلئے آیا تھا۔" ایک رات اس نے جلیس احمد کو بتایا۔ "بی کام کر رکھا ہے اس نے۔ کسی پرائیویٹ فرم میں کام بھی کر چکا ہے۔ سیلز اینڈ پرچیز کا بھی تجربہ رکھتا ہے۔ میں نے سوچا ہے' اسے اپنے ساتھ لگا لیتا ہوں۔ میرا خیال ہے' وہ میرا بہترین معاون ثابت ہو سکتا ہے۔"

"ہوں!" جلیس احمد نے ایک گہری سانس کھینچی۔ کچھ دیر خاموش رہ کر وہ سوچتا رہا پھر گمبھیر لہجے میں گویا ہوا۔ "آئیڈیا تو برا نہیں ہے۔ میں ویسے بھی اب انتظامی امور کے قابل نہیں رہا ہوں۔ آپ کا زیادہ ساتھ نہیں دے سکتا۔ آپ اگر سمجھتے ہیں کہ وہ نوجوان

آپ کیلئے مفید ثابت ہو سکتا ہے تو اسے اپوائنٹ کر لیں مگر میری ایک شرط ہے۔۔"

جلیس احمد نے جملہ ادھورا چھوڑ کر جاوید عثمانی کی طرف دیکھا۔ جاوید عثمانی نے پوچھا۔ "کیسی شرط جلیس صاحب؟"

"شرط یہ ہے کہ آپ کے معاون کو تنخواہ میں دوں گا۔

جاوید عثمانی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "جیسے آپ کی خوشی۔"

جاوید عثمانی بات فائنل کر کے گھر چلا گیا لیکن رات میں جلیس احمد کی **کمبختی** آ گئی۔ اس نے جاوید سے ہونے والی گفتگو فرخندہ کو بتا دی۔ فرخندہ نے اس تجویز پر سخت برہمی کا اظہار کیا اور کہا۔ "آپ بھی کمال کرتے ہیں۔ کتنی آسانی سے آپ اس کی باتوں میں آ گئے۔ اس نے خودغرضی پر مبنی ایک تجویز آپ کے سامنے رکھی اور آپ نے فوراً ہاں کر دی۔"

"مگر اس میں خرابی کی کیا بات ہے؟"

فرخندہ نے پاؤں پٹخ کر کہا۔ "خرابی آپ کے پارٹنر کی نیت میں ہے۔ مجھے تو وہ شخص شروع ہی سے اچھا نہیں لگتا۔"

"فضول باتیں نہ کرو۔ وہ میرا برسوں کا دیکھا بھالا ہے۔"

"آپ کو تو کچھ پتہ ہی نہیں ہے۔ وہ شخص آہستہ آہستہ آپ کے کاروبار پر قبضہ جمانا چاہتا ہے۔ اس لئے اپنے کسی خاص بندے کو آپ کی جگہ لانا چاہتا ہے۔"

جلیس احمد نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ "پہلی بات تو یہ کہ وہ کاروبار میرا نہیں ہے' ہم دونوں کا ہے بلکہ جاوید اکیاون فیصد کا پارٹنر ہے جب کہ میں انچاس فیصد کا۔ دوسرے وہ کسی کو ملازم رکھ رہا ہے' اسے کاروبار میں شریک نہیں کر رہا۔ وہ بس ماہانہ تنخواہ پانے والا ایک ملازم ہو گا جو جاوید عثمانی کے اشاروں پر ناچے گا۔ اس سے زیادہ اس کی کوئی حیثیت نہیں ہو گی۔ تم خواہ مخواہ بدگمانی کو دل میں جگہ نہ دو۔"

"آپ جسے میری بدگمانی کہہ رہے ہیں' کل وہی حقیقت بن کر جب آپ کے سامنے آن کھڑی ہو گی تو آپ کو پتہ چلے گا۔"

"تم کہنا کیا چاہتی ہو؟" جلیس احمد نے سوالیہ انداز میں کہا۔ "آخر تمہیں کس بات کا خدشہ ہے؟"

وہ پینترا بدلتے ہوئے لگاوٹ سے بولی۔ ”میں تو ہر طرح سے آپ کا فائدہ چاہتی ہوں۔ میں کس طرح آپ کو نقصان پہنچتے ہوئے نہیں دیکھ سکتی ہوں۔“

”وہی تو میں بھی پوچھ رہا ہوں۔“ جلیس احمد نے نرم لہجے میں استفسار کیا۔ ”تمہیں کس بات کا اندیشہ ہے مجھے کس طرح نقصان پہنچ سکتا ہے؟“

چند لمحے کی خاموشی کے بعد وہ بولی۔ ”آپ چاہے کچھ بھی کہیں مگر مجھے آپ کا پارٹنرنیت کا کھوٹا لگتا ہے۔ آپ اگر فیکٹری کے معاملات دیکھنے کے قابل نہیں رہے تو باہر سے آدمی لانے کی ضرورت کیا ہے؟“

”پھر کیا کیا جائے؟“

”فیکٹری کا کون سا ایسا معاملہ ہے جس سے میں واقف نہیں ہوں۔ میں سارا کام خوش اسلوبی سے سنبھال سکتی ہوں اور اصولی طور پر بھی مجھے ہی موقع ملنا چاہئے۔“

جلیس احمد نے کہا۔ ”وہ کام تمہارے بس کا نہیں ہے۔ کاروبار کے سلسلے میں اکثرو بیشتر شہر سے باہر بھی جانا پڑتا ہے۔ پورے ملک میں یہ کاروبار پھیلا ہوا ہے۔ طرح طرح کی پارٹیوں سے ڈیل کرنا پڑتا ہے۔ اس کام کیلئے کوئی مرد ہی موزوں ہو سکتا ہے۔“

”چلیں مجھے چھوڑیں لیکن چچا کلیم الدین بھی تو یہ کام سنبھال سکتے ہیں۔“

”نہیں، وہ بہت نالائق ہے۔“ جلیس احمد نے ناگواری سے کہا۔ ”میں نے تمہاری فرمائش پر اسے فیکٹری میں رکھ لیا تھا اور تم اچھی طرح جانتی ہو کہ وہاں اس نے سازشوں کے سوا کچھ بھی نہیں کیا۔ مجبوراً اسے وہاں سے ہٹانا پڑا۔ اب وہ آرام سے گھر میں پڑا ہے۔ اس کی ہر ضرورت پوری ہو رہی ہے۔ اسے اور کیا چاہئے۔ تم بھی اسے فیکٹری کے معاملات سے الگ ہی رکھو تو اچھا ہے۔“

فرخندہ ناراض ہو گئی۔ وہ پوری رات جلیس احمد نے فرخندہ کی ناراضگی دور کرنے میں گزاری۔ فرخندہ کو اپنے حسن جہاں سوز پر غرور تھا اور یہ غرور بے جا نہ تھا۔ وہ بلاشبہ ایک ساحرہ تھی اور جلیس احمد کو اس نے اپنے فسوں میں پوری طرح جکڑ رکھا تھا۔ وہ فرخندہ کی ناراضی افورڈ نہیں کر سکتا تھا۔ وہ جتنا جنس مخالف سے دور دور رہا تھا، قریب آنے کے بعد اب دوری کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا پھر فرخندہ جیسی سدا بہار عورت سے دوری تو اسے موت کے مترادف نظر آتی تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ معذوری کے باوجود بھی فرخندہ نے جلیس احمد کا ساتھ نہیں چھوڑا تھا اور نہ ہی اس کی خدمت میں کوئی کسر اٹھا رکھی تھی۔ اس لئے جلیس احمد بھی اس کا بے دام غلام بنا ہوا تھا۔

اس رات اور آنے والی ہر رات میں فرخندہ نے اپنے بے بہا شباب کا جادو معذور جلیس احمد پر اس طرح چلایا کہ دو ماہ کے اندر اندر وہ اپنے خیالات و نظریات کو یک سر بھلا بیٹھا۔ اس کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں مفقود ہو کر رہ گئیں۔ کاروباری سوجھ بوجھ زنگ آلود ہو گئی۔ اب وہ فرخندہ کی آنکھوں سے دیکھتا تھا، اسی کے کانوں سے سنتا تھا، اسی کے ذہن سے سوچتا تھا اور اس کے منہ میں فرخندہ ہی کی زبان بولتی تھی۔ گویا فرخندہ نے اس کی بولتی بند کر دی تھی۔ فرخندہ قدم قدم طے کرتے ہوئے منزل تک آ پہنچی تھی۔

پھر ایک رات جلیس احمد نے بزنس پارٹنر کو ورطہ حیرت میں ڈال دیا۔ اس نے جاوید عثمانی سے کہا۔ ”میں یہ پارٹنرشپ بزنس ختم کرنا چاہتا ہوں۔“

”کیا کہہ رہے ہیں آپ؟“ جاوید عثمانی ہکا بکا رہ گیا۔

”میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔“ جلیس احمد نے تھکے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ ”اب میں اس ملک میں نہیں رہنا چاہتا۔ میں نے کسی یورپی ملک میں سیٹل ہونے کا فیصلہ کر لیا ہے، اس لئے میں چاہتا ہوں کہ اب حساب کتاب کر لیا جائے۔“

ابھی تک جاوید عثمانی کی حیرت دور نہیں ہوئی تھی۔ اس نے کہا۔ ”آپ سراسر گھاٹے کا سودا کر رہے ہیں جلیس صاحب! شاید آپ کو اندازہ نہیں ہے کہ آپ کتنی بڑی بات کہہ رہے ہیں۔“

”میں نے سارے اندازے لگانے کے بعد ہی یہ فیصلہ کیا ہے۔“

جاوید عثمانی نے ہمدردی کے تاثرات چہرے پر سجاتے ہوئے کہا۔ ”جلیس صاحب! آپ کی معذوری نے آپ کو بہت دلبرداشتہ کر دیا ہے۔ میرا خیال ہے، آپ دو چار ماہ کیلئے یورپی دورے پر چلے جائیں۔ مجھے یقین ہے، آپ پر طاری قنوطیت دور ہو جائے گی۔“

”بھائی آپ دو چار ماہ کی بات کر رہے ہیں۔ میں نے تو مستقلاً“ وہاں شفٹ ہونے کا فیصلہ کر لیا ہے۔“ جلیس احمد نے پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

”یہ آپ کا آخری فیصلہ ہے؟“

”قطعی اور حتمی۔“

جاوید عثمانی نے کہا۔ ”میں آپ کو اس فیصلے سے روک تو نہیں سکتا لیکن ایک ہمدرد اور مخلص دوست ہونے کے ناتے ایک قیمتی مشورہ ضرور دوں گا۔“

”وہ کیا؟“ جلیس احمد نے استفسار کیا۔

جاوید عثمانی نے کھنکھار کر گلا صاف کیا اور بولا۔ ”آپ اس بزنس کو ختم نہ کریں۔ میرے سلیپنگ پارٹنر بن جائیں۔ اس طرح آپ کے منافع کی شرح تو کم ہو جائے گی مگر آپ کی ایک مستقل آمدنی کا ذریعہ موجود رہے گا۔ آپ اگر پاکستان میں نہیں رہنا چاہتے تو شوق سے کسی یورپی ملک میں منتقل ہو جائیں۔ اس سلسلے میں اگر آپ کو کسی قسم کی مالی ضرورت پیش آئے تو میں حاضر ہوں۔ آپ مجھ سے قرض لے لیں۔ آپ کا سرمایہ کاروبار میں محفوظ رہے گا۔ اس قرض کی واپسی کیلئے ہم کوئی لائحہ عمل طے کر لیں گے۔“

یہ ایک انتہائی معقول تجویز تھی۔ اس سے یہ بات بھی ثابت ہوئی کہ جاوید عثمانی واقعی جلیس احمد سے مخلص تھا مگر دوسری جانب جلیس احمد تو ایک ڈمی کے مانند ایکٹ کر رہا تھا۔ فیصلہ کرنے والی ہستی تو کوئی اور ہی تھی۔ جلیس احمد ایک مہرے سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا تھا۔ جاوید عثمانی نے اپنی پرخلوص کوششیں ترک نہیں کیں اور باقاعدگی سے جلیس احمد کے گھر جاتا رہا مگر دوسری جانب یہ حال تھا کہ زمین جنبد نہ جنبد گل محمد۔

پھر ایک رات وہ واقعہ پیش آگیا جس کے نتیجے کے طور پر جاوید عثمانی اس وقت حوالات کے ٹھنڈے فرش پر اکڑوں بیٹھا مجھے اپنی بپتا سنا رہا تھا۔

* * *

جاوید عثمانی نے اپنی داستان مصیبت کو سنسنی خیز موڑ پر لا کر روکا تو میں نے پوچھا۔

”آپ اچھی طرح سوچ کر مجھے بتائیں کہ آٹھ جنوری کی شب کیا واقعہ پیش آیا تھا؟“

آٹھ جنوری وہی تاریخ تھی جب جاوید عثمانی کے پستول سے جلیس احمد کا قتل ہوا تھا۔ ہماری اس گفتگو کے دوران میں، ہماری نگرانی پر مامور کانسٹیبل جاوید عثمانی کیلئے ناشتہ چھوڑ گیا تھا۔ میں اس کی مٹھی پہلے ہی گرم کر چکا تھا اس لئے وہ مہربہ لب تھا اور خاصے فاصلے پر کھڑے ہو کر اپنے ”فرائض منصبی“ ادا کر رہا تھا۔

جاوید عثمانی نے وقوعہ کی تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔ ”ہم دونوں آمنے سامنے بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ موضوع گفتگو کاروبار ہی تھا۔ جلیس احمد کسی بھی طرح میری بات ماننے کو تیار نہیں تھے۔ وہ شدید ذہنی تناؤ کا شکار نظر آتے تھے اور مسلسل سگریٹ پھونک رہے تھے۔ ہمارے درمیان موجود ٹیبل پر رکھی ہوئی ایش ٹرے سگریٹ کی باقیات سے بھر چکی تھی۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے ہم نے کافی ختم کی تھی۔ میں اس وقت تک اپنے گھر روانہ ہو جاتا تھا مگر اس روز باتوں میں وقت کا احساس ہی نہیں ہوا اور دس بج گئے۔ اس بات میں کوئی شک نہیں کہ اگر جلیس احمد کاروبار ختم کرتے تو میرا نقصان ضرور ہوتا۔ جما جمایا کاروبار انتشار کا شکار ہو جاتا لیکن میں اپنے نقصان کو روکنے کے ساتھ ساتھ جلیس احمد کا بھی فائدہ چاہتا تھا۔ میں نے یہ بات اچھی طرح محسوس کر لی تھی کہ شادی کے بعد وہ مفاد پرست عناصر میں گھر گئے تھے اور میں انہیں اس گھیراؤ سے نکالنا چاہتا تھا۔“

ایک لمحے کو رک کر اس نے سانس لی پھر سلسلہ کلام کو جاری رکھتے ہوئے بولا۔

”میں نے دس بجے اٹھنے کا ارادہ ظاہر کیا تو جلیس نے اصرار کیا کہ ایک ایک کافی اور ہو جائے۔ میں نے موسم کی مناسبت سے ان کا دل توڑنا مناسب نہ سمجھا اور دوبارہ صوفے کے پشتے سے ٹیک لگا کر نیم دراز ہو گیا۔ جلیس احمد نے ملازم لڑکے کو بلا کر مزید کافی لانے کا حکم دیا۔ وہ استعمال شدہ کافی مگ اٹھا کر ڈرائنگ روم سے چلا گیا۔“

جاوید عثمانی نے مختصر توقف کر کے جھرجھری لی اور پھر اپنی بات کو جاری رکھتے ہوئے بتایا۔ ”اسی وقت مجھے اپنی پشت پر دو دھماکے سنائی دیئے۔ اس کے ساتھ ہی جلیس احمد کے جسم کو دو جھٹکے لگے اور وہ وہیل چیئر پر ایک جانب لڑھک گئے۔ اگلے ہی لمحے لائٹ چلی گئی۔ لائٹ جانے سے پہلے یہ بات میری سمجھ میں آچکی تھی کہ جلیس احمد پر دو فائر کئے گئے تھے اور فائر کرنے والا میرے عقب میں کہیں موجود تھا۔

گھر میں اندھیرا ہوتے ہی فرخندہ کی دل خراش چیخ میری سماعت سے ٹکرائی۔ وہ چیختی چلاتی ہوئی ڈرائنگ روم کی جانب آ رہی تھی۔ اس وقت تک میں بھی ڈرائنگ روم کے اندرونی دروازے پر پہنچ چکا تھا۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی وہ مجھ سے چمٹ گئی۔ اس نے بڑی مضبوطی سے مجھے اپنے بازوؤں میں جکڑ لیا اور چیخ چیخ کر فریاد کرنے لگی۔ ”چچا کلیم، جلدی آئیں۔ دیکھیں اس مردود نے کیا کر دیا۔ مار دیا جلیس احمد کو۔ جان لے لی میرے شوہر کی۔“

"اسی وقت لائٹ آ گئی۔ میں نے جلیس احمد کی طرف دیکھا۔ ایک ہی نظر میں مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ مر چکے تھے۔ ان کی پیشانی اور سینے کا لباس خون آلود تھا۔ میں اس ناگہانی افتاد سے بری طرح گھبرا گیا تھا۔ فوری طور پر میرے ذہن میں خیال ابھرا کہ مجھے یہاں سے چلا جانا چاہئے حالانکہ۔۔ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا۔ اس طرح میری ذات اور زیادہ مشکوک ہو جاتی لیکن اس وقت میرے چودہ طبق گل ہو چکے تھے۔ ذہن سوچنے سمجھنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ فرخندہ کا چچا کلیم الدین اور گھریلو ملازم آفتاب وہاں پہنچتے، میں نے فرخندہ کو ایک زور دار جھٹکا دے کر خود سے الگ کیا اور گھر سے باہر نکل آیا۔ جس وقت میں اپنی گاڑی میں بیٹھ کر وہاں سے روانہ ہو رہا تھا تو میں نے دیکھا، فائرنگ کی آواز سن کر کچھ پڑوسی باہر نکل آئے تھے مگر میں نے کسی کی پرواہ نہیں کی اور گاڑی ایک جھٹکے سے آگے بڑھا دی۔"

"اور پھر تھوڑی ہی دیر میں پولیس موبائل نے آپ کو گھیر کر گرفتار کر لیا۔" اس کی بات ختم ہوئی تو میں نے کہا۔

اس نے بتایا۔ "دراصل وہ پولیس موبائل اس وقت اپنے معمول کے گشت پر تھی۔ اب اسے اتفاق سمجھیں کہ جب میری گاڑی ان کے پاس سے گزری تو وہ میری ڈرائیونگ کے انداز سے شک میں پڑ گئے۔ فائرنگ کی آواز سن کر کچھ پڑوسی تو گھروں سے نکل ہی آئے تھے۔ جلیس احمد کے گھر کے سامنے ایک جنرل اسٹور ہے وہاں بھی اس وقت چند لوگ جمع تھے اور فائرنگ کی آواز سن کر اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔ پولیس موبائل والوں نے ان لوگوں سے صورتحال کی وضاحت چاہی تو انہیں میرے بارے میں بتایا گیا۔ اس وقت موبائل میں ایک اے ایس آئی اور چار کانسٹیبل موجود تھے۔ اے ایس آئی نے ڈرائیور کو حکم دیا کہ فوراً میرا تعاقب کیا جائے پھر انہوں نے نرسری کے سگنل پر مجھے روک لیا۔ ان میں سے بہت سی باتیں مجھے پولیس والوں کی زبانی معلوم ہوئی ہیں۔ الغرض وہ مجھے گھیر کر واپس جلیس احمد کے گھر لے آئے۔ اس وقت تک فرخندہ نے مقامی تھانے میں فون کھڑکا دیا تھا پھر دیکھتے ہی دیکھتے ایک اور پولیس موبائل وہاں پہنچ گئی۔ مجھے گرفتار کیا جا چکا تھا۔ میرے پاس آلہ قتل بھی برآمد ہو چکا تھا۔ نصف شب تک پولیس اپنی کارروائی میں مصروف رہی پھر مجھے تھانے میں لا کر حوالات میں بند کر دیا گیا۔"

اس کے علاوہ بھی جاوید عثمانی نے مجھے چند باتیں ایسی بتائیں کہ مجھے اس کی بے گناہی کا یقین ہو گیا۔ ان باتوں کا ذکر بعد میں عدالتی کارروائی کے دوران میں کیا جائے گا۔ میں نے وکالت نامے پر ضروری اندراج کرنے کے بعد اس کے دستخط کروائے اور دو چار ضروری باتیں اسے سمجھانے کے بعد ایس ایچ او کے کمرے میں آ گیا۔ ایس ایچ او اس وقت تک واپس آ چکا تھا اور اپنی سیٹ پر موجود تھا۔

مجھ پر نظر پڑتے ہی بولا۔ "وکیل صاحب! کچھ ہمارے لئے بھی چھوڑ دیں۔ ابھی کچھ دن اسے ہمارا مہمان بھی رہنا ہے۔ سب کچھ آپ ہی نچوڑ کر لے گئے تو ہم تو ہاتھ ملتے رہ جائیں گے۔"

میں نے کہا۔ "فکر نہ کریں تھانے دار صاحب! آپ کو زیادہ۔۔ بلکہ بالکل محنت نہیں کرنا پڑے گی۔ ملزم اقرار جرم کرنے کیلئے تیار ہے۔"

"جی، کیا فرمایا آپ نے؟" ایس ایچ او نے آنکھیں سکوڑ کر مجھے دیکھا پھر پوچھا۔ "اگر وہ اقبالی بیان دینے کو تیار ہے تو پھر آپ اتنی دیر سے اس کے ساتھ کیا کر رہے تھے؟"

میں چہرے پر مایوسی کے تاثرات سجاتے ہوئے کہا۔ "اسے سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا مگر لگتا ہے، وہ خود ہی اپنی جان کا دشمن بنا بیٹھا ہے۔ کوئی اس کیلئے کیا کر سکتا ہے۔"

ایس ایچ او اندرونی خوشی کو دبانے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔ "آپ کی فیس کا کیا ہو گا جناب، آپ کا تو خاصا نقصان ہو جائے گا۔"

میں نے اس کے لہجے کے طنز کو سمجھ گیا۔ میں نے جواب دیا۔ "اس پیشے میں فائدہ نقصان تو ہوتا ہی رہتا ہے۔ تھانیدار صاحب! صرف آپ لوگوں کا ڈپارٹمنٹ ایسا ہے جس میں نقصان کبھی نہیں ہوتا، ہمیشہ فائدہ ہی ہوتا ہے۔ وہ کیا کہتے ہیں کہ پانچوں گھی میں۔۔"

"اور سر کڑاہی میں!" ایس ایچ او نے میرا جملہ مکمل کر دیا۔ "آپ لوگوں کو تو یہی نظر آتا ہے کہ ہم بڑے عیش میں ہیں مگر قبر کا حال، مردہ ہی جانتا ہے۔ چوبیس گھنٹے ہماری جان سولی پر چڑھی رہتی ہے۔" ایک لمحے کے توقف سے اس نے اضافہ کیا۔ "ویسے مجھے آپ کے نقصان کا دلی افسوس ہے۔"

"اس ہمدردی کا شکریہ۔" میں نے اپنے لہجے میں اداسی بھرتے ہوئے کہا۔ "ویسے

اس کیس میں زیادہ جان نہیں ہے۔ حالات و واقعات ملزم کی مخالفت میں جاتے ہیں۔ مجھے نہیں امید، وہ بچ سکے گا اور سب سے بڑی بات یہ کہ ملزم کو خود اپنے بچاؤ سے کوئی دلچسپی نہیں ہے پھر اس کے خلاف شہادتیں بڑی مضبوط ہیں۔ کون کون سے گواہوں کو پیش کر رہے ہیں آپ؟"

وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ میرے حربے کو تاڑ گیا تھا۔ بہت محتاط لہجے میں بولا۔ "جب آپ یہ کیس لے ہی نہیں رہے تو پھر آپ کو گواہوں سے کیا مطلب؟"

میں نے چالاکی سے کہا۔ "بس ایسے ہی پوچھ رہا تھا۔"

وہ ایک کائیاں شخص تھا، آنکھیں ماتھے پر رکھ کر نہایت ہی روکھے پھیکے انداز میں بولا۔ "ابھی تو ملزم ریمانڈ پر ہے۔ جب تفتیش مکمل ہو جائے گی تو چالان عدالت میں پیش کر دیا جائے گا۔"

میں سمجھ گیا کہ وہ میری طرف سے ہوشیار ہو گیا تھا لہٰذا اس سے کام کی کوئی بات معلوم نہیں کی جا سکتی تھی اس لئے میں وہاں سے چلا آیا۔

دوسرے روز حسب وعدہ مسز جاوید عثمانی مقررہ وقت پر میرے پاس آئی تو میں نے اسے بھرپور تسلی دی اور یقین دہانی کرائی کہ اس کا شوہر باعزت بری ہو جائے گا۔ اس نے میری مطلوبہ فیس ادا کی۔ میں نے اسے فیس کی ادائیگی کی رسید دی۔ ایک دو ضروری کاغذات پر اس کے دستخط لئے، اس کے بعد وہ رخصت ہو گئی۔

اس کے جانے کے بعد میں نے مشتاق زبیری کو فون کیا۔ اسے اب تک کی کارروائی کے بارے میں بتایا پھر تعاون کی درخواست کی۔ "زبیری صاحب! کچھ مدد آپ کو میری بھی کرنا ہو گی۔"

"میں جاوید عثمانی کے سلسلے میں آپ کی ہر طرح کی مدد کیلئے تیار ہوں۔" مشتاق زبیری نے خوش دلی سے کہا۔ "آپ حکم کیجئے بیگ صاحب!"

میں نے جلدی سے کہا۔ "حکم نہیں، عرض ہے جناب۔ دراصل مجھے ایک شخص کے بارے میں ضروری معلومات درکار ہیں اور یہ کام آپ سے بہتر اور کوئی نہیں کر سکتا۔ آپ وسیع تعلقات کے مالک ہیں۔ آپ کیلئے کوئی مشکل نہیں ہو گی۔ آپ اپنے کسی بھی آدمی سے یہ کام بہ آسانی کروا سکتے ہیں۔"

"اس شخص کا نام بتائیں؟"

میں نے بتایا۔ "اس کا نام کلیم الدین ہے اور وہ مقتول جلیس احمد کا چچا سسر ہے۔"

"کچھ مزید جغرافیہ بتائیں گے بیگ صاحب؟"

"وہ ان دنوں بلکہ کافی عرصے سے جلیس احمد کے گھر پر ہی رہ رہا ہے۔ اس کیس میں، اس کی ذات میری نظر میں خاصی اہمیت رکھتی ہے۔"

مشتاق زبیری نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ "آپ بے فکر ہو جائیں بیگ صاحب! سمجھیں آپ کا کام ہو گیا۔"

اور میں واقعی بے فکر ہو گیا۔

* * *

پولیس نے ریمانڈ کی مدت کے دوران میں تفتیش مکمل کر کے چالان عدالت میں پیش کر دیا۔ آئی او (تفتیشی افسر) ایک اے ایس آئی تھا۔

ابتدائی چند پیشیاں عدالت کی تکنیکی کارروائیوں کی نذر ہو گئیں۔ پولیس اور عدالت کے ضابطے کی کارروائیاں اس قدر سست اور بور ہوتی ہیں کہ ان صفحات پر ان کا بیان قارئین کے ساتھ زیادتی ہو گی۔ پھر بعض اوقات دو پیشیوں کے درمیان کئی کئی ماہ کا وقفہ ہوتا ہے۔ قارئین کی دلچسپی کو مدنظر رکھتے ہوئے میں ابتدائی سماعت کا ذکر حذف کر کے براہ راست گواہوں کے بیانات اور ان پر ہونے والی جرح و قدح کا احوال آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں، البتہ اتنا بتاتا چلوں کہ ابتدائی سماعت کے دوران میں، میں نے جاوید عثمانی کی ضمانت کرانے کی بھرپور کوشش کی تھی مگر مجھے اس میں کامیابی نہیں ہو سکی۔

مقدمے کی باقاعدہ سماعت کوئی چار ماہ بعد ہوئی۔ جج نے فرد جرم پڑھ کر سنائی۔ میرے موکل ملزم جاوید عثمانی نے صحت جرم سے انکار کر دیا۔ استغاثہ کی جانب سے کل نو گواہوں کی فہرست عدالت میں پیش کی گئی جن میں دو پڑوسی، ایک جنرل اسٹور کا مالک، دو گاہکوں کے علاوہ تین گھر کے افراد شامل تھے۔ گھریلو افراد میں مقتول کی بیوی فرخندہ،

فرخندہ کا چچا کلیم الدین اور ان کا ملازم آفتاب تھے۔ نواں گواہ ایک پھیری والا تھا جو مونگ پھلی اور چلغوزے وغیرہ اپنی سائیکل پر بیچتا تھا اور اتفاق سے وقوعہ کے وقت وہاں پھیری لگا رہا تھا۔

پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے مطابق مقتول جلیس احمد کی موت آٹھ جنوری کی رات دس اور ساڑھے دس کے درمیان واقع ہوئی تھی۔ میڈیکل ایگزامنر کی رپورٹ بتاتی تھی کہ مقتول کے جسم پر اعشاریہ تین آٹھ کی دو گولیوں کے نشانات پائے گئے تھے۔ ایک گولی مقتول کی پیشانی پر لگی تھی جب کہ دوسری سینے میں عین دل کے مقام پر لگی تھی۔ گولیاں بہت قریب سے چلائی گئی تھیں اور یہی مقتول کی موت کا سبب بنی تھیں۔ ملزم جاوید عثمانی کے پاس سے برآمد ہونے والے پستول کے لیبارٹری ٹیسٹ سے یہ بات ثابت ہو گئی کہ مقتول کو موت کے گھاٹ اتارنے والی گولیاں اسی پستول سے چلائی گئی تھیں۔ پستول کی باڈی اور ٹریگر پر کسی قسم کے فنگر پرنٹس نہیں پائے گئے تھے جس کا واضح مطلب یہ تھا کہ اسے استعمال کرنے والے نے گلووز پہن رکھے تھے یا پھر استعمال کے بعد اس پر سے فنگر پرنٹس صاف کر دیئے گئے تھے۔

یہ صورتحال خاصی حوصلہ شکن تھی۔ ہر بات میرے موکل کے خلاف جاتی تھی مگر میں پوری طرح مطمئن تھا اور پوری تیاری سے آج عدالت پہنچا تھا۔ وکیل استغاثہ میرے چہرے سے جھلکتے اعتماد کو دیکھ کر تذبذب کا شکار تھا' تاہم اس کی دانست میں اس کی پوزیشن خاصی مضبوط تھی۔ کیس پر پوری طرح اسے گرفت حاصل تھی۔

استغاثہ کی جانب سے سب سے پہلے جو گواہ پیش ہوا اس کا نام عبدالغفور تھا۔ وہ لگ بھگ پچاس سال کا ایک خمیدہ کمر بوڑھا تھا اور اپنی گزر اوقات کیلئے راتوں میں پھیری لگا کر مونگ پھلی اور چلغوزے وغیرہ بیچتا تھا۔

عبدالغفور نے سچ بولنے کا حلف اٹھانے کے بعد بیان دیا کہ وہ حسب معمول سائیکل پر پھیری لگا رہا تھا کہ اس نے سامنے والے بنگلے میں گولیاں چلنے کی آواز سنی۔ آواز اتنی اچانک تھی کہ سائیکل کا ہینڈل اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور سائیکل زمین پر گر گئی۔ ہینڈل سے جھولتے ہوئے مختلف اشیاء کے تھیلے بھی نیچے گر گئے اور مونگ پھلی سڑک پر بکھر گئی۔ ابھی وہ سائیکل کو اٹھا کر اسٹینڈ پر لگا بھی نہیں پایا تھا کہ بنگلے کا دروازہ

زوردار آواز کے ساتھ کھلا۔ ایک آدمی تیزی سے باہر آیا اور باہر کھڑی نیلی گاڑی میں بیٹھ کر وہاں سے روانہ ہو گیا۔

عبدالغفور کا بیان ختم ہوا تو وکیل استغاثہ نے اس سے چند سرسری قسم کے سوالات کئے۔ اس نے پوچھا۔ "عبدالغفور صاحب! اچھی طرح سوچ کر بتائیں' آپ نے کتنی گولیاں چلنے کی آواز سنی تھی؟"

"دو گولیاں جناب!" عبدالغفور نے جواب دیا۔

وکیل استغاثہ نے کٹہرے میں کھڑے ملزم جاوید عثمانی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ "کیا آپ کو یقین ہے کہ وقوعہ کی رات یہی شخص بنگلے کا گیٹ کھول کر باہر نکلا تھا اور پھر نیلے رنگ کی گاڑی میں وہاں سے روانہ ہوا تھا؟"

"جی ہاں' مجھے یقین ہے۔ میں نے اسی شخص کو دیکھا تھا۔"

وکیل سرکار نے اسی نوعیت کے ایک دو اور سوال پوچھے پھر اپنی مخصوص جگہ پر جا کر بیٹھ گیا۔ اس کے بعد میں اپنی جگہ سے اٹھا اور گواہ پر جرح کیلئے اس کے کٹہرے کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔ میں نے جرح کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔

"عبدالغفور صاحب! آپ کتنے عرصے سے یہ پھیری والا کام کر رہے ہیں؟"

"کافی عرصے سے جناب!" عبدالغفور نے جواب دیا۔ "کوئی آٹھ دس سال تو ہو ہی گئے ہوں گے۔"

میں نے پوچھا۔ "آپ دن میں بھی یہی کام کرتے ہیں یا صرف رات ہی میں پھیری لگاتے ہیں؟"

"صرف رات میں پھیری لگاتا ہوں اور وہ بھی سردیوں کی راتوں میں جب مونگ پھلی اور چلغوزے وغیرہ کا سیزن ہوتا ہے۔ دن کے وقت میں ایک دکان چلاتا ہوں۔ میری کریانے کی دکان ہے۔"

میں نے اگلا سوال کیا۔ "عبدالغفور صاحب! آپ نے اپنے بیان میں بتایا کہ فائرنگ کی آواز سنتے ہی سائیکل کا ہینڈل آپ کے ہاتھ سے چھوٹ گیا تھا اور سائیکل زمین پر گر گئی تھی۔ معزز عدالت کو بتائیں کہ سائیکل کے ساتھ آپ بھی زمین پر گرے تھے یا نہیں؟"

”میں تو نہیں گرا تھا جناب۔“ عبدالغفور نے الجھن آمیز لہجے میں جواب دیا۔

”کیوں؟“

وکیل استغاثہ نے فوراً مداخلت ضروری سمجھی۔ ”مجھے اعتراض ہے جناب عالی! وکیل صفائی خواہ مخواہ معزز گواہ کو الجھانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ بھلا اس سوال کی کیا تک ہے کہ سائیکل کے ساتھ وہ بھی گرا تھا یا نہیں۔“

میں نے جج کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ ”یور آنر‘ اگر معزز عدالت کو میرے سوال پر اعتراض ہو تو میں معافی چاہتا ہوں۔“

جج نے وکیل سرکار کے اعتراض کو مسترد کرتے ہوئے مجھے جرح جاری رکھنے کی ہدایت کی۔

میں نے گواہ عبدالغفور سے اپنا سوال دہرایا۔ اس نے جواب دیا۔ ”جناب‘ میں اس وقت سائیکل پر سوار نہیں تھا بلکہ میں سائیکل کو ہینڈل سے پکڑ کر اپنے ساتھ ساتھ چلا رہا تھا اس لئے میرے گرنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“

میں نے پوچھا۔ ”عبدالغفور صاحب! آپ کی عمر کتنی ہے؟“

”اگلے سال کے دوسرے مہینے میں پورے پچاس سال کا ہو جاؤں گا۔“

میں نے اس کے چہرے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے سوال کیا۔ ”کیا آپ نے نظر کا چشمہ لگا رکھا ہے؟“

”جی ہاں‘ یہ دو سال قبل لگا ہے مجھے۔“

”عبدالغفور صاحب! آپ نے وکیل استغاثہ کے ایک سوال کے جواب میں پورے وثوق سے یہ بات کہی ہے کہ آپ نے وقوعہ کی رات ملزم جاوید عثمانی کو مقتول کے بنگلے سے نکل کر نیلے رنگ کی گاڑی میں وہاں سے روانہ ہوتے ہوئے دیکھا تھا؟“

”جی ہاں‘ میں نے یہی کہا تھا۔“

میں نے پوچھا۔ ”فائرنگ کی آواز سن کر آپ اتنا گھبرا گئے تھے کہ آپ کے ہاتھ سے سائیکل بھی چھوٹ گئی۔ اس گھبراہٹ کے عالم میں آپ نے جس شخص کو نیلی گاڑی میں روانہ ہوتے دیکھا‘ وہ آپ کو اب تک یاد ہے۔ یہ حیران کن بات نہیں ہے۔ ایسی صورت میں جب کہ آپ نظر کا چشمہ بھی استعمال کرتے ہیں؟“

وکیل استغاثہ نے اپنی جگہ سے اٹھ کر کہا۔ ”آبجیکشن یور آنر‘ وکیل صفائی معزز گواہ کی نیت پر شک کر رہے ہیں۔ اس میں حیرانی کی کیا بات ہے۔ معزز گواہ نظر کا چشمہ لگاتا ہے‘ عقل اور یادداشت کا نہیں۔ اگر کسی شخص کی نظر کمزور ہو جائے تو اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہو گا کہ اس کی یادداشت بھی کمزور ہو گئی ہے۔ میری معزز عدالت سے درخواست ہے کہ وکیل صفائی کو معزز گواہ کو ہراساں کرنے سے روکا جائے۔“

میں نے پوچھا۔ ”عبدالغفور صاحب! اب میں جو سوال آپ سے پوچھنا چاہتا ہوں اس کا تعلق یادداشت سے ہے۔ آپ ذرا سوچ سمجھ کر جواب دیجئے گا۔“ پھر میں نے وکیل مخالف کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”کیوں کہ میرے فاضل دوست اس بات کا دعویٰ کر چکے ہیں کہ اگرچہ آپ کی نظر کچھ کمزور ہے مگر آپ کی یادداشت بڑی مضبوط ہے۔“

عبدالغفور نے پریشان نظروں سے پہلے مجھے اور پھر وکیل استغاثہ کی جانب دیکھا۔ میرے انداز سے وکیل استغاثہ بھی تذبذب کا شکار ہو گیا تھا۔ میں نے گواہ عبدالغفور کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔ ”عبدالغفور صاحب! جس وقت آپ نے فائرنگ کی آواز سنی‘ اس وقت بنگلے میں روشنی ہو رہی تھی یا اندھرا چھایا ہوا تھا؟“

وہ اٹک اٹک کر بولا۔ ”میرا خیال ہے روشنی ہو رہی تھی۔۔ نہیں‘ شاید اندھیرا ہو رہا تھا۔۔۔“

”یعنی آپ پر یقین نہیں ہیں؟“

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اپنی پیشانی کو مسلتے ہوئے کچھ یاد کرنے کی کوشش کرنے لگا۔

میں نے کھنکھار کر گلا صاف کیا پھر وکیل استغاثہ کی جانب رخ موڑتے ہوئے بلند آواز میں کہا۔ ”اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ کی یادداشت ناقابل بھروسہ ہے عبدالغفور صاحب!“ پھر میں نے جج کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”دیٹس آل یور آنر‘ مجھے اور کچھ نہیں پوچھنا۔“

اس کے بعد مقتول جلیس احمد کے دو پڑوسی گواہی دینے آئے۔ عظمت علی اور فرید چغتائی نے کم و بیش ایک جیسا بیان دیا۔ وہ لوگ فائرنگ کی آواز سن کر گھروں سے باہر نکل آئے تھے۔ عام طور پر لوگ فائرنگ کی آواز سن کر گھروں میں دبک جاتے ہیں۔ پہلے

انہوں نے بھی یہی کیا تھا پھر باہر جب لوگوں کا شور بلند ہوا تو وہ بھی تجسّس سے مجبور ہو کر صورت حال جاننے کیلئے باہر نکل آئے۔ دونوں نے اس بات کی گواہی بھی دی کہ انہوں نے ملزم جاوید عثمانی کو اپنی گاڑی میں وہاں سے فرار ہوتے ہوئے بھی دیکھا تھا۔

ان کا بیان ختم ہوا تو وکیل استغاثہ نے باری باری ان سے چند رسمی قسم کے سوالات پوچھے۔ وکیل استغاثہ ان سوالات سے محض عدالت کو یہ باور کرانا چاہتا تھا کہ دونوں گواہ معتبر ہیں اور یہ کہ وہ مُلزم جاوید عثمانی کو اچھی طرح جانتے بھی ہیں۔ میں نے دونوں گواہوں پر زیادہ جرح نہیں کی اور ان سے صرف ایک ہی سوال کیا کہ جب انہوں نے فائرنگ کی آواز سنی تو اس وقت ان کے گھر میں لائٹ تھی یا نہیں۔

عظمت علی نے میرے سوال کے جواب میں بتایا۔ ”جی ہاں‘ اس وقت ہمارے گھر میں لائٹ تھی۔ ہم رات کے کھانے سے فارغ ہو چکے تھے۔ تمام بچے اپنے اپنے کمروں میں جا چکے تھے۔ میں اپنی بیوی کے ساتھ ٹی وی پر ایک انگلش فلم دیکھ رہا تھا کہ اچانک فائرنگ کی آواز آئی۔ میں نے باہر جا کر دیکھنے کا ارادہ کیا لیکن میری بیوی نے مجھے ایسا کرنے سے روک دیا پھر جب باہر سے شور سنائی دینے لگا تو میں گھر سے باہر نکل آیا۔ اس دوران میں ایک لمحے کیلئے بھی ہماری لائٹ نہیں گئی تھی۔“

فرید چغتائی کا جواب بھی عظمت علی سے ملتا جلتا تھا۔ تھوڑی کمی بیشی کے ساتھ اس نے بھی تصدیق کی کہ وقوعہ کے وقت‘ اس سے پہلے یا بعد میں ایک لمحہ کیلئے بھی اس کے گھر کی لائٹ نہیں گئی تھی۔ مجھے اپنے موکل کی زبانی معلوم ہو چکا تھا کہ جب مقتول جلیس احمد پر گولیاں چلائی گئی تھیں تو تھوڑی دیر کیلئے بنگلے میں اندھیرا ہو گیا تھا۔ تاریکی کا وقفہ زیادہ نہیں تھا۔ چند سیکنڈ بعد تمام بتیاں روشن ہو گئی تھیں۔

مقتول جلیس احمد کے گھر کے سامنے ایک جنرل اسٹور تھا۔ پڑوسیوں کی گواہی کے بعد جنرل اسٹور کا مالک طارق محمود استغاثہ کی جانب سے گواہی دینے کیلئے کٹہرے میں آیا۔ اس نے حلف اٹھانے کے بعد بیان دیا کہ فائرنگ کی آواز سن کر وہ جلیس احمد کے بنگلے کی جانب متوجہ ہو گیا تھا اور اس کے ساتھ ہی مقتول کا بنگلا اندھیرے میں ڈوب گیا تھا لیکن کچھ ہی دیر بعد دوبارہ وہاں روشنی ہو گئی تھی اور اس کے بعد اس نے گیٹ سے ملزم جاوید عثمانی کو نکلتے ہوئے دیکھا۔ وہ اپنی گاڑی میں بیٹھ کر جیسے ہی گلی کے نکڑ پر پہنچا‘ ایک پولیس موبائل وہاں آ گئی۔ پولیس والوں نے لوگوں کو ایک جگہ جمع دیکھا تو اس کے بارے میں استفسار کیا۔ انہیں بتایا گیا کہ اس سامنے والے بنگلے میں فائرنگ ہوئی ہے اور ایک شخص نیلی گاڑی میں فرار ہوا ہے۔ پولیس نے چند لمحوں بعد جاوید عثمانی کو گھیر کر گرفتار کر لیا۔

جنرل اسٹور پر موجود دونوں گاہکوں نے بھی طارق محمود جیسا بیان دیا۔ مزمل حسین اور جمیل پاشا نے اس بات کی تصدیق کی کہ انہوں نے فائرنگ کے ساتھ ہی مقتول جلیس احمد کے بنگلے کی لائٹ کو بجھتے اور پھر جلتے ہوئے دیکھا تھا۔

ان گواہوں کے بیانات سے میرا مقصد پورا ہو گیا تھا۔ اِس لئے میں نے ان پر کوئی جرح نہیں کی تھی البتہ وکیل سرکار نے اپنی ذمے داری نبھاتے ہوئے ان سے باری باری یہ سوال ضرور کیا۔

”کیا کٹہرے میں کھڑا ہوا شخص ملزم جاوید عثمانی وہی ہے جسے انہوں نے وقوعہ کی رات نیلی گاڑی میں‘ جلیس احمد کے بنگلے سے فرار ہوتے ہوئے دیکھا تھا؟“

سب کا جواب اثبات میں تھا بلکہ جنرل اسٹور کے مالک طارق محمود نے یہاں تک کہا۔ ”میں جاوید عثمانی کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ وہ روزانہ رات کو یہاں آتا تھا۔ وہ کافی وقت مقتول کے بنگلے میں گزارنے کے بعد وہاں سے جاتا تھا۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ وہ مقتول کا بزنس پارٹنر ہے۔ ان کی گارمنٹ فیکٹری بلوچ کالونی میں ہے۔“

میں نے اپنی جگہ سے اٹھ کر جج کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”جناب عالی! اب تک گواہوں کے بیان اور ان پر ہونے والی جرح سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ پہلے مقتول جلیس احمد کے بنگلے سے فائرنگ کی آواز سنائی دی پھر تھوڑی دیر بعد میرے موکل کو اپنی گاڑی میں بیٹھ کر وہاں سے فرار ہوتے ہوئے دیکھا گیا۔ بنگلے کے اندر کیا حالات پیش آئے‘ اس حقیقت سے کوئی واقف نہیں ہے۔ اس لئے میں اپنی جرح کو اس وقت تک موقوف کرتا ہوں جب تک اندر کا کوئی آدمی گواہی دینے نہیں آتا۔“ ایک لمحے کے توقف کے بعد میں نے اضافہ کیا۔ ”یور آنر‘ میں معزز عدالت سے یہ بات ریکارڈ پر لانے کی استدعا کروں گا کہ جس وقت جلیس احمد کا قتل ہوا‘ تھوڑی دیر کیلئے مقتول کے بنگلے کی لائٹ چلی گئی تھی۔“

جج نے چشمے کے اوپر سے مجھے دیکھتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا پھر اپنے سامنے پھیلے

ہوئے کاغذات پر کچھ لکھنے لگا۔

اس کے ساتھ ہی عدالت کا وقت ختم ہو گیا۔ جج نے ایک ماہ بعد کی تاریخ دے دی۔

* * *

منظر سیشن کورٹ کے اسی کمرے کا تھا اور گواہوں کے کٹہرے میں اس مقدمے کی سب سے اہم گواہ مقتول کی بیوہ مسز فرخندہ کھڑی تھی۔ اس نے سچ بولنے کا حلف اٹھایا پھر ایک طویل جذبات انگیز بیان دیا۔ میں صفحات کی کمی کو مدنظر رکھتے ہوئے فرخندہ کے بیان کا خلاصہ یہاں تحریر کر رہا ہوں۔

"آٹھ جنوری کی رات لگ بھگ دس بجے میں اپنے بیڈ روم میں ٹی وی دیکھ رہی تھی۔ اس وقت جلیس احمد اپنے بزنس پارٹنر جاوید عثمانی کے ساتھ ڈرائنگ روم میں تھے۔ میں نے جلیس احمد کو کئی بار سمجھایا تھا کہ وہ اس بے ایمان اور دھوکے باز شخص سے کنارہ کشی کر لیں کیونکہ جب سے جلیس احمد کو حادثہ پیش آیا تھا اور وہ فیکٹری کے معاملات کو براہ راست دیکھنے کے قابل نہیں رہے تھے‘ اس وقت سے اس مکار شخص نے حسابات میں گڑبڑ شروع کر دی تھی۔ میں نے یہ بات بہت پہلے ہی محسوس کر لی تھی۔ میں جلیس احمد سے شادی سے قبل کافی عرصے ان کی فیکٹری میں کام کر چکی ہوں اور اس دغاباز شخص کو بھی اچھی طرح جانتی ہوں مگر اس نے جانے کیا گھول کر میرے شوہر کو پلا دیا تھا کہ وہ اس کے خلاف کوئی بات سننے کو تیار ہی نہیں تھے۔ بہرحال‘ میں نے کسی نہ کسی طرح جلیس کو تیار کر لیا کہ وہ پارٹنرشپ ختم کر دیں اور کسی یورپی ملک میں سیٹل ہو جائیں مگر اس شخص نے جلیس احمد کو نئے نئے راگ سنانا شروع کر دیئے اور ہر روز آ کر پٹیاں پڑھانے لگا کہ جلیس بزنس میں سے اپنا سرمایہ نہ نکالیں۔

"وقوعہ کی رات بھی دونوں میں اسی موضوع پر بات ہو رہی تھی۔ وہ دونوں ایک ڈیڑھ گھنٹے سے ڈرائنگ روم میں تھے۔ میں نے بوریت سے بچنے کیلئے ٹی وی کھول لیا تھا۔ کیونکہ جب یہ شخص آتا تھا تو بڑی مشکل ہی سے جلیس احمد کی جان چھوڑتا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد نہیں ہے لیکن میرا خیال ہے کہ اس وقت دس بجنے والے تھے جب بیڈ روم کے دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے دروازہ کھولا تو وہاں ہمارا گھریلو ملازم آفتاب کھڑا تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ ڈرائنگ روم میں صاحب اور ان کے دوست میں جھگڑا ہو گیا ہے اور صاحب (جلیس احمد) کے دوست نے پستول نکال لیا ہے۔

"میں یہ سنتے ہی ڈرائنگ روم کی طرف بھاگی‘ اس وقت میں نے ڈرائنگ روم میں دو گولیاں چلنے کی آواز سنی۔ اس کے ساتھ ہی پورا گھر اندھیرے میں ڈوب گیا۔ میں چیختی ہوئی ڈرائنگ روم میں پہنچی تو دروازے میں جاوید عثمانی کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں پستول تھا۔ میں نے پستول دیکھتے ہی ایک زور کی چیخ ماری اور چچا کلیم الدین کو آواز دی۔ اس اثنا میں لائٹ آ گئی۔ میں نے دیکھا‘ وہیل چیئر پر جلیس احمد خون میں لت پت پڑے تھے۔ اس موذی نے میرے شوہر کا خون کر دیا تھا۔ میں نے اسے پکڑنے کی کوشش کی مگر اس پر تو اس وقت خون سوار تھا۔ اس نے مجھے ایک زوردار دھکا دیا۔ میں ڈرائنگ روم کے دروازے سے ٹکرائی اور یہ وہاں سے فرار ہو گیا‘ اس وقت کلیم الدین چچا بھی گھر کے اندرونی حصے سے نکل آئے اور انہوں نے مجھے سنبھالا پھر تھوڑی ہی دیر بعد ہم نے پولیس کو فون کر دیا۔"

اس کے علاوہ بھی فرخندہ نے میرے موکل کی شان میں قصیدہ گوئی کی جس سے جاوید عثمانی کیلئے اس کے دل میں چھپی ہوئی شدید ترین نفرت کا اظہار ہوتا تھا۔ میں جرح کے لئے اپنی جگہ سے اٹھا اور گواہ کے کٹہرے کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔ کچھ دیر میں سر جھکائے خاموش رہا اور پھر جرح کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔

"محترمہ فرخندہ جلیس! مجھے بہت افسوس ہے کہ آپ کے شوہر کو ناگہانی موت سے دوچار ہونا پڑا مگر میں اپنے فرائض سے مجبور ہوں کہ اس کیس میں میری حیثیت وکیل صفائی کی ہے اس لئے مجھے آپ سے سوالات تو بہرحال کرنا ہی ہوں گے۔"

وہ منہ سے کچھ نہیں بولی‘ خاموشی سے مجھے گھورتی رہی۔ میں نے سوال کیا۔

"محترمہ فرخندہ جلیس آپ کے گھر میں آپ کے علاوہ اور کون کون رہتا ہے؟"

"میرے چچا کلیم الدین اور گھریلو ملازم آفتاب۔" اس نے جواب دیا۔ "اس سے پہلے میرے شوہر جلیس احمد بھی تھے۔"

میں نے پوچھا۔ "وقوعہ کی رات بھی گھر میں یہی افراد تھے؟"

اس نے الجھن آمیز نظروں سے مجھے دیکھا۔ میں نے اپنے سوال کی وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ”میرا مطلب ہے، جس رات وہ ناخوش گوار واقعہ پیش آیا، آپ لوگوں کے علاوہ گھر میں کوئی باہر کا آدمی کوئی مہمان تو نہیں آیا ہوا تھا؟“

”مجھے اعتراض ہے جناب عالی۔“ وکیل استغاثہ نے اپنی جگہ سے اٹھ کر کہا۔ ”وکیل صفائی بے تکے سوال کر کے آخر کیا ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ فرخندہ صاحبہ معزز عدالت کو بتا چکی ہیں کہ اس روز ان کے شوہر کے ساتھ ملزم جاوید عثمانی ڈرائنگ روم میں موجود تھا جو بعد ازاں ان کے شوہر کو قتل کر کے فرار ہو گیا۔ کیا اس سے یہ بات ظاہر نہیں ہوتی کہ وقوعہ کی رات گھر میں باہر کا کوئی آدمی موجود تھا۔“

”تھینک مائی ڈیئر کونسلر۔“ میں نے اطمینان سے کہا۔ ”آپ کی نوازش کہ اتنی اہم بات مجھے بتائی۔“ میں دوبارہ فرخندہ کی جانب متوجہ ہو گیا۔ ”فرخندہ صاحبہ! وقوعہ کی رات ملزم جاوید عثمانی کے علاوہ بھی باہر کا کوئی شخص گھر میں موجود تھا؟“

اس نے خشک لہجے میں جواب دیا۔ ”نہیں۔“

”محترمہ فرخندہ جلیس۔“ میں نے اپنی جرح کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”جس وقت آپ کے شوہر کا قتل ہوا، اس وقت آپ کا چچا کلیم الدین گھر کے کس حصے میں تھا؟“

”ان کا کمرا بنگلے کے پچھلے حصے میں ہے۔ وہ اس وقت وہیں تھے۔“

میں نے پوچھا۔ ”فرخندہ صاحبہ، کیا آپ کو معلوم ہے کہ آپ کے مرحوم شوہر جلیس احمد اور ملزم جاوید عثمانی کے درمیان کاروباری شراکت کی نوعیت کیا تھی؟“

”جی ہاں، بہت اچھی طرح معلوم ہے مجھے، مگر یہ شخص دھوکے بازی پر اتر آیا۔۔“

میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ”بے ایمانی، فراڈ اور دھوکے بازی پر بعد میں بات ہو گی۔ فی الحال میں نے جو آپ سے پوچھا ہے اس کا جواب دیں۔“

وہ بل کھا کر رہ گئی پھر بولی۔ ”اس پارٹنر شپ بزنس میں میرے شوہر انچاس فیصد کے حصے دار تھے۔“

”یعنی اکیاون فیصد حصہ ملزم جاوید عثمانی کا تھا۔“

”آپ کہہ سکتے ہیں۔“

میں نے کہا۔ ”محترمہ فرخندہ جلیس، آپ کو کچھ اندازہ ہے کہ اس وقت فیکٹری کا

کل اثاثہ کتنا ہو گا؟“

”کم و بیش پچاس لاکھ تو ہو گا۔“

”اس کا مطلب یہ ہوا کہ کم از کم پچیس لاکھ کی رقم مقتول کے حصے کی نکلتی ہے؟“

اس نے عجیب سے لہجے میں منہ بگاڑ کر کہا۔ ”اس میں شک کی کیا بات ہے؟“

میں نے اس کے سوال کو نظرانداز کرتے ہوئے کہا۔ ”اور اب اس رقم کی حق دار آپ ہیں؟“

”شوہر کی وفات کے بعد اس کی تمام دولت و جائیداد کی حق دار اس کی بیوی ہی ہوتی ہے۔“ فرخندہ نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔

”بجا فرمایا آپ نے لیکن اس صورت میں کہ مرنے والے نے کوئی خصوصی وصیت نہ کر رکھی ہو۔“

وہ جلدی سے بولی۔ ”جلیس احمد نے کسی قسم کی کوئی وصیت نہیں کر رکھی تھی۔“

”شکریہ فرخندہ صاحبہ۔“

وہ چونک کر میری جانب دیکھنے لگی۔ میں نے سوال کیا۔ ”محترمہ فرخندہ جلیس، آپ نے اپنے بیان میں معزز عدالت کو بتایا ہے کہ جس وقت آپ کے شوہر پر فائرنگ کی گئی اس وقت آپ اپنے بیڈ روم میں ٹی وی دیکھ رہی تھیں؟“

”جی ہاں، میں نے یہی بیان دیا ہے۔“

میں نے پوچھا۔ ”آپ نے معزز عدالت کو یہ بھی بتایا ہے کہ آپ کے گھریلو ملازم نے آپ کو مقتول اور ملزم کے درمیان ہونے والے کسی جھگڑے کی اطلاع دی تھی اور یہ بھی بتایا تھا کہ ملزم جاوید عثمانی نے پستول نکال لیا تھا؟“

”مجھے آفتاب نے یہی بتایا تھا۔“

”آپ نے اپنے ملازم سے یہ نہیں پوچھا کہ وہ دونوں کس بات پر جھگڑا کر رہے تھے؟“

وہ بولی۔ ”میں تو پستول کا ذکر سنتے ہی گھبرا گئی تھی۔ ویسے اگر میں کچھ پوچھتی بھی تو اس کا فائدہ نہیں تھا۔“

”کیا مطلب فائدہ نہیں تھا؟“ میں نے تیز لہجے میں پوچھا۔ ”آپ اپنی بات کی

تشریح کریں؟"

وہ تامل کرتے ہوئے بولی۔ "وہ دراصل—— ہمارا گھریلو ملازم جو ہے نا—— وہ بہرا ہے—— میں نے سوچا' اس نے کیا سنا ہو گا جو مجھے بتائے گا۔ اس لئے میں فوراً ڈرائنگ روم کی طرف چلی گئی تھی۔"

فرخندہ نے چونکا دینے والی بات بتائی تھی۔ میں نے سوال کیا۔ "کیا آپ کا ملازم آفتاب واقعی بہرا ہے؟"

وہ تھوڑی دیر کے لئے گڑبڑا گئی پھر بولی۔ "ہاں ہاں' میں کوئی جھوٹ تھوڑی بول رہی ہوں۔ آفتاب پیدائشی بہرا ہے۔"

مجھے اپنے پورے وجود میں سنسناہٹ سی محسوس ہوئی۔ میں نے خوشی کے جذبات کو دباتے ہوئے جج کی جانب رخ کیا پھر درخواست کی۔ "یور آنر' میں چند ناگزیر وجوہات کی بنا پر محترمہ فرخندہ پر اپنی جرح کو موقوف کر کے پہلے ان کے گھریلو ملازم آفتاب سے کچھ ضروری سوالات کرنا چاہتا ہوں۔"

جج نے وکیل استغاثہ سے پوچھا۔ "وکیل صاحب' آفتاب اس وقت عدالت کے کمرے میں موجود ہے؟"

آفتاب کا نام بھی استغاثہ کے گواہوں میں شامل تھا۔ وکیل استغاثہ نے کمرے میں نگاہ دوڑانے کے بعد جواب دیا۔ "نہیں جناب عالی' گواہ آفتاب اس وقت یہاں موجود نہیں ہے۔"

جج نے مجھ سے پوچھا۔ "وہ ناگزیر وجوہات کیا ہیں بیگ صاحب' جن کے سبب آپ فرخندہ پر اپنی جرح ادھوری چھوڑ رہے ہیں؟"

"یور آنر گواہ فرخندہ نے ابھی ابھی ایک ایسا انکشاف کیا ہے کہ کیس کا پانسا پلٹ سکتا ہے مگر میں اس کا ذکر قبل از وقت نہیں کرنا چاہتا۔ اس سے یہ کیس متاثر ہو سکتا ہے۔ میری معزز عدالت سے استدعا ہے کہ گواہ آفتاب کو جلد از جلد گواہی کیلئے عدالت میں حاضر ہونے کا حکم دیا جائے۔ دیٹس آل یور آنر۔"

وکیل سرکار میرے اس رویئے سے کشمکش میں مبتلا ہو چکا تھا۔ دوسری طرف فرخندہ بھی سخت الجھن کا شکار نظر آتی تھی' تاہم وہ یہ اندازہ لگانے سے قاصر تھے کہ

میرے دل میں کیا تھا۔ جج کی سوالیہ نظریں مجھ پر مرکوز تھیں۔ میری استدعا کو منظور کرتے ہوئے جج نے وکیل استغاثہ سے پوچھا۔ "وکیل صاحب' آپ آئندہ پیشی پر آفتاب کو عدالت میں حاضر کر سکتے ہیں؟"

وہ احتجاجی لہجے میں گویا ہوا۔ "یور آنر' میرے فاضل دوست خواہ مخواہ عدالت کا قیمتی وقت برباد کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ یہ اس قسم کے ڈرامے کرنے کے ماہر ہیں۔"

میں نے کہا۔ "ڈرامے اور حقیقت میں کچھ زیادہ فرق نہیں ہوتا اور بعض اوقات کوئی ڈرامہ کسی حقیقت سے بڑھ کر سچ ثابت ہو جاتا ہے۔ میں معزز عدالت کو یقین دلاتا ہوں کہ گواہ آفتاب سے جرح کے درمیان میں ایسا انکشاف کروں گا کہ ڈرامہ حقیقت بن جائے گا۔"

وکیل استغاثہ نے بے بسی سے کندھے جھٹک دیئے۔ جج نے ایک ہفتے کے بعد کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کر دی۔

ہم عدالت سے باہر آئے تو صحافیوں نے مجھے گھیر لیا۔ ہم سے مراد میں اور میرے موکل جاوید عثمانی کی بیوی فیروزہ۔

فیروزہ ہر پیشی پر باقاعدگی سے عدالت آ رہی تھی۔ صحافی جاننا چاہ رہے تھے کہ میں کون سا انکشاف کرنے والا ہوں۔ شہر کے تمام اخبارات میں کافی دنوں سے اس کیس کا چرچا تھا۔ میں بہ مشکل صحافیوں سے جان چھڑا کر اپنی گاڑی تک پہنچا۔ رخصت کرتے وقت فیروزہ نے مجھ سے پوچھا۔

"بیگ صاحب! آپ کو یقین ہے کہ جاوید چھوٹ جائے گا؟"

میں نے تسلی بخش لہجے میں جواب دیا۔ "اگر میں اس کیس کے بارے میں پرامید نہ ہوتا تو آپ کو شروع ہی میں بتا دیتا۔ مجھے پورا یقین ہے کہ میرا موکل بے گناہ ہے اور مجھے اپنی پیشہ ورانہ صلاحیتوں پر بھروسا ہے کہ میں اسے باعزت رہا کروا لوں گا۔"

دو چار رسمی باتوں کے بعد وہ وہاں سے روانہ ہو گئی۔ میں اپنے دفتر آ گیا۔

اس روز ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ دفتر میں کچھ زیادہ رش نہیں تھا اور میں تقریباً فارغ ہی بیٹھا تھا۔ کوئی پانچ بجے میری سیکرٹری صبیحہ نے مجھے بتایا کہ کوئی میڈم فرخندہ مجھ

سے بات کرنا چاہتی ہیں۔ میں نے سیکریٹری سے لائن دینے کو کہا۔ دوسرے ہی لمحے ایئرپیس میں فرخندہ کی آواز ابھری۔ جی ہاں، وہی فرخندہ۔ مقتول جلیس احمد کی بیوہ۔

"ہیلو، بیگ صاحب!"

"جی، بول رہا ہوں۔" میں نے شائستہ لہجے میں کہا۔

دوسری طرف خاصی دیر خاموشی چھائی رہی پھر فرخندہ کی بھرائی ہوئی آواز آئی۔

"بیگ صاحب، آپ آئندہ پیشی پر کیا انکشاف کرنے والے ہیں؟"

"سوری میڈم، یہ میرا پیشہ ورانہ راز ہے۔ آپ کو نہیں بتا سکتا۔"

اس کی بھرائی ہوئی آواز اچانک شیریں لہجے میں ڈھل گئی۔ "پیشہ ورانہ راز دوستوں کو تو بتا دینا چاہئے۔"

"دوستوں کو؟" میں نے چونک کر کہا۔ "ہمارے درمیان دوستی کب سے ہو گئی؟"

اس نے مٹھاس بھرے لہجے میں کہا۔ "اگر دوستی نہیں ہے تو ہو سکتی ہے۔"

"فرخندہ صاحبہ، آپ جس شخص کو پھانسی کے پھندے پر دیکھنا چاہتی ہیں، میں اس کا وکیل صفائی ہوں۔ ہمارے درمیان دوستی کا کیا سوال؟"

اس کا مختصر جواب میری سماعت سے ٹکرایا۔ "اس دنیا میں سب کچھ ممکن ہے۔"

میں نے پوچھا۔ "آپ کے وکیل کو اس بات کا علم ہے کہ آپ میرے ساتھ کس نوع کی گفتگو فرما رہی ہیں؟"

"گولی ماریں اُس کو۔ وہ تو نرا گدھا ہے۔" وہ بیزار کن لہجے میں بولی۔ "میں اس کیس میں آپ کی خدمات حاصل کرنا چاہتی ہوں۔ فیس کی کوئی پرواہ نہ کریں۔ میں منہ مانگی رقم دوں گی۔"

"یہ ناممکن ہے۔" میں نے قطعیت سے کہا۔ "میں اپنے موکل کو یوں بیچ منجدھار نہیں چھوڑ سکتا۔ ہاں، البتہ زندگی میں آئندہ کبھی آپ کو کسی وکیل کی ضرورت پڑی تو میں اس بارے میں سوچوں گا۔"

ایک مرتبہ پھر طویل خاموشی کا وقفہ آیا۔ مجھے فرخندہ کے رویئے پر حیرت ہو رہی تھی۔ میں اس کیس کا مخالف وکیل تھا۔ مجھ سے اس قسم کی باتیں کرنے کا آخر اس کا مقصد کیا تھا۔ ایک بات میری سمجھ میں یہ آ رہی تھی کہ گواہ آفتاب کسی خاص اہمیت کا

حامل تھا اور فرخندہ نہیں چاہتی تھی کہ وہ میری جرح کا نشانہ بنے لیکن کیوں، آخر کیوں؟ کیا اس سے خود فرخندہ کسی مصیبت میں گرفتار ہونے جا رہی تھی۔ ایک فوری خیال کے تحت میں نے فیصلہ کیا کہ مجھے خوش گوار موڈ کے ساتھ فرخندہ کو گھنا چاہئے۔ اگر کوئی ایسی ویسی بات ہوئی تو سامنے آ جائے گی۔ میں نے لہجے میں دوستانہ پن رچاتے ہوئے کہا۔

"ہیلو، میڈم فرخندہ کیا آپ لائن پر ہیں؟"

اس نے اثبات میں جواب دیا۔ "ہاں، میں موجود ہوں۔ کیا آپ نے ارادہ بدل لیا ہے؟"

"کیسا ارادہ؟"

"اس کیس میں میری وکالت کا ارادہ۔" اس کے شیریں لہجے میں چہک بھی شامل ہو گئی تھی۔

میں نے شاطرانہ انداز میں کہا۔ "فرخندہ صاحبہ، میں جانتا ہوں کہ آپ اس وقت مشکل حالات میں گھری ہوئی ہیں اور آپ کو کسی سچے ہمدرد کی ضرورت ہے۔"

"میں آپ کی بات کے دوسرے حصے سے اتفاق کرتی ہوں بیگ صاحب۔" وہ ایک دم سنجیدہ ہو گئی۔ "انسان کو ہر وقت کسی سچے ہمدرد کی ضرورت ہوتی ہے لیکن آپ کا یہ اندازہ بالکل غلط ہے کہ میں مشکل ترین حالات میں گھری ہوئی ہوں۔"

اس کا لمحہ بہ لمحہ بدلتا ہوا موڈ میرے لئے حیران کن تھا۔ ابھی تک میں یہ نہیں سمجھ پایا تھا کہ وہ آخر چاہتی کیا تھی؟ میرے لئے تو یہی بات حیرت کا سبب تھی کہ وہ فون پر مجھ سے ایسی باتیں کر رہی تھی جو اسے ہرگز نہیں کرنا چاہئے تھیں۔ میں ایک طرح سے اس کا دشمن تھا۔

"تو آپ نہیں بتائیں گے کہ کون سا انکشاف کرنا چاہتے ہیں؟" اس نے فیصلہ کن لہجے میں پوچھا۔

میں نے کہا۔ "میرے پیشے کا تقاضا ہے کہ قبل از وقت یہ راز آؤٹ نہ ہو۔"

"آپ اپنے حق میں اچھا نہیں کر رہے وکیل صاحب!" اس نے ایک اور انداز بدلا۔ اس کا لہجہ کرخت ہو گیا تھا۔

میں نے کہا۔ "میں اپنا اچھا برا بہ خوبی سمجھتا ہوں۔"

“آپ کی شادی ہو گئی ہے؟”

“نہیں کیوں؟”

وہ دیوانوں کی طرح قہقہہ لگاتے ہوئے بولی۔ “پہلی فرصت میں کر لیں ورنہ پچھتائیں گے۔”

مجھے اس کی بے ہودہ گوئی پر غصہ آگیا۔ میں نے سخت لہجے میں کہا۔ “آپ کا دماغ تو ٹھیک ہے؟”

“اس کا پتہ عدالت میں چلے گا وکیل صاحب۔” وہ جنونی انداز میں بولی۔

اس سے قبل کہ میں کوئی سخت جواب دیتا، اس نے فون بند کر دیا۔

ریسیور رکھنے کے بعد میں خاصی دیر تک اس کے بارے میں سوچتا رہا۔ عجیب جھکی عورت تھی۔ مجھے تو وہ کوئی نفسیاتی مریضہ لگتی تھی۔ کسی ذی ہوش اور باشعور شخص سے اس قسم کی باتوں کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی۔ خیر دنیا میں ہر طرح کے لوگ پائے جاتے ہیں۔ میں نے سر جھٹک کر فرخندہ کی سوچ کو ذہن سے نکالا اور اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔

* * *

اگلی پیشی پر عدالت کے کمرے میں خاصا رشک تھا۔ اب اس کیس کو عدالت میں لگے ہوئے دس ماہ سے زیادہ عرصہ گزر چکا تھا۔ گواہوں کے کٹہرے میں مقتول کا گھریلو ملازم پیدائشی بہرا آفتاب کھڑا تھا مگر فرخندہ کہیں نظر نہیں آ رہی تھی۔ مجھے پتہ چلا کہ اس کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی اس لئے وہ آج نہیں آ سکی تھی۔

میرے ذہن میں ایک فوری خدشے نے سر ابھارا۔ اس کے ساتھ ہی ٹیلی فون پر فرخندہ سے ہونے والی گفتگو تازہ ہو گئی۔ میرے ایک جھلاہٹ آمیز سوال “آپ کا دماغ تو ٹھیک ہے؟” کے جواب میں اس نے جنونی انداز میں کہا تھا “اس کا پتہ عدالت میں چلے گا وکیل صاحب۔” میرے کانوں میں خطرے کی گھنٹیاں بج اٹھیں۔

میں بنیادی طور پر شکی مزاج واقع ہوا ہوں۔ میری یہ فطری خاصیت میرے پیشے میں خاصی معاون ثابت ہوتی ہے۔ پولیس کی تفتیش اور وکیل کی جرح میں شک کی بڑی اہمیت ہے۔ شک سے ذہن میں سوال ابھرتا ہے۔ اس سوال کا جواب تلاش کرتے ہوئے نئے نئے انکشافات ہوتے ہیں اور الجھی ہوئی گتھی سلجھنے لگتی ہے۔ یہ بات تو میں جانتا تھا کہ جلیس احمد کا قاتل جو کوئی بھی تھا، وہ گھر کا ہی آدمی تھا۔ فرخندہ، اس کا چچا کلیم الدین یا گھریلو ملازم آفتاب۔ بہرحال اگر فرخندہ قاتل نہیں تھی تو وہ قاتل سے واقف ضرور تھی۔ کہیں اس کی بیماری بھی کوئی چال ہی تو نہیں تھی۔ میں خیالات کے تانے بانے بن رہا تھا کہ جج نے عدالتی کارروائی کا آغاز کر دیا۔

کٹہرے میں کھڑے ہوئے گواہ آفتاب نے حلف اٹھانے کے بعد بیان دیا کہ وقوعہ کی رات دو کافی کے مگ اٹھائے ڈرائنگ روم میں پہنچا تو اس کا صاحب اپنے پارٹنر سے جھگڑا کر رہا تھا پھر جاوید عثمانی نے پستول نکال لیا۔ اس کے بعد آفتاب بھاگتے ہوئے اپنی مالکن کو اطلاع دینے چلا گیا۔ بعد ازاں وہاں جو کچھ پیش آیا اس نے وہ اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا تھا اس لئے اس کے بارے میں کچھ بتانے سے وہ قاصر تھا کیونکہ وہ خوف کی وجہ سے باتھ روم میں گھس گیا تھا۔ گولیوں کی آواز نے اس کے حواس مختل کر دیئے تھے۔

اس کا بیان ختم ہوا تو میں جرح کیلئے اس کے پاس چلا گیا۔ میں کافی دیر خاموشی سے اسے گھورتا رہا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ نروس انداز میں ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ وکیل استغاثہ نے شکایتی نظروں سے جج کی جانب دیکھا۔ جج نے مجھے جرح شروع کرنے کا حکم دیا۔ میں نے چونکنے کی اداکاری کی اور آفتاب کی جانب متوجہ ہو گیا۔

“مسٹر آفتاب، آپ کا نام کیا ہے؟” میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں گاڑ کر سنسناتے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔

اس کی آنکھوں میں خوف کے سائے لہراتے ہوئے میں نے واضح طور پر محسوس کئے مگر اس نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا اور ٹکر ٹکر مجھے دیکھتا رہا۔

وکیل استغاثہ فوراً بیچ میں کود پڑا۔ “آئی آبجیکشن یور آنر! یہ بات معزز عدالت کے علم میں لائی جا چکی ہے کہ گواہ آفتاب پیدائشی بہرا ہے۔ شاید ڈیفنس کونسلر کی یادداشت بہت کمزور ہے کہ چند روز پہلے کی بات بھی وہ بھول چکے ہیں۔”

“یاد دہانی کا شکریہ میرے دوست۔” میں نے وکیل سرکار کی طرف دیکھتے ہوئے تلخ لہجے میں کہا۔ “میری یادداشت بہت مضبوط ہے جناب، اسی لئے تو میں یہ سوال کر رہا

ہوں۔"

وکیل سرکار نے کہا۔ "جب گواہ آپ کا سوال سن ہی نہیں سکتا تو پھر جواب کیا دے گا۔ بہتر ہو گا کہ آپ کاغذ پر لکھ کر اس سے سوال کریں۔" پھر اس نے ایک خالی پیڈ اپنی فائلوں کے درمیان سے نکال کر میری طرف بڑھایا اور کہا۔ "میں اسی مقصد کیلئے یہ لے کر آیا ہوں۔"

میں نے تمسخرانہ نظروں سے وکیل استغاثہ کو دیکھا پھر آفتاب کے پاس جا کر اپنا سوال دہرایا۔ "مسٹر آفتاب' آپ کا نام کیا ہے؟"

"یہ کیا مذاق ہے جناب عالی۔" وکیل استغاثہ اچھل پڑا۔ "میرے فاضل دوست کس قسم کی جرح کر رہے ہیں۔ میں نے تو پہلے ہی کہا تھا کہ یہ ڈرامہ کرنے کے ماہر ہیں۔"

میں نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ "اور میں نے معزز عدالت سے وعدہ کیا تھا کہ گواہ آفتاب سے جرح کے دوران میں' میں ایسا انکشاف کروں گا کہ ڈرامہ بھی حقیقت بن جائے گا۔"

"کیسا انکشاف؟"

"انکشاف تو اس وقت ہو گا جب گواہ میرے سوال کا جواب دے گا۔"

وکیل استغاثہ نے جج کی جانب مڑتے ہوئے روہانسے لہجے میں کہا۔ "یور آنر' یہ عدالت کا کمرا ہے۔ کسی مداری کا مجمع نہیں۔ وکیل صفائی کون سا سانپ نکالنا چاہتے ہیں؟"

جج نے مجھ سے پوچھا۔ "بیگ صاحب' آپ کیا کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں؟"

"یور آنر!" میں نے نہایت ہی احترام سے جج کو مخاطب کیا پھر کہا۔ "میں نے اب تک کوئی بھی نامناسب بات نہیں کی۔ میں تو اس گواہ سے اس کا نام پوچھ رہا تھا۔۔"

وکیل سرکار میری بات کو کاٹتے ہوئے بولا۔ "گواہ پیدائشی بہرا ہے۔ وہ معمولی سے معمولی آواز بھی نہیں سن سکتا۔ آپ کو اس سے جو کچھ بھی پوچھنا ہے' لکھ کر پوچھ لیں۔"

میں نے کہا۔ "میں گواہ سے اس لئے زبانی سوال پوچھ رہا ہوں کہ آپ کے بہ قول وہ پیدائشی بہرا ہے۔"

"یہ کیا بات ہوئی؟" وکیل سرکار ناچ اٹھا۔

جج نے سنجیدہ لہجے میں مجھ سے کہا۔ "بیگ صاحب' آپ اپنی بات کی وضاحت کریں۔"

میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "یور آنر! گواہ آفتاب کو دیکھ کر مجھے خود پر فخر محسوس ہو رہا ہے۔"

"وہ کیوں؟" جج نے دلچسپ نظروں سے مجھے دیکھا۔

میں نے کہا۔ "میں بچپن سے سنتا آیا ہوں کہ دنیا میں سات عجوبے ہیں۔ میرے علم میں یہ بات بھی ہے کہ ان ساتوں میں ایک بھی انسانی عجوبہ نہیں ہے۔ آج میں نے معزز عدالت میں ایک انسانی عجوبہ دیکھا ہے۔ کیا مجھے خود پر فخر نہیں کرنا چاہئے؟"

وکیل استغاثہ بے چینی سے پہلو بدل کر رہ گیا۔ مجھے یقین تھا کہ میری بات اس کی سمجھ میں نہیں آئی ہو گی لیکن جج کے دیکھنے کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ بات کی تہہ تک پہنچ چکا تھا۔

میں نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "یور آنر' ابھی تھوڑی دیر پہلے گواہ آفتاب نے معزز عدالت کے سامنے اپنا بیان ریکارڈ کروایا ہے۔ اس بات کے اور بھی بہت سے ثبوت عدالت کے علم میں ہیں کہ گواہ قوت گویائی سے مالا مال ہے۔ لیکن بے چارہ۔۔۔" میں نے ایک نظر آفتاب کو دیکھا۔ میری اس ایک نظر میں دنیا بھر کا رحم شامل تھا۔ "یہ بے چارہ پیدائشی بہرا ہے۔"

وکیل استغاثہ کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ وہ اچانک پھٹ پڑا۔ یہ کیا آپ نے "بے چارہ' بے چارہ۔ لگا رکھی ہے؟"

میں نے صرف زیر لب مسکرانے پر اکتفا کیا۔ وکیل سرکار نے غصیلے لہجے میں مجھ سے پوچھا۔ "اگر گواہ قوت گویائی کا حامل ہے تو آپ کو کیا اعتراض ہے؟"

"آئی آبجیکٹ۔۔ آئی آبجیکٹ۔۔ آئی آبجیکٹ۔" میں نے اپنی فائلوں پر مکے برساتے ہوئے تیز آواز میں کہا۔

"وہاٹ آبجیکٹ؟" وکیل صفائی لال پیلا ہوتے ہوئے بولا۔

"آرڈر پلیز۔" جج نے بھاری آواز میں ہمیں تنبیہہ کی۔ "کنٹرول یور سیلف۔" اپنے حواس پر قابو رکھیں۔"

میں نے ایک طویل سانس خارج کرتے ہوئے جج کو بو (Bow) کیا پھر معتدل لہجے میں کہا۔ ”آئی ایم ریئلی ویری سوری یور آنر!“ ایک لمحے کے توقف کے بعد میں نے کہا۔ ”جناب عالی! گواہ آفتاب‘ انسانی تاریخ کا پہلا پیدائشی بہرا ہے جو بولنے کی صلاحیت بھی رکھتا ہے ورنہ ہر پیدائشی بہرا گونگا بھی ہوتا ہے۔ کمیونی کیشن کا تعلق سننے سے ہوتا ہے۔ اگر کسی جاندار میں سننے کی صلاحیت نہیں ہے تو وہ بولنے کی صلاحیت سے بھی محروم ہو گا۔ سننے کی صلاحیت نہ ہونے سے میری مراد پیدائشی محرومی ہے۔ انسان جب اس دنیا میں آتا ہے تو پہلے وہ سنتا ہے‘ بولنا بعد میں شروع کرتا ہے۔ دس از کنکریٹ میڈیکل ریسرچ یور آنر۔ اس پیدائشی معذوری کو طبی اصطلاح میں (Deaf And Dumb) کہا جاتا ہے۔ آپ نے ایسے افراد کے تعلیمی و تربیتی مراکز پر واضح الفاظ میں ”فار ڈیف اینڈ ڈمب“ لکھا ضرور دیکھا ہو گا۔ آپ میرے بیان کی تصدیق کیلئے کسی ای این ٹی اسپیشلسٹ سے کنسلٹ کر سکتے ہیں۔“ میں نے رک کر تیکھی نظروں سے گواہ آفتاب کو دیکھا اور کہا۔ ”ویسے کسی ای این ٹی اسپیشلسٹ سے زیادہ موثر پولیس ثابت ہو گی۔ وہ معمولی سے ”چیک اپ“ کے بعد اس کا بہرا پن دور کر دیں گے۔“

جج نے غصیلی نظرں سے گواہ آفتاب کو گھورا۔ میں نے اپنا بیان جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”جناب عالی‘ ڈاکٹر کی ماہرانہ رائے اور پولیس والوں کی ”کرامت“ تو رہی ایک طرف‘ میں معزز عدالت کی توجہ گواہ کے بیان کے اختتامی حصے کی جانب مبذول کروانا چاہتا ہوں۔“ ایک لمحے کے توقف سے میں نے اضافہ کیا۔ ”یور آنر‘ گواہ نے اپنے بیان میں بتایا ہے کہ جب اس نے جاوید عثمانی کے ہاتھ میں پستول دیکھا تو وہ فوراً اپنی مالکن کو اطلاع کرنے بھاگا۔ پھر فائرنگ کی آواز سن کر وہ خوف زدہ ہو گیا اور باتھ روم میں گھس گیا۔ اس کے حواس مختل ہو گئے تھے۔ یور آنر‘ ایک ایسا شخص جو پیدائشی بہرا ہے‘ وہ گولیوں کی آواز سے خوف زدہ ہو کر باتھ روم میں جا چھپتا ہے۔ ہے نا مزے کی بات؟“

آفتاب نے ہراساں نظروں سے مجھے دیکھا۔ اسے احساس ہو گیا تھا کہ وہ بیان میں کتنی سنگین غلطی کر چکا تھا مگر اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ تیر کمان سے نکل چکا تھا اور واپس نہیں آ سکتا تھا۔ وکیل استغاثہ کے چہرے پر بھی مایوسی کے گہرے بادل چھائے ہوئے تھے۔

جج نے کڑک دار آواز میں گواہ سے پوچھا۔ ”تمہیں جھوٹی گواہی دیتے ہوئے شرم نہیں آئی؟“

پھر اچانک وہ ہو گیا کہ نہ تو پولیس کے پاس جانے کی ضرورت رہی اور نہ ہی کسی ماہر سماعت ڈاکٹر کو زحمت دینا پڑی۔ مصنوعی بہرے گواہ آفتاب نے بھری عدالت میں رونا شروع کر دیا۔ وہاں موجود ہر شخص سناٹے میں تھا۔ وکیل سرکار کو بھی سانپ سونگھ گیا تھا۔

میں نے جج کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”جناب عالی‘ گواہ کے جھوٹ کی قلعی کھل چکی ہے اس لئے میری معزز عدالت سے استدعا ہے کہ وہ گواہ کو شامل تفتیش کرنے کا حکم جاری کرے۔“

آفتاب نے پھٹی پھٹی نظروں سے جج کو دیکھا پھر اچانک پھٹ پڑا۔ ”جج صاحب‘ میرا کوئی قصور نہیں ہے۔ میں نے کسی کو قتل نہیں کیا اور نہ ہی میں قاتل کے بارے میں کچھ جانتا ہوں میں بہرا بھی نہیں ہوں بلکہ ایک نارمل انسان ہوں۔ مجھے معاف کر دیں جناب‘ میں بے گناہ ہوں۔“

جج نے اسے ڈانٹ پلائی۔ ”اگر تم بے گناہ ہو تو پھر تم نے کس کے ایمان پر جھوٹ بولا‘ کیوں رچایا تم نے یہ ڈھونگ؟“

وہ سہمے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”مجھے یہ سب کچھ کرنے کیلئے مالکن اور ان کے چچا نے مجبور کیا تھا۔ میں نے برسوں ان کا نمک کھایا ہے۔ ان کا حکم ٹال نہیں سکتا تھا۔ میں مجبور ہو گیا تھا۔ مجھے معاف کر دیں۔ میں آپ کے پاؤں پر گر کر معافی مانگ لوں گا۔“

”واردات والی رات کیا واقعہ پیش آیا تھا؟“ جج نے بارعب آواز میں پوچھا۔

آفتاب نے جواب دیا۔ ”میں ڈرائنگ روم میں مالک (جلیس احمد) کے بلانے پر گیا تھا۔ انہوں نے مجھ سے اور کافی لانے کو کہا تھا۔ میں نے کافی کے جوٹھے مگ اٹھائے اور کچن کی طرف گیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد دو گولیاں چلنے کی آواز آئی پھر لائٹ چلی گئی۔ میں نے چولھے کی لو اونچی کی اور موم بتی تلاش کرنے لگا۔ اس وقت تک مجھے یہ معلوم نہیں ہوا تھا کہ فائرنگ ہمارے ہی بنگلے میں ہوئی تھی پھر مجھے مالکن کے چیخنے کی آواز آئی۔ وہ چچا کلیم کو آوازیں دے رہی تھیں۔ میں سمجھ گیا کہ ساری گڑبڑ ہمارے بنگلے میں ہی ہوئی ہے۔ میں باورچی خانے سے باہر آیا تو مجھے بتایا گیا کہ جلیس صاحب کے دوست انہیں قتل

کر کے فرار ہو گئے ہیں۔ جو بیان میں نے عدالت میں دیا ہے' وہی بیان میں نے پولیس میں بھی دیا تھا اور یہ سب باتیں مجھے کلیم چچا نے سمجھائی تھیں۔ اس وقت اتنی مہلت نہیں تھی کہ میں ان سے اس بارے میں کوئی سوال کرتا کیوں کہ تھوڑی ہی دیر میں ایک پولیس موبائل جاوید صاحب کو گرفتار کر کے لے آئی تھی پھر کچھ دیر بعد ایک اور موبائل بھی وہاں پہنچ گئی تھی۔" اپنی بات ختم کر کے وہ پھر رونے لگا۔ "جناب' میں اللہ کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں نے کوئی جرم نہیں کیا ہے۔ آپ مجھے معاف کر دیں۔"

"جھوٹی گواہی دینا بھی ایک سنگین جرم ہے۔" جج نے ناگواری سے کہا۔

آفتاب نے لجاجت سے کہا۔ "میں اب کبھی جھوٹی گواہی نہیں دوں گا جناب۔ میرے باپ کی بھی توبہ۔ میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ ان خطرناک لوگوں کی نوکری بھی چھوڑ دوں گا۔"

میں نے جج کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "یور آنر' اس کیس میں فرخندہ بیگم کے چچا کلیم الدین کی ذات بھی مشتبہ افراد میں شامل ہو چکی ہے۔ گھریلو ملازم آفتاب کی گواہی کے بعد یہ ضروری ہو گیا ہے کہ کلیم الدین کو جلد از جلد بیان کیلئے عدالت میں بلایا جائے حالانکہ وکیل استغاثہ نے گواہوں کی جو فہرست عدالت میں پیش کی ہے اس میں کلیم الدین کا نام بھی شامل ہے مگر پتہ نہیں کیوں ابھی تک اسے یہاں لایا نہیں گیا۔ میں معزز عدالت سے استدعا کروں گا کہ اب اس کیس میں تاخیر مناسب نہیں ہو گی۔" پھر میں جا کر اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔

جج نے کلیم الدین کو پابند گواہ قرار دیتے ہوئے متعلقہ عدالتی عملے کو حکم دیا کہ وہ کلیم الدین کے نام سمن جاری کر دیں۔ اس کے ساتھ ہی آفتاب کو تاکید کر دی گئی کہ وہ ہر پیشی پر پابندی سے عدالت میں حاضر ہو گا۔ اس نے ہاتھ جوڑ کر وعدہ کیا کہ وہ ایسا ہی کرے گا۔

آئندہ پیشی کی تاریخ دے کر جج نے عدالت برخاست کر دی۔

◆

کٹہرے میں فرخندہ کا چچا کلیم الدین کھڑا تھا اور گہری نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔

اس کی عمر کا اندازہ میں نے چالیس بیالیس سال لگایا۔ وہ پکے رنگ کا ایک ہوشیار اور چالاک شخص دکھائی دیتا تھا۔ اس نے ہلکے بادامی رنگ کی شلوار قمیص پہن رکھی تھی۔ گھنگھریالے بالوں میں وافر مقدار میں تیل لگایا گیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں شکرے ایسی لپک تھی۔

گزشتہ دو پیشیوں پر کوئی قابل ذکر کارروائی نہیں ہوئی تھی۔ پہلی پیشی پر گواہ کلیم الدین عدالت میں حاضر نہیں تھا چنانچہ جج نے متعلقہ عدالتی عملے کو اس کے خلاف سختی برتنے کی اجازت دے دی۔ دوسری پیشی پر وہ عدالت میں موجود تھا مگر وکیل استغاثہ نے میڈیکل سرٹیفکیٹ دے کر ایک ہفتے بعد کی تاریخ لے لی تھی۔ بیگم فرخندہ ہنوز علیل تھی اور وکیل استغاثہ اس کی طرف سے برابر میڈیکل سرٹیفکیٹ پیش کر رہا تھا۔ مجھے پتہ چلا کہ فرخندہ کو دل کا دورہ پڑ گیا تھا اور اس کی حالت بھی ایسی نہیں تھی کہ عدالت میں حاضر ہو کر میری جرح کا سامنا کر سکتی۔ میں بہ خوبی سمجھتا تھا کہ اس کے "دورے" کی نوعیت کیا تھی۔

جج سے اجازت حاصل کرنے کے بعد کلیم الدین نے سچ بولنے کا حلف اٹھایا اور نہایت مختصر بیان دیا۔ اس نے کہا۔ "وقوعہ کی رات میں کمرے میں سونے کی تیاری کر رہا تھا۔ اس وقت رات کے تقریباً دس بجے تھے۔ اچانک مجھے فائرنگ کی آواز سنائی دی۔ آواز اتنی نزدیک سے آئی تھی کہ میں بوکھلا کر کمرے سے باہر نکل آیا۔ اس وقت لائٹ چلی گئی۔ میں ٹھٹک کر رکا تو مجھے فرخندہ کے چیخنے کی آواز سنائی دی۔ یہ آواز ڈرائنگ روم کی طرف سے آ رہی تھی۔ میں لپک کر وہاں پہنچا تو معلوم ہوا کہ جاوید عثمانی نے جلیس احمد کو قتل کر دیا ہے اور موقع سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا ہے۔ اس کے بعد ہم پولیس کو فون کرنے لگے۔"

اس کا بیان ختم ہوا تو جج نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "کلیم الدین' اگر تم چاہو تو اپنے بیان پر نظرثانی کر سکتے ہو۔"

"اس کی کوئی ضرورت نہیں جناب۔" وہ بے پروائی سے بولا۔ "سچ کو آنچ نہیں۔"

میں جج کی اجازت سے جرح کیلئے آگے بڑھا۔ "کلیم الدین صاحب' آپ کے گھر میں ایک ملازم بھی ہے۔ بھلا سا نام ہے اس کا۔۔۔"

میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ وہ جلدی سے بولا۔ “اس کا نام آفتاب ہے؟”

میں نے کہا۔ “میں نے سنا ہے گولیوں کی آواز سن کر اس کی سماعت جاتی رہی ہے؟”

“کیا مطلب ہے آپ کا؟” وہ بگڑ کر بولا۔ “وہ بے چارہ تو پیدائشی بہرا ہے۔ گولیاں چلنے کی آواز سے اس کی سماعت پر بھلا کیا اثر پڑ سکتا ہے۔”

“آپ کو اس بات کا یقین ہے کہ آفتاب پیدائشی بہرا ہے؟”

“جی ہاں، مجھے یقین ہے۔”

میں نے جج کی جانب روئے سخن کرتے ہوئے درخواست کی۔ “گواہ کے اس جواب کو خصوصاً نوٹ کیا جائے جناب عالی۔”

میرے انداز نے کلیم الدین کو بوکھلا دیا۔ وہ سمجھ گیا کہ کوئی گڑبڑ ہو چکی ہے۔ شاید اس کے علم میں یہ بات نہیں تھی کہ “عدالتی جراحت” سے آفتاب کی سماعت کا شافی “علاج” ہوچکا ہے اور اب وہ نارمل انسانوں کی طرح سننے لگا ہے۔ اگر اسے پتہ ہوتا کہ آفتاب لنکا ڈھا چکا ہے تو ممکن ہے کہ اس کا جواب کچھ اور ہوتا۔ آفتاب اس وقت بھی عدالت کے کمرے میں موجود تھا مگر شاید کلیم الدین کی ابھی اس پر نظر نہیں پڑی تھی۔

میں نے آفتاب کے مصنوعی بہرے پن کے موضوع کو نظر انداز کرتے ہوئے مشتاق زبیری صاحب سے حاصل کردہ معلومات کی روشنی میں سوالات شروع کر دیئے۔ میں نے کٹہرے میں کھڑے ہوئے گواہ کلیم الدین سے پوچھا۔ “کلیم الدین صاحب، آپ ملزم جاوید عثمانی کو کتنے عرصے سے جانتے ہیں؟”

اس نے جواب دیا۔ “کم و بیش دو سال سے۔”

میں نے پوچھا۔ “وہ کیسا شخص ہے؟”

“میرا کبھی اس سے زیادہ واسطہ نہیں پڑا، اس لیے میں کیا بتا سکتا ہوں۔”

میں نے کہا۔ “کیا یہ بات غلط ہے کہ فرخندہ اور جلیس احمد کی شادی سے پہلے آپ کچھ عرصے جے جے گارمنٹس میں پیکنگ انچارج بھی رہے ہیں؟”

“یہ بات بالکل درست ہے۔”

“کلیم الدین صاحب!” میں نے جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ “ملزم جاوید عثمانی جے جے گارمنٹس کا ایک مالک ہے جیسا کہ آپ کی بھتیجی فرخندہ کا شوہر مقتول جلیس احمد مالک تھا۔ پھر آپ کا یہ جواب کہ--- آپ کا اس سے زیادہ واسطہ نہیں پڑا، کیا معنی رکھتا ہے؟”

وہ تامل کرتے ہوئے بولا۔ “میرا مطلب یہ تھا کہ میرا ذاتی نوعیت کا واسطہ نہیں پڑا۔ میں کام سے کام رکھنے والا بندہ ہوں۔”

“بہت خوب۔” میں نے مسکراتے ہوئے کہا پھر پوچھا۔ “آپ کون کون سے کام جانتے ہیں؟”

وکیل سرکار نے فوراً اعتراض جڑ دیا۔ “جناب عالی، وکیل صفائی کو غیر متعلقہ سوالوں سے باز رہنے کی تلقین کی جائے۔”

جج نے اعتراض درست تسلیم کرتے ہوئے مجھے ہدایت کی “بیگ صاحب، آپ فروعی باتوں سے اجتناب برتتے ہوئے ٹو دی پوائنٹ سوال کریں۔”

اس پر میں نے سوال کیا۔ “کلیم صاحب، کیا آپ فرخندہ کے سگے چچا ہیں؟”

اس نے خونخوار نظروں سے مجھے دیکھا پھر جواب دیا۔ “نہیں، میں فرخندہ کے باپ کا چچا زاد ہوں۔”

“کیا آپ شروع ہی سے اس شہر میں رہ رہے ہیں؟”

اس نے نفی میں جواب دیا۔ میں نے پوچھا۔ “کیا یہ سچ ہے کہ آپ کے باپ نے آپ کو عاق کر دیا تھا اور اس کی وجہ---”

وہ بھڑک اٹھا۔ “میں آپ کے ایسے فضول سوالوں کا جواب دینے کا پابند نہیں ہوں۔”

“بے شک آپ پابند نہیں ہیں۔” میں نے سرسری سے لہجے میں کہا۔ پھر پوچھا۔ “میں نے سنا ہے، آپ کراچی آنے سے پہلے حیدر آباد میں کسی گیراج میں کام کرتے تھے؟”

اس نے الٹا مجھ سے سوال کر دیا۔ “آپ کو حیدر آباد پر اعتراض ہے یا میرے گیراج میں کام کرنے پر؟”

”مجھے نہ تو آپ کے حیدر آباد میں کام کرنے پر اعتراض ہے نہ ہی کسی گیراج میں کام کرنے پر۔“ میں نے متحمل لہجے میں کہا۔ ”میں تو اپنی معلومات کی تصدیق کر رہا تھا۔“

”پھر ہو گئی آپ کی تسلی؟“

میں نے اس کے سوال کو نظرانداز کرتے ہوئے پوچھا۔ ”مجھے پتہ چلا ہے کہ آپ بغیر چابی کے گاڑیوں کے دروازے کھولنے کے بھی ماہر ہیں جس کیلئے ایک مخصوص اصطلاح ”لاک بریکر“ استعمال ہوتی ہے جو شرفا کی نظر میں خاصی معیوب سمجھی جاتی ہے؟“

”یہ کیا بکواس ہے؟“ وہ تڑخ کر بولا۔

وکیل استغاثہ اس کی مدد کو دوڑا۔ ”یور آنر، وکیل صفائی معزز گواہ کی عزت پر حملہ کر رہے ہیں۔“

جج نے وکیل سرکار کے اعتراض کو مسترد کرتے ہوئے مجھے جرح جاری رکھنے کا اشارہ کیا۔ میں نے گواہ سے اگلا سوال کیا۔ ”حیدر آباد والے گیراج سے آپ کو اس لئے نکال دیا گیا تھا کہ آپ نے ایک کلائنٹ کی گاڑی میں سے اس کا طلائی لائٹر چرا لیا تھا۔ لائٹر کا مالک تو آپ کو جیل بھجوانے کے درپے تھا مگر گیراج کے مالک نے بیچ میں پڑ کر معاملہ رفع دفع کر دیا اور اسی روز آپ کو بھی نوکری سے نکال دیا گیا۔ کیا آپ اس واقعے کی بھی تردید کریں گے؟“

وہ چیخ کر بولا۔ ”یہ جھوٹ ہے۔“

”یہ مت بھولیں کلیم صاحب کہ حیدر آباد والے گیراج کے مالک کو گواہی کیلئے یہاں بلایا جا سکتا ہے؟“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”مشتاق زبیری کی معلومات بہت کارآمد ثابت ہو رہی تھیں۔

وہ اچانک برسوں کا بیمار نظر آنے لگا۔ میں نے ایک اور چوٹ کی ”کلیم الدین صاحب، ملزم جاوید عثمانی کی نیلی ٹویوٹا کار میں سے اعشاریہ تین آٹھ کا پستول نکالنے میں آپ کو کوئی دشواری تو نہیں ہوئی ہو گی اگرچہ ملزم نے اپنی گاڑی کے دروازے لاک کر رکھے تھے؟“

”یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟“

میں نے ایک اور وار کیا۔ ”بنگلے کا مین سوئچ بند کرنے کی ذمے داری آپ کی تھی یا آپ کی بھتیجی کی؟“

وہ ہونقوں کی طرح منہ کھول کر میرا منہ تکنے لگا۔

میں پے در پے وار کرتا چلا گیا۔ ”آپ ملزم جاوید عثمانی کی پشت پر موجود پردوں کے پیچھے چھپے کھڑے تھے یا کھڑکی کے باہر سے آپ نے نشانہ بازی کا کوئی خصوصی انتظام کر رکھا تھا؟“

وکیل استغاثہ نے آخری زور مارا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور جج کو مخاطب کرتے ہوئے بولا۔ ”جناب عالی! کیا میں جان سکتا ہوں کہ میرے فاضل دوست قبل از وقت دلائل کیوں دے رہے ہیں۔ ابھی تو گواہ پر جرح جاری ہے۔ آرگومنٹس کی باری تو بعد میں آئے گی۔“

میں نے وکیل سرکار کے اعتراض کا جواب دیتے ہوئے کہا۔ ”میرے محترم دوست عدالتی کارروائی کے قواعد و ضوابط مجھے ازبر ہیں۔ میں انہیں کبھی نہیں بھولتا مجھے تو یہ بھی یاد ہے کہ مقتول کی بیوہ فرخندہ سے میرا کراس ادھورا رہ گیا تھا۔ آپ اسے جرح کیلئے کب پیش کر رہے ہیں؟“

”میں وکیل ہوں، کوئی ڈاکٹر نہیں ہوں۔“ وہ خشک لہجے میں بولا۔ ”فرخندہ بیگم کو عدالت میں بیان دینے کیلئے آنے کے قابل کرنا تو ڈاکٹروں کا کام ہے۔“

”میں آپ سے اتفاق کرتا ہوں۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”مگر فرخندہ بیگم استغاثہ کی بہت اہم شخصیت ہیں۔ ان کی دیکھ بھال کی کچھ نہ کچھ ذمے داری تو آپ پر بھی عائد ہوتی ہے۔“

وکیل استغاثہ خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا مگر منہ سے کچھ نہیں بولا۔

اس کے ساتھ ہی عدالت کا وقت ختم ہو گیا۔ جج نے اگلی پیشی کی تاریخ دے کر سماعت ملتوی کر دی۔ آئندہ پیشی ایک ماہ بعد کی تھی۔ اپنے چیمبر میں جانے سے پہلے جج نے کلیم الدین کو خصوصاً تاکید کی تھی کہ وہ اپنے علاقے سے کہیں باہر جانے کی کوشش نہ کرے اور جانا اگر ناگزیر ہو تو اپنے متعلقہ تھانے میں اطلاع کرنے کے بعد جائے۔ اگر اس نے اس ہدایت پر عمل نہ کیا تو اس کے ناقابل ضمانت وارنٹ گرفتاری جاری کر دیئے

جائیں گے۔

○

آئندہ پیشی سے چند روز قبل گواہ کلیم الدین بغیر کسی اطلاع کے غائب ہو گیا۔ جج نے اس کے وارنٹ گرفتاری جاری کر دیئے۔

اس پیشی پر فرخندہ بہ نفس نفیس موجود تھی۔ اس کے چہرے پر مردنی چھائی ہوئی تھی اور رنگ سرسوں کے مانند ہو رہا تھا۔ وہ خاصی دبلی دکھائی دے رہی تھی۔ ایک لمحے کے لئے میرے دل میں خیال آیا، ممکن ہے اسے واقعی ہارٹ اٹیک ہوا ہو۔ وہ جس قسم کی صورتحال سے دوچار تھی اس میں ایسا ہو جانا بعید از امکان بھی نہیں تھا۔

وہ گواہوں کے کٹہرے میں آ کر کھڑی ہوئی تو میں نے جج کی اجازت سے اپنی ادھوری جرح کا آغاز وہیں سے کیا جہاں سے یہ سلسلہ ٹوٹا تھا لیکن اس سے پہلے میں اس کی مزاج پرسی سے غافل نہیں رہا تھا۔ میں نے کٹہرے کے نزدیک آ کر نہایت ہی نرم لہجے میں کہا۔ ”محترمہ فرخندہ جلیس، اب آپ کی طبیعت کیسی ہے۔ آپ کے دل کا معاملہ کہاں تک پہنچا۔۔۔ میرا مطلب ہے، پچھلے دنوں جو اچانک دل کا دورہ پڑ گیا تھا۔۔۔ اب کیا حال ہے؟“

اس نے گھور کر مجھے دیکھا اور خشک لہجے میں جواب دیا۔ ”میں ٹھیک ہوں، آپ اپنی جرح شروع کر دیں۔“

میں نے کہا۔ ”میڈم، ہم نے آپ کے غیاب میں، آپ کی اجازت کے بغیر، آپ کے ذاتی ملازم آفتاب کا بہرا پن دور کر دیا ہے۔ آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں ہے؟“

”میں زیادہ دیر کھڑی نہیں ہو سکتی۔“ وہ نقاہت آمیز لہجے میں بولی۔ پھر ملتجی نظروں سے جج کو دیکھا اور کہا۔ ”جناب والا، اگر وکیل صفائی کے پاس کوئی ڈھنگ کا سوال نہیں رہا تو مجھے جانے کی اجازت دیں۔“

میں چھیڑ چھاڑ ترک کر کے اصل موضوع پر آ گیا۔ ”محترمہ فرخندہ جلیس، آپ نے معزز عدالت کو بیان دیتے ہوئے بتایا تھا کہ جب آپ نے فائرنگ کی آواز سنی تو اس کے فوراً بعد لائٹ چلی گئی تھی۔ آپ چیختے ہوئے ڈرائنگ روم کے دروازے پر پہنچیں تو اندر

سے ملزم برآمد ہو رہا تھا۔ آپ نے اس کے ہاتھ میں پستول بھی دیکھا تھا۔ کیا آپ کو یقین ہے کہ وہ پستول ہی تھا؟“

وکیل استغاثہ نے اعتراض اٹھایا۔ ”جناب عالی، پستول کوئی ایسی چیز نہیں ہے کہ اسے پہچاننے میں کوئی دشواری ہوتی ہو۔ آج کا بچہ بچہ اس آتشیں ہتھیار سے واقفیت رکھتا ہے۔ وکیل صفائی کا یہ سوال طفلانہ نہیں تو اور کیا ہے؟“

میں نے کہا۔ ”میرے محترم دوست، آپ پہلے میرے سوال کو سمجھیں پھر مداخلت کی کوشش کریں۔“

وہ سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا۔ میں نے وضاحتی انداز میں کہا۔ ”میں نے گواہ فرخندہ صاحبہ سے یہ پوچھا ہے کہ آیا انہیں یقین تھا کہ اس وقت ملزم کے ہاتھ میں پستول ہی تھا۔ اس بات کو بھی پیش نظر رکھیں کہ اس وقت لائٹ گئی ہوئی تھی اور بنگلہ بہ قول گواہ فرخندہ، اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ تاریکی میں کسی شخص کے ہاتھ میں پکڑی ہوئی چیز کی شناخت کرنا کوئی آسان کام نہیں ہوتا۔“

جج نے فرخندہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”بی بی! آپ وکیل صاحب کے سوال کا جواب دیں۔“

وہ چڑ کر بولی۔ ”وہ پستول کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔ وہاں تاریکی ضرور تھی مگر میں اندھی نہیں ہوں۔“

”مجھے آپ کی بصارت پر ذرہ بھر بھی شک نہیں ہے۔۔۔ فرخندہ صاحبہ۔“ میں نے خوشگوار لہجے میں کہا۔ ”میرے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ ممکن ہے اسی وقت ملزم کے ہاتھ میں سگریٹ کا پیکٹ ہو یا کوئی سیلنڈریکل کیمرا ہو یا پاکٹ سائز، ریڈیو ہو یا کوئی ٹارچ وغیرہ ہو جسے آپ نے پستول سمجھ لیا ہو؟“

”وہ پستول ہی تھا۔“ اس نے دو ٹوک انداز میں جواب دہرایا۔

میں نے ذرا مختلف انداز میں اسے گھیرنے کی کوشش کی۔ میں نے پوچھا۔ ”فرخندہ صاحبہ، معزز عدالت کے ریکارڈ پر موجود ہے آپ کے بیان میں یہ بات شامل ہے اور دوسرے گواہوں کے بیانات سے اس بات کی تصدیق بھی ہوتی ہے کہ فائرنگ کے فوراً بعد آپ کے بنگلے کی لائٹ چلی گئی تھی اور تھوڑی ہی دیر بعد آ بھی گئی تھی۔ یہ بات ذہن میں

رہے کہ صرف آپ کے بنگلے ہی کی لائٹ تھوڑی دیر کیلئے بند ہوئی تھی۔ آپ لائٹ کے اس طرح آنکھ جھپکنے کی وضاحت کریں گی؟"

اس کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا۔ وہ لرزتی ہوئی آواز میں بولی۔

"میں۔۔ میں۔۔ بھلا کیا کہہ سکتی ہوں۔"

جج بڑی دلچسپی سے ساری کارروائی دیکھ رہا تھا۔ اب تک کی سماعت سے اس نے اندازہ لگا لیا تھا کہ حقیقت حال ویسی نہیں تھی جیسی کہ استغاثہ نے بیان کی تھی۔ یہ بات میرے موکل کے حق میں جاتی تھی۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ آفتاب والی جھوٹی گواہی کے بعد سے جج میری کارکردگی سے خاصا متاثر نظر آتا تھا۔

فرخندہ نے اٹک اٹک کر میرے سوال کا جواب دینے کے بعد امداد طلب نظروں سے وکیل استغاثہ کی جانب دیکھا تو وکیل استغاثہ پرجوش انداز میں بولا۔ "یور آنر' ہم پاکستان کے ایک شہر میں رہتے ہیں نہ کہ جاپان یا امریکہ میں جہاں لائٹ جانے کا کوئی تصور ہی نہیں ہے۔ معزز عدالت بھی اس بات سے بخوبی آگاہ ہے کہ ہمارے ملک میں لائٹ کی آنکھ مچولی ایک معمول کی بات ہے۔ وکیل صفائی خواہ مخواہ معزز گواہوں کو نروس کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اگر یہی سوال وہ "کے ای ایس سی" سے پوچھیں تو انہیں تسلی بخش جواب مل جائے گا۔"

"یور آنر!" میں نے پر تاثر لہجے میں جج کو مخاطب کیا۔ "میرے فاضل دوست کی اطلاع کیلئے عرض ہے کہ "کے ای ایس سی" نے ابھی تک ایسا کوئی فارمولا ایجاد نہیں کیا کہ صرف کسی ایک مخصوص گھر کی لائٹ کو آن آف کر سکے۔ اس سوال کا جواب تو بہتر انداز میں فرخندہ صاحبہ ہی دے سکتی ہیں یا اگر وکیل سرکار کو جواب معلوم ہو تو میرے علم میں اضافہ فرما کر شکریئے کا موقع دیں۔"

وکیل استغاثہ نے جھلا کر کہا۔ "گھر کا فیوز بھی تو اڑ سکتا ہے۔"

"رائٹ یو آر مائی ڈیئر کونسلر۔" میں نے جوشیلے لہجے میں کہا۔ وکیل استغاثہ نے اپنی دانست میں بڑا عاقلانہ جواب دیا تھا مگر میں نے اسے آڑے ہاتھوں لیا اور کہا۔ "معلومات فراہم کرنے کا بہت بہت شکریہ لیکن میرے عزیز' ابھی تک کوئی ایسا فیوز بھی ایجاد نہیں ہوا جو اڑنے کے بعد خودبخود جڑ بھی جاتا ہو۔ اس کی تشریح فرمائیں گے آپ۔"

وہ شرمندگی سے بغلیں جھانکنے لگا۔

میں نے کٹہرے کو تھام کر کھڑی ہوئی فرخندہ سے سوال کیا۔ "محترمہ فرخندہ جلیس' آپ کے چچا حضور کہاں غائب ہو گئے؟"

"میں ان کے بارے میں کچھ نہیں جانتی۔" اس نے جواب دیا۔ "یہ ان کی عادت ہے۔ کبھی کبھی وہ بغیر کسی کو بتائے دو چار روز کیلئے غائب ہو جاتے ہیں پھر خود ہی واپس بھی آ جاتے ہیں۔ اس لئے ہم ان کی فکر نہیں کرتے اور نہ ہی انہیں ڈھونڈنے کی کوشش کرتے ہیں۔"

"پہلے کی بات اور تھی محترمہ فرخندہ جلیس!" میں نے بہ نسبت سخت لہجے میں کہا۔ "معزز عدالت نے انہیں پابند کیا تھا کہ وہ اپنی مرضی سے اپنے علاقے سے باہر نہیں جائیں گے۔"

"میں بھلا کیا کہہ سکتی ہوں۔ وہ آئیں گے تو آپ ان سے پوچھئے گا۔"

"ان سے پوچھ ہی لیں گے۔ ان کی گرفتاری کے احکامات جاری ہو چکے ہیں۔" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "آپ یہ بتائیں کہ ملزم عثمانی سے آپ کی کیا دشمنی ہے؟"

"میری کسی سے کوئی دشمنی نہیں ہے۔" وہ جلدی سے بولی۔ "یہ شخص مکار اور دھوکے باز ہے۔ اس نے میرے شوہر کو تباہ کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا اور میں اپنے شوہر کو بچانا چاہتی تھی لیکن۔۔ لیکن اس ظالم نے تو ان کی جان ہی لے لی۔"

میں نے پوچھا۔ "آپ کے پاس اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ ملزم آپ کے شوہر کو تباہ کرنا چاہتا تھا؟"

"میں نے محسوس کیا تھا۔" وہ زچ ہو کر بولی۔

"محترمہ فرخندہ جلیس' عدالت انسانی جذبات اور احساسات کو نہیں مانتی' وہ ٹھوس ثبوت مانگتی ہے۔ آپ کے پاس اپنی بات کی سچائی کیلئے کوئی ثبوت ہے؟"

"آپ خواہ مخواہ بات کو لمبا کر رہے ہیں۔ ان باتوں کا اس کیس سے کیا تعلق ہے؟"

میں نے متعلقہ سوال کیا۔ ”گواہ آفتاب نے معزز عدالت کو بیان دیا ہے کہ آپ نے اور آپ کے چچا نے اسے مصنوعی بہرا بننے اور حقائق چھپانے پر مجبور کیا تھا۔ آپ نے ایسا کیوں کیا؟“

”آپ اپنی اوقات میں رہیں وکیل صاحب۔“ وہ پھٹ پڑی۔ ”اور ہاں' اب میں آپ کے کسی سوال کا جواب نہیں دوں گی۔“

”مائنڈ یور لینگویج پلیز۔“ میں نے سخت لہجے میں کہا۔ ”آپ اس وقت اپنے ڈرائنگ روم میں نہیں' عدالت کے کمرے میں کھڑی ہیں۔“

جج نے اسے سرزنش کرتے ہوئے کہا۔ ”بی بی' عدالت کے وقار کا خیال رکھو اور وکیل صاحب جو پوچھ رہے ہیں اس کا جواب دو۔“

فرخندہ نے عاقبت نا اندیشی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ”میں کسی سوال کا جواب نہیں دوں گی چاہے مجھے توہین عدالت کے جرم میں سزا ہو جائے۔“

پھر وہ وہیں کٹہرے میں بیٹھ کر رونے لگی۔ میں نے محسوس کیا کہ اس کے اعصاب جواب دے گئے تھے۔ اس کے شکستہ اعصاب کی عمارت کو مسمار کرنے کا یہ مناسب ترین موقع تھا۔ میں نے کھنکھار کر گلا صاف کیا اور روئے سخن جج کی جانب موڑتے ہوئے دلائل دینا شروع کر دیئے۔ میں نے فرخندہ کے رونے کو مطلق نظرانداز کر دیا تھا۔

”جناب عالی' میرا موکل بے گناہ ہے۔ اسے ایک سازش کے تحت پھانسنے کی کوشش کی گئی ہے۔ گواہوں کے بیانات کی روشنی میں اور جرح کے نتائج سے جو صورتحال سامنے آئی ہے اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اس کیس میں مقتول کی بیوہ فرخندہ اور اس کے چچا کلیم الدین کا کردار انتہائی مشکوک ہے۔ قاتل جو کوئی بھی ہے وہ انہی دونوں میں سے کوئی ایک ہے کیونکہ وقوعہ والی رات بنگلے میں گھر کے افراد کے سوا باہر کا کوئی آدمی موجود نہیں تھا۔“

وکیل سرکار نے مداخلت کی۔ ”میرے فاضل دوست یہ بات کیوں بھول رہے ہیں کہ اس رات ملزم جاوید عثمانی بھی وہاں موجود تھا جو ظاہر ہے باہر کا آدمی تھا پھر پوسٹ مارٹم کی رپورٹ سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ قتل ملزم کے پستول ہی سے کیا گیا ہے۔“

”مجھے اس بات میں کوئی شک نہیں ہے کہ قتل جاوید عثمانی کے پستول سے ہوا ہے۔“ میں نے دلائل جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”لیکن یہ قتل جاوید عثمانی نے نہیں بلکہ کسی اور نے کیا ہے' ملزم کا محض پستول استعمال ہوا ہے۔“ میں نے ایک لمحے توقف کر کے وکیل استغاثہ سے کہا۔ ”یہ تو بالکل ایسی بات ہے کہ ایک گاڑی جو آپ کی ملکیت ہے' اسے کوئی اور شخص ڈرائیو کرتے ہوئے حادثہ کر بیٹھتا ہے۔ اس گاڑی میں آپ موجود نہیں ہیں۔ اس حادثے کا ذمے دار آپ کو ٹھہرایا جائے کیونکہ آپ ہی اس گاڑی کے مالک ہیں' تو کیا یہ بات کسی بھی طرح جائز ہو گی۔“

”قصوروار وہی شخص ہو گا جس کے ہاتھوں حادثہ پیش آیا ہو۔“ وکیل استغاثہ نے جواب دیا۔

”میں بھی اتنی دیر سے یہی سمجھانے کی کوشش کر رہا ہوں۔“ میں نے اپنی فائلوں پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا پھر جج کی جانب مڑتے ہوئے اپنا بیان جاری رکھا۔ ”یور آنر' گواہ کلیم کے وارنٹ گرفتاری جاری ہو چکے ہیں۔ وہ جلد قانون کی گرفت میں آ جائے گا۔ معزز عدالت سے میری اتنی سی درخواست ہے کہ فرخندہ صاحبہ کو شامل تفتیش کر کے حوالہ پولیس کیا جائے کیونکہ ان کی ذات شکوک و شبہات کی دبیز چادر میں لپٹی ہوئی ہے۔ مجھے امید ہے کہ محض ایک روز کی پولیس ”مہمان نوازی“ انہیں بہت کچھ اگلنے پر مجبور کر دے گی' یہ شرافت سے زبان کھولنے والوں میں سے نہیں ہیں۔“

اس دوران میں فرخندہ نے رونا بند کر دیا تھا اور اٹھ کر کھڑی ہو گئی تھی۔ میں نے جج سے فرخندہ کو پولیس کے حوالے کرنے کی جو درخواست کی تھی اسے سن کر فرخندہ کی رہی سہی ہمت بھی جواب دے گئی تھی۔ وہ سراسیمہ نظروں سے کبھی مجھے اور کبھی جج کو دیکھ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر چھائی ہوئی فکر کی گھٹا سے اندازہ ہوتا تھا کہ اس وقت وہ اپنی زندگی کے مشکل ترین لمحات میں سے گزر رہی تھی۔ اگر وہ بے قصور تھی تو اس کی یہ حالت کیا معنی رکھتی تھی۔

اس نے نحیف آواز میں جج سے درخواست کی۔ ”جناب عالی' میں چند منٹ کیلئے تنہائی میں آپ سے کچھ ضروری بات کرنا چاہتی ہوں۔“

جج نے پر استفسار نظروں سے مجھے دیکھا پھر پوچھا۔ ”بیگ صاحب' آپ کو کوئی

اعتراض تو نہیں ہے؟"

"مجھے سخت اعتراض ہے یور آنر۔" میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ میں دراصل فرخندہ کو کوئی موقع نہیں دینا چاہتا تھا۔ جال میں آئے ہوئے شکار کو چھوڑ دینا دانش مندی نہیں تھی۔ "جناب عالی' ایسی کون سی ضروری بات ہے جو یہ آپ کے چیمبر میں کرنا چاہتی ہیں۔ حاضرین عدالت سے کیا پردہ۔ یہ تو وہ کمرا ہے جہاں حدود کے مقدمات کی سماعت بھی ہوتی ہے لیکن ساری کارروائی سب کے سامنے ہوتی ہے۔"

"بی بی' تمہیں جو کچھ کہنا ہے' سب کے سامنے کہو۔" جج نے حکم صادر کر دیا۔

وہ روہانسی آواز میں مجھ سے مخاطب ہوئی۔ "بیگ صاحب' میں مان گئی کہ آپ بہت ہوشیار اور چالاک وکیل ہیں۔ آپ نے بڑی خوبصورتی سے مجھے کارنر کر لیا ہے مگر شاید آپ انسانوں کی مجبوریوں سے واقف نہیں ہیں۔ انسان پر کبھی کبھی ایسا وقت بھی آ جاتا ہے جب اس کی بقا کو خطرہ لاحق ہو جاتا ہے' اس کی عزت اور نیک نامی داؤ پر لگ جاتی ہے اور اسے اپنے سامنے موت کھڑی نظر آنے لگتی ہے پھر وہ انتہائی قدم اٹھانے پر مجبور ہو جاتا ہے۔"

"اور پھر وہ قتل کرنے پر بھی آمادہ ہو جاتا ہے؟" میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔ میرا یہ وار وہ برداشت نہ کر سکی۔

فرخندہ نے اچانک چیخنا شروع کر دیا۔ "میں قاتل نہیں ہوں۔۔۔ میں نے کسی کو قتل نہیں کیا۔۔۔ میں بے گناہ ہوں' بے قصور ہوں۔ اصل قصور وار۔۔۔ قاتل کوئی اور ہے۔ میں اس سے تعاون کرنے پر مجبور تھی۔ اس نے میری زندگی جہنم بنا کر رکھ دی تھی۔ نہ جینا میرے بس میں تھا اور نہ مرنا میری دسترس میں۔ وہ خبیث مجھے بلیک میل کر رہا تھا۔ اس نے میری خوشیوں بھری زندگی میں اپنی سازش کا زہر گھول دیا تھا۔ میں اب اور برداشت نہیں کر سکتی۔ کیا رشتے ناتے اتنے مکروہ شکل بھی اختیار کر سکتے ہیں کہ۔۔۔" پھر وہ وہیں کٹہرے میں گر کر بے ہوش گئی۔

صورتحال اچانک ایک ایسے موڑ پر آ گئی تھی کہ عدالت میں موجود ہر شخص ششدر رہ گیا تھا۔ جج نے عارضی طور پر کارروائی روک دی اور اٹھ کر اپنے چیمبر میں چلا گیا۔

○

پولیس کی تحویل میں فرخندہ نے ہوش میں آنے کے بعد جو اقبالی بیان دیا وہ بڑا لرزہ خیز تھا۔ اس نے بتایا کہ درحقیقت اس کے شوہر نے اسے طلاق نہیں دی تھی اور نہ ہی اس نے عدالت سے خلع حاصل کیا تھا۔ خلع والا قصہ تو اس نے اپنی پوزیشن صاف کرنے کیلئے گھڑ رکھا تھا۔ اس کا شوہر اس کو چھوڑ کر ایسا گیا کہ پھر پلٹ کر اس نے خبر ہی نہ لی۔ جے جے گارمنٹس میں کام کے دوران میں جلیس احمد اس پر مہربان ہونے لگا تو اس نے بھی جلیس احمد کی حوصلہ افزائی کی لیکن اسے اس بات سے بے خبر رکھا کہ وہ پہلے سے شادی شدہ ہے۔ دراصل وہ اپنے تئیں ماضی کو دفن کر چکی تھی اور اب اسے کریدنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ اسے احساس نہیں تھا کہ وہ نادانی میں کتنا بڑا گناہ کرنے جا رہی تھی۔ اسی دوران میں اس کا رشتے کا چچا وارد ہوا۔ فرخندہ نے اس کی بے روزگاری پر ترس کھا کر اسے جے جے گارمنٹس میں ایک اچھی ملازمت دلوا دی۔ جلیس احمد سے شادی سے پہلے فرخندہ نے اپنے چچا کلیم الدین سے بھی مشورہ کیا۔ کلیم الدین نے اس کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے فرخندہ کے اس فیصلے کو سراہا چنانچہ فرخندہ کی شادی جلیس احمد سے ہو گئی۔ بعد ازاں کلیم الدین بھی انہی کے ساتھ رہنے لگا۔

اب یہاں سے ایک نیا کھیل شروع ہوا۔ کلیم الدین اس راز سے واقف تھا کہ فرخندہ کو پہلے شوہر سے طلاق نہیں ہوئی تھی۔ اس کی کمینی فطرت نے ہاتھ پاؤں پھیلائے اور اس نے فرخندہ کو بلیک میل کرنا شروع کر دیا۔ فرخندہ درحقیقت ایک ایسے مقام پر کھڑی تھی کہ وہ کلیم الدین کی ہر بات ماننے پر مجبور تھی۔ اس نے اپنے خبیث چچا کے چنگل سے نکلنے کیلئے ہر ممکن کوشش کی۔ اسے بڑی سے بڑی رقم کا لالچ دیا کہ وہ اس کا پیچھا چھوڑ دے اور کہیں چلا جائے مگر کلیم الدین ایک کائیاں شخص تھا۔ وہ سونے کا انڈا دینے والی مرغی کو ذبح نہیں کر سکتا تھا۔ بالآخر فرخندہ نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنے شوہر کے ساتھ کسی دوسرے ملک چلی جائے گی۔ اس مقصد کیلئے اس نے عملی کوشش بھی شروع کر دی تھی مگر کلیم الدین کو اس منصوبے کی بھنک مل گئی اور اس نے جلیس احمد کے قتل کا منصوبہ بنا لیا۔ وہ بھی اس طرح کہ اس قتل کا الزام جلیس احمد کے پارٹنر جاوید عثمانی پر

آئے۔ کلیم الدین نے فرخندہ کو اس سب کیلئے کس طرح تیار کیا' یہ ایک طولانی داستان ہے۔ فرخندہ کی ایک ایسی کمزوری کلیم الدین کے ہاتھ میں تھی کہ وہ دم نہیں مار سکتی تھی۔ فرخندہ کی بے بسی کا اندازہ وہی لوگ لگا سکتے ہیں جو کبھی کسی بلیک میلر کے ہاتھوں بلیک میلنگ کے عذاب سے گزر چکے ہوں۔

وقوعہ والے روز جب جاوید عثمانی وہاں پہنچ چکا تو کلیم الدین نے اس کی گاڑی کے ڈیش بورڈ سے پستول نکال لیا۔ اسے یہ بات پہلے سے معلوم تھی کہ جاوید عثمانی اپنا پستول کہاں--- رکھتا تھا۔ گاڑی اگرچہ لاک تھی مگر یہ کلیم الدین کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ جاوید عثمانی کی ایک عادت تھی کہ وہ ہمیشہ کھڑکیوں کی جانب والے صوفے پر بیٹھتا تھا۔ اس کی اس عادت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کلیم الدین نے دن ہی میں کھڑکیوں کو کھول کر پردہ کچھ اس انداز میں سرکا دیا تھا کہ اندر سے یہ گڑبڑ محسوس نہیں کی جا سکتی تھی لیکن اس مقام سے کھڑکیوں کے باہر کھڑے ہو کر بہ آسانی جلیس احمد کو نشانہ بنایا جا سکتا تھا۔ پروگرام کے مطابق کلیم الدین نے جلیس احمد کو قتل کیا۔ اس کے ساتھ ہی پہلے سے تیار فرخندہ نے مین سوئچ آف کر دیا۔ وہ موسم سرما کی ایک رات تھی۔ فرخندہ اور کلیم الدین نے دستانے پہن رکھے تھے۔ اس لئے پستول پر ان کی انگلیوں کے نشان ثبت نہ ہو سکے۔ جلیس احمد کو قتل کرنے کے بعد کلیم الدین نے پستول فرخندہ کو تھمایا اور خود جا کر مین سوئچ آن کر دیا۔

فرخندہ اس دوران میں چیختی ہوئی ڈرائنگ روم کے دروازے کی جانب بڑھ چکی تھی۔ جاوید عثمانی پر نظر پڑتے ہی وہ اس سے چمٹ گئی اور زور زور سے چلانا شروع کر دیا۔ جاوید عثمانی پہلے ہی بہت بوکھلایا ہوا تھا۔ اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے فرخندہ نے کمال ہوشیاری سے پستول جاوید عثمانی کے کوٹ کی جیب میں ڈال دیا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ سب ویسے ہی تھا' جیسا پہلے بیان کیا جا چکا تھا۔ پولیس کی آمد سے قبل ہی دونوں چچا بھتیجی نے اپنے ملازم آفتاب کو اپنی مرضی کا بیان دینے کیلئے ہدایت کر دی تھی۔ وہ ان کے ایما پر حق نمک ادا کرتے ہوئے مصنوعی بہرا بن گیا۔

چار روز بعد پولیس نے کلیم الدین کو بھی گرفتار کر لیا۔ وہ بہت ہوشیار آدمی تھا۔ جب اسے پتہ چلا کہ فرخندہ سارا کچا چٹھا کھول چکی ہے تو اس نے پولیس کی مار سے بچنے

کیلئے اقبال جرم کر لیا۔

آئندہ پیشی پر جج نے پولیس کو نیا چالان پیش کرنے کی ہدایت کی اور میرے موکل جاوید عثمانی کی درخواست ضمانت منظور کر لی۔ **دو پیشیوں** کے بعد جج نے جاوید عثمانی کو باعزت بری کر دیا۔

کلیم الدین قتل عمد اور فرخندہ اعانت جرم و شوہر کی موجودگی میں دوسری شادی کرنے کے جرم میں جیل کاٹ رہے ہیں۔

جب انسان کے دل میں کچرا بھر جائے تو پھر اس کی آنکھوں پر پردہ پڑ جاتا ہے' چہرے پر نقاب چڑھ جاتا ہے۔ پھر اس کی کوئی پہچان نہیں رہتی' آئینے میں اس کا عکس نہیں ابھرتا۔

○

# زن تماشہ

حقیقی خوشی کا راز محبت میں مضمر ہے اور محبت ہر انسان کا پیدائشی حق ہے مگر اس دینا میں اکثر لوگ اپنے اس پیدائشی حق سے محروم نظر آتے ہیں۔ ایسے افراد جو اس نعمت خداوندی سے مالا مال نظر آتے ہیں' اگر ان کی زندگی کو گہرائی میں کریدا جائے تو یہ حقیقت کھل کر سامنے آتی ہے کہ بظاہر خوش و خرم اور محبت سے معمور دکھائی دینے والوں کی اکثریت اندر سے انتہائی مغموم اور شکستہ دل ہے جو کسی نہ کسی مصلحت کی بنا پر اپنی اندرونی کیفیات پر پردہ ڈال کر خود کو شاداں و فرحاں ظاہر کرنے کی سعی مسلسل میں مصروف رہتے ہیں۔

حقیقی محبت سے محروم افراد عموماً دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو ضرورت سے زیادہ حساس اور زود رنج ہوتے ہیں۔ ایسے شیشہ مزاج لوگ پست ہمت اور کمزور عزائم کے مالک ہوتے ہیں جو ذرا ذرا سی بات پر ازخود اذیت میں مبتلا رہتے ہیں۔ ان کے پاس سوائے شکایتوں کے انبار کے اور کچھ نہیں ہوتا۔ اپنے رویوں سے یہ دوسروں کے لئے وبال جان بن جاتے ہیں۔ نتیجے میں دوسرے ان سے کترانے لگتے ہیں اور انہیں نظرانداز کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

دوسری قسم کے افراد وہ ہیں جو ناانصافی اور معاشرتی جبر کے ہاتھوں محرومیوں کا شکار ہو جاتے ہیں اور سچی خوشی ان سے ناتا توڑ لیتی ہے۔

جس طرح وسائل کی غیر منصفانہ تقسیم معاشرتی مسائل کو جنم دیتی ہے اسی طرح معاشرتی جبر اور احساس محرومی انسانی سوچ میں منفی پن پیدا کر دیتے ہیں۔ اس کے نتیجے میں بیشتر افراد جرائم کی راہوں پر چل نکلتے ہیں۔ جو ستم رسیدہ اپنے اندر' اس راہ پرخار کی مسافرت کی سکت نہیں پاتے وہ یا تو رات و دن کڑھتے رہتے ہیں یا انصاف کے حصول کیلئے عدالت کا دروازہ کھٹکھٹاتے ہیں۔ ایسے افراد کی تعداد بہت کم ہوتی ہے۔

عدالت کی مسند پر براجمان جج ایک غیر جانبدار منصف کا کردار ادا کرتا ہے۔ اس کے سامنے جو حالات و واقعات پیش کئے جاتے ہیں' قانون کے تقاضوں کو مدنظر رکھتے ہوئے وہ ان کی روشنی میں فیصلے صادر کرتا ہے۔ اب یہ وکلا پر منحصر ہے کہ وہ اپنے موکل کی وکالت کس طرح کرتے ہیں اور اپنے موقف کو سچ ثابت کرنے کیلئے کس نوعیت کے اور کتنے مضبوط دلائل دیتے ہیں۔ ایک کہنہ مشق وکیل اپنے منطقی' ٹھوس دلائل اور جارحانہ جرح سے کیس کا پانسہ پلٹ سکتا ہے۔ وہ ایک قاتل واقعی کو بھی باعزت بری کروا سکتا ہے۔ اس کے برعکس ایک بودا اور پھس پھسا وکیل کسی بے گناہ شخص کو بھی پھانسی چڑھنے سے نہیں بچا سکتا۔

اس طویل تمہید کے بعد میں اصل واقعے کی طرف آتا ہوں۔ اس صبح جب میں اپنے دفتر میں داخل ہوا تو انتظار گاہ خاصی آباد نظر آ رہی تھی۔ دراصل آج میں عدالت نہیں گیا تھا بلکہ کئی روز سے نہیں جا رہا تھا۔ عدالتیں سالانہ تعطیلات کے سبب بند تھیں اور میں تعطیلات گزارنے بیرون ملک گیا ہوا تھا۔ حاضرین انتظار گاہ پر ایک سرسری سی نظر ڈالتے ہوئے میں اپنے کمرے میں آ گیا۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد میری سیکریٹری نے نمبروار لوگوں کو اندر بھیجنا شروع کر دیا۔

تیسرے یا چوتھے نمبر پر جو شخص میرے چیمبر میں داخل ہوا' اسے دیکھتے ہی میں اپنی کرسی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

”رمضانی صاحب! آپ!“ میں نے مصافحے کیلئے ہاتھ بڑھاتے ہوئے خوش اخلاقی سے کہا۔

جب میں انتظار گاہ سے گزر کر اپنے کمرے میں آیا تھا تو رمضانی صاحب مجھے نظر نہیں آئے تھے ممکن ہے' وہ موجود ہوں مگر سرسری نظر میں مجھے دکھائی نہ دیئے ہوں۔ رمضانی صاحب ایک ڈاکٹر ہیں۔ شہر کے ایک مہنگے ہسپتال میں آئی سپیشلسٹ ہیں۔ ان کا شمار میرے دیرینہ شناساؤں میں ہوتا ہے۔ ایک دفعہ گاڑی کے حادثے میں میری دائیں آنکھ بری طرح زخمی ہو گئی تھی۔ انہوں نے ایک مشکل آپریشن کے بعد سب کچھ ٹھیک کر

دیا تھا مگر یہ بہت عرصہ پہلے کی بات ہے۔

"بیگ صاحب! کہاں ہیں آپ؟" وہ کرسی پر بیٹھ چکے تو بولے۔ "ہم نے تو آپ کی تلاش میں کنوؤں میں بانس ڈلوا دیئے۔"

میں نے پر تشویش لہجے میں پوچھا۔ "خیریت رمضانی صاحب! میری تلاش کس سلسلے میں ہو رہی تھی؟"

"پہلے آپ یہ بتائیں کہ تھے کہاں؟"

میں نے بتایا۔ "میں ملک سے باہر گیا ہوا تھا۔" پھر بیل بجا کر چپراسی کو ٹھنڈا لانے کی ہدایت کر دی۔

"کہاں؟" انہوں نے پوچھا۔ "میں کئی مرتبہ فون کر چکا ہوں۔ آپ کی سیکریٹری نے بتایا تھا کہ آپ اسٹیٹس گئے ہوئے ہیں۔"

"جی ہاں' عدالتی چھٹیاں تھیں۔ میں نے سوچا' ذرا سیر و تفریح کر لی جائے۔ کل ہی ایلی نوائے سے واپس آیا ہوں۔"

"ایلی نوائے میں کہاں قیام تھا؟"

"منی پاکستان۔"

"اوہ—شکاگو!" رمضانی صاحب نے طویل سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ "میرا ایک بھانجا بھی اپنی فیملی کے ساتھ شکاگو ہی میں مستقل قیام پذیر ہے۔"

میں نے کہا۔ "میں اپنے بہنوئی کے پاس ٹھہرا ہوا تھا بلکہ اسی کے اصرار پر میں نے امریکہ کا رخ کیا تھا ورنہ ہر سال تو انگلینڈ جاتا ہوں۔"

چپراسی کولڈ ڈرنکس رکھ کر چلا گیا تو رمضانی صاحب نے کہا۔ "آج آپ خاصے مصروف نظر آ رہے ہیں۔ باہر انتظار گاہ میں خاصا رش لگا ہوا ہے۔"

میں سمجھ گیا کہ وہ کیا کہنا چاہتے تھے' میں نے جلدی سے کہا۔ "آپ خیریت سے تو آئے ہیں نا' کوئی مسئلہ ہو تو بتائیں؟"

"یوں جلدی میں بات نہیں ہو سکتی۔" وہ اضطراری لہجے میں بولے۔ "آپ کب تک دفتر میں بیٹھیں گے؟"

"دو تو بج ہی جائیں گے۔"

"آپ یہاں سے اٹھ کر میرے گھر آ جائیں۔ میں بھی ہسپتال سے چکر لگا آتا ہوں۔"

"گویا کوئی سنجیدہ معاملہ ہے۔"

"سنجیدہ بھی اور گمبھیر بھی۔"

پھر وہ مجھ سے ہاتھ ملا کر رخصت ہو گئے۔ ان کے جانے کے بعد میں اپنی دفتری مصروفیات میں لگ گیا۔

آخری کلائنٹ کو فارغ کرتے کرتے ڈھائی بج گئے۔ میں نے آفس بوائے سے دفتر بند کرنے کو کہا۔ سیکریٹری سے کہا کہ وہ رکشا ٹیکسی وغیرہ میں چلی جائے' آج میں اسے ڈراپ نہیں کر سکوں گا۔ اس کے بعد میں اپنی گاڑی میں بیٹھ کر رمضانی صاحب کے بنگلے پر پہنچ گیا۔ ڈاکٹر رمضانی لنچ پر میرے منتظر تھے۔ ہم نے ایک ساتھ پر تکلف کھانا کھایا پھر انہوں نے اپنا مسئلہ پوری تفصیل کے ساتھ مجھے بتایا۔

◆

تقریباً چونتیس سال قبل رمضانی صاحب کے یار غار شیخ مقبول احمد نے ایک عیسائی لڑکی جولی سے شادی کر لی تھی تاہم نکاح سے پہلے اس نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ اب وہ جولی سے عائشہ ہو گئی تھی۔ عائشہ جب تک جولی تھی' خاصی آزاد خیال تھی۔ مذہب تبدیل کرنے کے بعد اسے بہت سی پابندیوں کا سامنا کرنا پڑا تو وہ جھنجھلاہٹ کا شکار ہو گئی حالانکہ شیخ مقبول نے اسے خاصی چھوٹ دے رکھی تھی۔ کٹر مذہبی گھرانوں میں جو طور طریقے رائج ہوتے ہیں ان کی سختی کا سایہ تک عائشہ پر نہیں پڑا تھا۔ لیکن چونکہ وہ آزاد ماحول کی پروردہ تھی اسی لئے اسے یہ برائے نام پابندیاں بھی کھلنے لگی تھیں۔

عائشہ حسن بے مثال کی مالک ایک پر کشش اور دلکش عورت تھی۔ اگر شیخ مقبول کا دل اس کے حسن و جمال کا اسیر ہو گیا تھا تو اس میں اچنبھے کی کوئی بات نہیں تھی۔ شادی سے پہلے جولی کے بے تکلف دوست اس کی خوبصورتی کی بنا پر اسے جولیٹ کہہ کر پکارتے تھے۔ جولی کا' اسلام قبول کر کے شیخ مقبول احمد سے شادی کر لینا جولی کے دوستوں کو ایک آنکھ نہیں بھایا تھا۔ انہوں نے کوئی غیر معمولی رد عمل تو ظاہر نہیں کیا تاہم وہ شیخ

مقبول احمد سے جیسے ادھار کھائے بیٹھے تھے۔

شادی کے دوسرے سال اللہ نے شیخ مقبول کو بیٹی ایسی نعمت سے نوازا۔ شیخ مقبول ایک صاحب حیثیت شخص تھا۔ اس کا کاروں کا شو روم تھا۔ گھر میں کسی چیز کی کمی نہ تھی۔ نائلہ کی آمد کے بعد تو گویا جو کمی تھی وہ بھی پوری ہو گئی تھی۔ شادی کے فوراً بعد ہی عائشہ نے بھی شوہر کا کاروبار میں ہاتھ بٹانا شروع کر دیا تھا۔ وہ خالد بن ولید روڈ پر واقع "شیخ موٹرز" کے دفتر باقاعدگی سے جاتی اور حتی المقدور شیخ مقبول کی مدد کرتی۔ شیخ موٹرز کا دفتر شو روم کے اوپر ہی بنا ہوا تھا۔ شیخ مقبول جاپان اور دیگر ممالک سے نئی کاریں امپورٹ کرکے فروخت کرتے تھے۔

زندگی ہنسی خوشی امن و چین سے گزر رہی تھی کہ ایک روز اس مختصر فیملی میں ایک طوفان بلا خیز نے سر اٹھایا۔

عائشہ اس روز دفتر نہیں آئی تھی۔ اسے نائلہ کو ایک چائلڈ اسپیشلسٹ کو دکھانے جانا تھا۔ نائلہ اب پانچویں سال میں لگ چکی تھی اور اسکول جانے لگی تھی۔ عائشہ کی غیر موجودگی کی وجہ سے شیخ مقبول کی مصروفیت بڑھ گئی تھی۔ آج اسے سر اٹھانے کی فرصت نہیں تھی مگر اس ٹیلی فون نے اس کا انہماک درہم برہم کر دیا۔

"ہیلو!" شیخ مقبول نے ریسیور کان سے لگاتے ہوئے حسب معمول خوش اخلاقی سے کہا۔

"جولیٹ سے بات ہو سکتی ہے۔" دوسری طرف سے غیرمانوس آواز میں پوچھا گیا۔ شیخ مقبول اس مردانہ آواز سے ناواقف تھا۔

"کون جولیٹ؟"

"اوہ سوری۔" معذرت خواہانہ لہجے میں کہا گیا مگر اس معذرت میں بھی طنز کا عنصر نمایاں تھا۔ "میرا مطلب جولی سے تھا۔"

شیخ مقبول کو مخاطب کے انداز پر بہت غصہ آیا مگر اس نے تحمل کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ "یہاں پر کوئی جولی نہیں ہوتی۔" اتنا کہہ کر اس نے ریسیور رکھ دیا۔

چند لمحوں بعد فون کی گھنٹی پھر بجی۔ تیسری بیل پر شیخ مقبول نے فون اٹینڈ کیا۔ دوسری جانب وہی شخص تھا۔

"یہ شیخ موٹرز کا دفتر ہے؟"

"جی ہاں۔"

"میں جولی سے بات کرنا چاہتا ہوں۔" اس نے اپنی خواہش کو دہرایا۔ "وہ یہاں موجود ہوں تو میری بات کروا دیں۔"

"آپ کی تعریف؟" اس مرتبہ شیخ مقبول نے معتدل لہجے میں سوال کیا۔

"میں جولی کا کزن بات کر رہا ہو--- رومیو۔"

"اگر آپ جولی کے کزن ہیں تو آپ کو یہ بھی معلوم ہو گا کہ وہ اب جولی نہیں' عائشہ ہے۔" شیخ مقبول کے لہجے سے برہمی جھلک رہی تھی۔

دوسری طرف سے بولنے والے رومیو نے کہا۔ "اگر میرا اندازہ غلط نہیں ہے تو آپ جولی--- میرا مطلب ہے' عائشہ کے شوہر ہیں۔"

"آپ کا خیال درست ہے۔"

رومیو نے کہا۔ "میں کافی عرصے کے بعد پاکستان آیا ہوں۔ آئی وانٹ ٹو سی جولی۔"

"فی الحال یہ ممکن نہیں ہے۔" شیخ مقبول نے بتایا۔ "آج وہ دفتر نہیں آئیں۔ آپ کو کوئی پیغام دینا ہو تو بتا دیں۔ میں ان تک پہنچا دوں گا۔"

رومیو شیخ مقبول کی تجویز کو نظرانداز کرتے ہوئے بولا۔ "گھر کا فون نمبر دے دیں۔ میں جولی سے وہیں بات کر لیتا ہوں۔"

بار بار جولی کے ذکر سے شیخ مقبول کو کوفت محسوس ہونے لگی تھی۔ اس نے جھلاہٹ آمیز لہجے میں کہا۔ "میں عائشہ کی اجازت کے بغیر آپ کو فون نمبر نہیں دے سکتا۔ آپ کل ٹرائی کر لیں۔ معذرت کے ساتھ۔"

اس کی بات ختم ہونے سے پہلے ہی رومیو نے ریسیور کریڈل پر رکھ دیا تھا۔

شیخ مقبول نے گھر ٹیلی فون کیا۔ اس وقت تک عائشہ' نائلہ کا چیک اپ کروا کے واپس آ چکی تھی۔

"تمہارا کوئی کزن رومیو ہے؟" شیخ مقبول نے چھوٹتے ہی پوچھا۔

دوسری جانب گمبھیر خاموشی چھا گئی۔ شیخ مقبول نے بے تابی سے کہا۔ "ہیلو عائشہ تم لائن پر تو ہو؟"

عائشہ کی بوجھل آواز شیخ مقبول کے کانوں تک پہنچی۔ "ہیلو، کیا بات ہے۔ خیریت تو ہے۔ کیسے فون کیا؟"

"میں نے تم سے کچھ پوچھا تھا؟"

"کیا؟"

شیخ مقبول نے بیوی کی بے نیازی کو نظرانداز کرتے ہوئے اپنا سوال دہرایا۔ "رومیو کو جانتی ہو؟"

عائشہ نے قدرے پراعتماد لہجے میں کہا۔ "اس دنیا میں ہزاروں رومیو ہیں۔ تم کس کو پوچھ رہے ہو؟"

"میں تمہارے کزن رومیو کی بات کر رہا ہوں۔"

"اوہ—اچھا وہ!" عائشہ اب خاصی حد تک سنبھل چکی تھی۔ "مگر اس کا ذکر اس وقت کیسے آگیا۔ وہ تو عرصہ ہوا لندن چلا گیا تھا۔ میری شادی سے بھی پہلے جب میں جولیٹ ہوا کرتی تھی۔"

"وہ بھی تمہیں جولی اور جولیٹ ہی کہہ رہا تھا۔"

"کہاں مل گیا تمہیں؟" عائشہ نے جلدی سے پوچھا۔ "کیا وہ پاکستان آیا ہوا ہے؟"

"اس نے فون پر تو یہی بتایا ہے کہ کراچی ہی سے بات کر رہا ہے۔" شیخ مقبول نے کہا۔ "وہ گھر کا فون نمبر معلوم کر رہا تھا۔ تم سے کوئی ضروری بات کرنا چاہتا ہے۔"

"پھر تم نے فون نمبر دے دیا؟"

"نہیں، میں نے اسے کل دفتر ہی فون کرنے کو کہا ہے۔"

"یہ اچھا کیا تم نے۔"

عائشہ کے جواب کو شیخ مقبول کوئی واضح معنی نہ پہنا سکا۔ اس کے کہنے کا انداز ایسا تھا جیسے شیخ مقبول نے رومیو کو گھر کا نمبر نہ دے کر کسی بدتہذیبی کا مظاہرہ کیا ہو۔ بہرحال شیخ مقبول نے اس سلسلے میں دماغ سوزی کو فضول سمجھتے ہوئے عائشہ سے نائلہ کے بارے میں دو چار سوالات کیے اور فون بند کر دیا۔

رات کو شیخ مقبول گھر پہنچا تو اسے بیوی کے رویئے میں ایک خاص تبدیلی نظر آئی تاہم وہ اس تبدیلی کو سمجھنے سے قاصر تھا۔ اس کے انداز و اطوار سے لگتا تھا کہ جیسے وہ بے

حد خوش ہو مگر اس کے عمل سے اس خوشی کا اظہار نہیں ہو رہا تھا۔ شاید کسی اندرونی کشمکش سے دوچار تھی۔

دوسرے روز وہ حسب معمول دفتر پہنچے۔ وہ عموماً دس بجے تک دفتر پہنچ جاتے تھے۔ اس لئے انہیں گھر سے ساڑھے نو بجے نکلنا پڑتا تھا۔ شیخ مقبول کی رہائش نارتھ ناظم آباد میں تھی۔ شیخ مقبول ہوٹل سے کھانا پسند نہیں کرتا تھا اس لئے لنچ وہ صبح گھر ہی سے لے کر آتا تھا البتہ عائشہ ہوٹل کی تیار کردہ چیزیں بڑے ذوق و شوق سے کھاتی تھی۔

وہ لنچ سے فارغ ہوئے ہی تھے کہ رومیو کا فون آگیا۔ فون شیخ مقبول نے ریسیو کیا پھر ریسیور عائشہ کی جانب بڑھا دیا۔ شیخ مقبول بغور بیوی کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لے رہا تھا جو ہر گزرتے پل کے ساتھ تبدیل ہو رہے تھے۔ شیخ مقبول یہ تو نہیں جانتا تھا کہ دوسری جانب رومیو کیا کہہ رہا ہے تاہم اس نے ایک بات خاص طور پر نوٹ کی کہ عائشہ بڑے محتاط انداز میں بلکہ مبہم انداز میں بات کر رہی تھی۔ ان کے درمیان ہونے والی اختتامیہ گفتگو کچھ اس نوعیت کی تھی۔

"ابھی نہیں۔" عائشہ نے کہا۔

دوسری جانب سے کوئی طویل بات کی گئی جس کے جواب میں عائشہ نے صرف اتنا کہا۔ "ظاہر ہے۔"

پھر ایک طویل وقفہ آیا۔ اس کے بعد عائشہ بولی۔ "میں تمہیں بتا دوں گی۔"

چہرے کے اتار چڑھاؤ کے ساتھ وہ چند لمحے دوسری طرف کی بات سنتی رہی پھر جواباً کہا۔ "اچھا ٹھیک ہے تم اپنا فون نمبر لکھواؤ۔"

عائشہ نے ایک کاغذ پر فون نمبر نوٹ کیا پھر یہ کہہ کر ریسیور رکھ دیا۔ "میں تمہیں فون کروں گی۔"

عائشہ کے انداز گفتگو نے شیخ مقبول کو الجھا دیا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ایسی کیا بات ہو سکتی تھی جو وہ اپنے کزن سے کھل کر نہیں کہہ سکتی تھی۔ کیا وہ کوئی ایسی بات تھی جو عائشہ اس کی موجودگی مین نہیں کرنا چاہتی تھی؟ ایسا سوچتے ہوئے اسے اپنے ذہن میں کانٹے سے چبھتے محسوس ہوئے پھر اس نے خود ہی اپنے آپ کو تسلی دی کہ اسے پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے؟ اس سلسلے میں عائشہ سے بات کرنی چاہئے۔

اس رات وہ سونے کے لئے لیٹے تو شیخ مقبول نے بیوی سے کہا۔ ”بھئی خیریت تو ہے۔ بڑی راز و نیاز کی باتیں ہو رہی تھیں اپنے کزن سے؟“

”راز و نیاز کیا ہو گا۔“ عائشہ نے دوسری جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ ”وہ اتنے عرصے--- کے بعد واپس آیا ہے۔ اس سے جتنی بھی باتیں ہو جاتیں، کم تھیں۔“

”میں نے باتیں کرنے پر پابندی تھوڑی لگائی ہے۔“

”وہ تو ٹھیک ہے مگر مجھے تمہارا بھی خیال رہتا ہے نا۔“ وہ نظریں چرا کر بولی۔

”شاید تمہارے دل میں کوئی بات نہ آجائے ورنہ وہ تو---“

عائشہ نے دانستہ اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا، شیخ مقبول نے کہا۔ ”وہ تو کیا؟“

”رومیو کہہ رہا تھا کہ وہ میری دعوت--- میرا مطلب ہے کہ میں اس کی دعوت کرنا چاہتی تھی۔“ عائشہ نے بتایا۔ ”مگر تمہارا خیال آگیا۔ شاید تم اس بات کو پسند نہ کرو۔“

”اس میں ناپسندیدگی کی کیا بات ہے؟“ شیخ مقبول نے کہا۔ ”وہ تمہارا کزن ہے، غیر تھوڑی ہے۔ کزن بھائی ہی ہوتا ہے۔ تم اس کی ضرور دعوت کرو۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے بلکہ میں خود اسے دعوت دوں گا۔ تمہارے پاس اس کا فون نمبر تو ہے نا؟“

عائشہ نے اثبات میں جواب دیا۔ دوسرے روز شیخ مقبول نے ٹیلی فون کر کے رومیو کو آئندہ روز رات کے کھانے کی دعوت دے دی۔ رومیو اپنے بڑے بھائی کے پاس گلشن اقبال میں ٹھہرا ہوا تھا۔ لندن جانے سے پہلے بھی وہ یہیں رہتا تھا۔ اس کے والدین کا انتقال ہو چکا تھا۔

پھر تو ہر دوسرے روز رومیو شیخ مقبولؔ کے گھر نظر آنے لگا۔ پہلے تو شیخ مقبول اسے بیوی کا کزن سمجھ کر برداشت کرتا رہا پھر رفتہ رفتہ رومیو کی آمد اسے زہر لگنے لگی۔ اس کی آمد سے زیادہ تکلیف شیخ مقبول کو ان کی باتیں سن کر ہوتی تھی۔ وہ اتنی بے تکلفی سے عائشہ سے گھل مل رہا تھا کہ بعض اوقات تو شیخ مقبول کا خون کھولنے لگتا تھا۔ ان کے درمیان اکثر اس دور کی باتیں ہوتی تھیں جب عائشہ جولی ہوا کرتی تھی اور اس کے گرد لڑکے پروانہ وار پھرا رہتے تھے۔ عائشہ کے بے ہنگم قہقہے اور خاصی بولڈ باتیں سن کر بعض اوقات تو شیخ مقبول کو یہ محسوس ہونے لگتا تھا جیسے وہ عائشہ سے جولی کی جانب بڑی

تیزی سے واپسی کا سفر کر رہی ہو اور اب تب میں-- جولی کو چھونے ہی والی ہو۔

ایک روز تو حد ہو گئی۔ اس رات بھی رومیو ان کے گھر آیا ہوا تھا اور اس کے ساتھ اس کا ایک اور کرسچن دوست بھی تھا۔ رات کے کھانے سے پہلے رومیو نے بوتل کھول لی۔ اس کا دوست بھی اس کا ساتھ دینے لگا۔ شیخ مقبول اس وقت تک گھر نہیں پہنچا تھا۔ عائشہ سرِشام ہی گھر آگئی تھی۔ جب شیخ مقبول آیا تو عائشہ اس وقت کچن میں تھی۔ رومیو اور اس کا دوست ڈرائنگ روم میں دوسرے دور کا آغاز کر چکے تھے۔

شیخ مقبول کے ڈرائنگ روم میں پہنچنے سے پہلے ہی انہوں نے سامانِ نوش تو ادھر ادھر کر دیا مگر شیخ صاحب کو بھانپنے میں ذرا بھی دیر نہ لگی کہ وہاں تھوڑی دیر پہلے کون سی مصروفیات جاری و ساری تھیں۔ شیخ مقبول کی جگہ کوئی اور شخص ہوتا تو اس کا دماغ پھٹ جاتا یا وہ چیخنا چلانا شروع کر دیتا مگر وہ بے پناہ قوت برداشت کا مالک تھا۔ اس نے کمال تحمل کا مظاہرہ کیا اور سیدھا بیوی کے پاس کچن میں پہنچ گیا۔

”اٹ از ٹو مچ عائشہ۔ ان کتوں سے کہو کہ فوراً اس گھر سے نکل جائیں۔“

وہ مصنوعی حیرانی سجا کر بولی۔ ”کیا ہوا ہے۔ کون کتے گھر میں گھس آئے ہیں۔ کیا گیٹ پر چوکیدار موجود نہیں ہے۔“

کوئی اور شوہر ہوتا تو اس جواب پر بیوی کی چٹنی بنا کر رکھ دیتا مگر وہ قوت برداشت ہی کیا جو عورت پر ہاتھ اٹھانے سے نہ روک سکے۔ اس نے نہایت ہی ٹھہرے ہوئے مگر سنسناتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”وہ چوکیدار کے بس کے نہیں ہیں۔ تم خود جا کر انہیں ڈرائنگ روم سے ”رخصت“ کر آؤ۔“

”ڈرائنگ روم میں تو رومیو اور ٹونی بیٹھے ہوئے ہیں۔“ اب بات عائشہ کی سمجھ میں آگئی تھی۔ ”مگر وہ تو---“

”اگر مگر کچھ نہیں۔“ شیخ مقبول نے دھیمی غراہٹ سے کہا۔ ”میں جو کہہ رہا ہوں، وہ کرو۔ ورنہ میں جو کچھ کروں گا وہ شاید تم برداشت نہ کر سکو۔“

عائشہ کوئی جواب دیئے بغیر وہاں سے جانے لگی تو شیخ مقبول نے کہا۔ ”اور اپنے کزن رومیو سے کہہ دینا کہ آئندہ مجھے اپنی منحوس شکل نہ دکھائے۔“

عائشہ غصے میں پاؤں پٹختے ہوئے ڈرائنگ روم کی جانب بڑھ گئی۔ شیخ مقبول کے قدم

بیڈ روم کی طرف اٹھنے لگے۔

اس واقعے کے بعد تین روز تک دونوں میاں بیوی کے درمیان بات چیت بند رہی۔ نہایت ہی اہم امور کے بارے میں پرچی سسٹم سے کام لیا گیا۔ ننھی نائلہ ان کے بیچ پرچی رساں بنی ہوئی تھی۔ اس کا معصوم ذہن ان کے اختلاف کو سمجھنے سے قاصر تھا۔ وہ تو یہی سمجھ رہی تھی کہ شاید اس کے مما پاپا کوئی نہایت ہی دلچسپ کھیل' کھیل رہے ہیں۔ اسے واقعی پرچی رسانی میں بڑا مزہ آنے لگا تھا۔ اس دوران میں عائشہ نے دفتر کا رخ نہیں کیا تھا۔ شیخ مقبول نہیں جانتا تھا کہ اس کی رومیو سے ٹیلی فون پر بات ہو رہی تھی یا نہیں۔ دونوں کے فون نمبر ایک دوسرے کے پاس موجود تھے۔ البتہ اتنا ضرور ہوا تھا کہ رومیو پھر اسے نظر نہیں آیا تھا' نہ دفتر میں اور نہ گھر میں۔ اس کے لئے یہ ایک اطمینان بخش صورتحال تھی۔

چوتھے روز عائشہ نے بھی دفتر جانا شروع کر دیا اور حالات معمول پر آ گئے۔ اس کے ساتھ ہی اس نے گھر میں توجہ دینا کم کر دی تھی۔ دفتر سے بھی وہ دن میں کبھی ایک بار اور کبھی دو تین بار اٹھ کر گھنٹے دو گھنٹے کیلئے باہر چلی جاتی تھی۔ شیخ مقبول کے دل میں عائشہ کی جانب سے جو غصہ بھرا ہوا تھا' وہ جاتا رہا تھا مگر اس نئی صورت حالات نے اسے ایک مرتبہ پھر پریشان کر دیا۔ عائشہ کے بارے میں کسی غلط زاویئے سے سوچنے کو اس کا دل راضی نہیں ہوتا تھا مگر حالات کا تقاضا تھا کہ وہ عائشہ کی نئی مصروفیات پر کڑی نظر رکھے۔ آخر اس نے اپنے ایک قابل اعتماد ملازم کو عائشہ کی نگرانی بہ الفاظ دیگر جاسوسی پر مامور کر دیا۔

ایک ماہ کے بعد اسے قابل اعتماد ملازم نے جو ناقابل یقین رپورٹ دی اسے سن کر شیخ مقبول کے مضبوط اعصاب چٹخنے لگے۔ اس دوران میں عائشہ دس مرتبہ رومیو سے ملی تھی۔ تین بار اس کے گھر پر گلشن اقبال میں' دو مرتبہ رومیو کے مختلف دوستوں کے گھر میں اور پانچ دفعہ شہر کے مختلف' خواب ناک ماحول مہیا کرنے والے ریستورانوں میں۔ اگر کوئی اور شخص اسے اس کی بیوی کے لچھنوں کے بارے میں بتاتا تو شاید اسے یقین نہ آتا۔ پھر بھی اتمام حجت کے طور پر اس نے ایک مرتبہ خود بھی عائشہ کا تعاقب کیا اور قابل اعتماد ملازم کی رپورٹ کو صد فی صد درست پایا۔

شیخ مقبول نے ایک حقیقت پسند انسان کی طرح اس تلخ حقیقت کو تسلیم کر لیا۔

اسی رات شیخ مقبول نے عائشہ سے کھلم کھلا بات کر لی۔ "میں نہ تو تم سے بے وفائی کا شکوہ کروں گا اور نہ ہی تمہاری واپسی کیلئے کوئی کوشش۔"

عائشہ بخوبی سمجھ چکی تھی کہ اس کا شوہر کس سلسلے میں بات کر رہا تھا۔

"میں اپنے کئے پر نادم نہیں ہوں۔" وہ شیخ مقبول کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔ "آئی لو ودھ رومیو۔"

مغربی تہذیب کی دل دادہ عورت سے اور کیا توقع کی جا سکتی تھی۔ عائشہ نے اسلام ضرور قبول کر لیا تھا مگر اسلام کے زریں اصولوں کے ڈھانچے میں خود کو پوری طرح ڈھال نہیں سکی تھی۔ وہ اندر سے اب بھی وہی آزاد خیال اور بے باک عورت تھی۔ بس وقتی طور پر اس کے انداز کچھ تبدیل ہو گئے تھے۔ اپنی بیوی کے منہ سے غیر مرد کیلئے محبت میں ڈوبے ہوئے وہ الفاظ سن کر شیخ مقبول کا دماغ جھنجھنا اٹھا تھا مگر وہ اس نظریئے کا قائل تھا کہ اپنے جسم کے ناکارہ حصے کو ساتھ ساتھ گھسیٹنے کے بجائے کاٹ کر علیحدہ کر دینا چاہئے۔ عائشہ اب اس کیلئے عضو معطل سے زیادہ کوئی اہمیت نہیں رکھتی تھی۔

"اب تمہارا کیا پروگرام ہے؟"

وہ اتنے سرسری سے لہجے میں پوچھ رہا تھا جیسے کہہ رہا ہو' آج رات کھانے کا کیا پروگرام ہے؟ اس کا آئینہ دل چور ہو چکا تھا مگر اس کے لبوں پر حرف شکایت تک نہیں آیا تھا۔ اگرچہ بظاہر یہ ایک غیر انسانی رویہ دکھائی دیتا ہے مگر دنیا میں ایسے لوگ بھی پائے جاتے ہیں جو شکایت کے نام سے نا آشنا ہوتے ہیں۔

"آئی وانٹ ڈائیورس۔" عائشہ نے ٹھوس لہجے میں جواب دیا۔

"نائلہ کا کیا ہو گا؟"

"تم اسے اپنے پاس رکھ سکتے ہو۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔"

"ٹھیک ہے' میں کل تمہاری خواہش پوری کر دوں گا جولی۔"

عائشہ نے چونک کر شیخ مقبول کی طرف دیکھا مگر وہ وہاں سے اٹھ چکا تھا۔ دوسرے بیڈ روم میں جا کر اس نے دروازہ اندر سے بند کر لیا تھا۔ وہ دراصل نائلہ کا کمرا تھا۔ وہ اس وقت اپنے بستر پر محو خواب تھی۔ اس بات سے بے خبر کہ اس کے والدین کے بیچ کیا

طے پایا ہے اور کل سے اس کی نئی زندگی کا آغاز ہونے والا ہے۔

عائشہ نے شیخ مقبول کے جاتے ہی رومیو کو ٹیلی فون کیا۔ وہ خاصی دیر تک اس سے رومانی باتیں کرتی رہی پھر اطمینان سے بستر پر پھیل کر سو گئی۔ دوسرے کمرے میں شیخ مقبول پوری رات ننھی نائلہ کے سرہانے ٹہلتا رہا تھا۔ وہ جلد از جلد اس رات کی صبح دیکھنے کا شدت سے خواہاں تھا۔

وہ رات، ایک ہی گھر کے دو مختلف کمروں میں دو مختلف انسانوں نے دو مختلف انداز میں گزاری تھی۔ اپنے اپنے عذاب کی بات ہے۔

اس واقعہ کے ایک سال بعد شیخ مقبول نے ایک گھریلو عورت سلطانہ سے شادی کر لی تھی۔ جس کے بطن سے ایک سال بعد شیخ مقبول کی دوسری اولاد فضیلہ پیدا ہوئی۔ نائلہ اور فضیلہ کی عمروں میں سات سال کا فرق تھا پھر عمر بھر شیخ مقبول کی زبان پر اپنی سابق بیوی کا نام تک نہ آیا۔ وہ اس کی زندگی سے اس طرح نکل گئی تھی جیسے کسی بیوہ کے آنسو دوپٹے میں جذب ہو کر اپنا نشان کھو بیٹھیں۔

شیخ مقبول نے دونوں بیٹیوں کے درمیان کسی بھی موقع پر تفریق نہیں ڈالی۔ نائلہ اور فضیلہ کو کسی بھی وقت یہ احساس نہیں ہونے دیا کہ وہ دو مختلف ماؤں کی بیٹیاں ہیں اگرچہ وہ عائشہ اور سلطانہ کی بیٹیاں تھیں مگر شیخ مقبول صرف یہ جانتا تھا کہ وہ اس کی بیٹیاں ہیں۔ سلطانہ نے بھی کبھی نائلہ کو کسی شکایت کا موقع نہیں دیا۔ وہ اپنے رویئے اور حسن سلوک سے کسی بھی طرح سوتیلی ماں نہیں لگتی تھی۔

یہ سب کچھ تو تھا مگر نائلہ اور فضیلہ میں کوئی قدر مشترک نہیں تھی۔ دونوں صورت اور سیرت میں قطعی مختلف تھیں۔ نائلہ کم رو اور واجبی سی شکل و صورت کی تھی جبکہ فضیلہ انتہائی خوبرو۔ دونوں کے مزاج میں بھی زمین آسمان کا فرق تھا۔ نائلہ خوش اخلاق اور قدرے بے باک تھی تاہم فضیلہ خود سر، چڑچڑی اور منہ پھٹ واقع ہوئی تھی۔ گزرتے ہوئے وقت کے ساتھ دونوں کی خوبیاں اور خامیاں بھی پروان چڑھتی گئیں اور دونوں ایک دوسرے کی ضد نظر آنے لگیں۔ اس کے ساتھ ہی مقبول کی پریشانیوں کا آغاز ہو گیا۔

نائلہ نے جوانی کی دہلیز پر قدم رکھتے ہی اپنی ماں کے نقش قدم پر چلنا شروع کر دیا تھا۔ اس کے دوستوں میں لڑکوں کی اکثریت تھی اور وہ ان سے آزادانہ ملنا جلنا برا نہیں سمجھتی تھی۔ اس کے برعکس فضیلہ خود کو لئے دیئے رکھتی تھی۔ شیخ مقبول نے ہر ممکن طریقے سے نائلہ کو سمجھانے کی کوشش کی مگر اس کی ہر سعی رائیگاں گئی۔ نائلہ کو سمجھنا تھا نہ سمجھی۔ سلطانہ نے شروع شروع میں روک ٹوک کی تو رد عمل اس کی توقع کے برخلاف ظاہر ہوا۔ وہ نائلہ کیلئے سوتیلی ماں تھی اس لئے بھی اس نے زیادہ دخل اندازی مناسب نہ سمجھی مگر شیخ مقبول بیٹی کی سرگرمیوں کو نظرانداز نہیں کر سکتا تھا۔ وہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا مگر مجبور تھا۔ انسانیت کے دائرے کے اندر رہتے ہوئے جو اقدام بھی ممکن تھا، وہ اس نے کر دیکھا مگر بات بن نہ سکی۔ وہ رفتہ رفتہ نائلہ کی جانب سے بیزار ہوتا گیا اور اس کی طرف پدرانہ توجہ کم کر دی بلکہ بالکل ہی ختم کر دی۔ اس نے کئی بار یہ بھی سوچا کہ بیٹی کو گھر سے نکال دے یا عاق کر دے مگر وہ صرف سوچ کر رہ گیا، اس سوچ کو عملی جامہ پہنانے کی ہمت نہ کر سکا۔ نائلہ کو دیکھتے ہی اس کے تن بدن میں آگ سی لگ جاتی۔ اسے یوں محسوس ہوتا جیسے اس کے سامنے نائلہ نہیں اس کی ماں جولی کھڑی اس کا مذاق اڑا رہی ہو۔

اس دوران میں شیخ مقبول احمد کا کاروبار اس قدر پھیل چکا تھا کہ اس نے اپنی معاونت کیلئے ایک جنرل مینجر رکھ لیا تھا۔ عاصم درانی کامرس گریجویٹ تھا اور انتظامی امور کا وسیع تجربہ رکھتا تھا۔ شیخ مقبول نے اس پر اتنا اعتماد کیا کہ وہ "شیخ موٹرز" میں بیک وقت فنانشل ایڈوائزر، جنرل مینجر اور چیف اکاؤنٹنٹ بن گیا۔ عاصم درانی کی کامیابی میں اس کی صلاحیتوں کے ساتھ ساتھ اس کی چرب زبانی، چالاکی، موقع پرستی کا بھی ہاتھ شامل تھا۔ اپنے کام میں مہارت اپنی جگہ، اس نے اپنی لچھے دار باتوں سے بھی شیخ مقبول کو شیشے میں اتار لیا تھا۔ عاصم جیسے خودغرض اور لالچی انسان کیلئے "شیخ موٹرز" کھل کھیلنے کیلئے ایک وسیع میدان کی حیثیت رکھتا تھا۔

عاصم کے منصوبہ ساز ذہن نے پہلے فضیلہ کو ٹارگٹ بنایا۔ عاصم وجیہہ و شکیل نوجوان تھا پھر وہ جس قسم کی دلچسپ باتیں بنانے میں ماہر تھا، وہ خواتین کی کمزوری سمجھی جاتی تھیں مگر فضیلہ نے عاصم کی توقع کے خلاف رد عمل ظاہر کیا اور اسے گھاس نہ ڈالی۔ عاصم فضیلہ کی بے اعتنائی سے مایوس نہیں ہوا بلکہ اس نے اپنی کوششوں کی سمت تبدیل

کر دی۔ اب اس کی ساری ذہنی و جسمانی توانائیاں نائلہ کو رجھانے پھسلانے میں صرف ہو رہی تھیں۔ درحقیقت عاصم کی نظریں تو شیخ مقبول کی دولت پر لگی ہوئی تھیں۔ وہ چاہے کسی بھی ذریعے سے آئے۔ وسیلہ نائلہ بنے یا فضیلہ' اسے اس سے کوئی غرض نہیں تھی۔

نائلہ اپنے مزاج کے اعتبار سے عاصم کیلئے ترنوالہ ثابت ہوئی۔ اس کی آزاد خیالی نے عاصم کا کام آسان کر دیا۔ نائلہ نے تو اپنے التفات کی سبیل لگا رکھی تھی۔ اتنے قریب عاصم جیسا پرکشش اور ہینڈسم نوجوان اس کا قدر دان بن کر منظر عام پر آیا تو اس نے عاصم کو ویلکم کہا۔ عاصم نے اپنے آزمودہ کار فارمولوں کی مدد سے اور حد سے زیادہ بڑھی ہوئی چاپلوسی سے نائلہ کو باور کرا دیا کہ وہ دل و جان سے اس پر عاشق ہو چکا ہے اور اب اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ اس تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں ہے کہ عاصم نے نائلہ کو کس طرح اپنی محبت کا یقین دلایا۔ بہرحال نائلہ اب پوری طرح اس کے "عشق جال" میں گرفتار ہو چکی تھی۔ وہ ہر صورت میں عاصم سے شادی کی خواہاں تھی۔ عاصم کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ اس کا تیر نشانے پر بیٹھا تھا۔ وہ عنقریب ایک امیر و کبیر شخص کا داماد بننے والا تھا۔

نائلہ کے' اپنے مزاج کے خلاف عاصم سے اس قدر سنجیدہ ہو جانے میں عاصم کی مکارانہ ذہنیت کو بڑا دخل تھا۔ وہ بسا اوقات نائلہ کو فضیلہ کے خلاف بھڑکاتا رہتا تھا۔ نائلہ کی آزاد روش کو دیکھتے ہوئے شیخ مقبول احمد اکثر اوقات اسے ڈانٹتا ڈپٹتا بھی رہتا تھا۔ اس کے برعکس وہ فضیلہ سے ہمیشہ امتیازی سلوک کرتا تھا۔ نائلہ باپ سے تو شاکی تھی ہی' عاصم کی لگائی بجھائی نے اس کے دل میں فضیلہ کیلئے بھی نفرت بھر دی۔ اس نے کبھی اسے درخور اعتنا نہیں سمجھا تھا۔ اب اس بات میں کسی شک و شبہے کی گنجائش نہیں رہی تھی کہ نائلہ' عاصم پر بری طرح فریفتہ ہو چکی تھی۔

اور کسی کو تو خبر ہو یا نہ ہو مگر شیخ مقبول کو کچھ کچھ اندازہ ہو چکا تھا کہ نائلہ اور عاصم کے درمیان کیا کھچڑی پک رہی تھی۔ دلی طور پر تو وہ اس تعلق کیلئے آمادہ نہیں تھا مگر وہ نائلہ کی جانب سے اس قدر دل برداشتہ ہو چکا تھا کہ اس نے موقع غنیمت جانا۔ عاصم کی طرف سے وہ مطمئن تھا۔ نائلہ عزت سے کنارے لگ جاتی تو اس سے بڑی اور کیا بات ہو

سکتی تھی۔ وہ تو جس تباہی کی توقع لگائے بیٹھا تھا' اس کے تصور ہی سے روح فنا ہوتی تھی۔ اس نے سوچا کہ کسی مناسب وقت پر عاصم سے اس سلسلے میں کھل کر بات کرے گا۔ تاہم اس نے یہ بات ابھی اپنے تک ہی رکھی حتیٰ کہ اپنی بیوی سے بھی اس کا ذکر نہیں کیا۔

عاصم اور نائلہ کے تعلقات کا علم ہونے سے پہلے وہ نائلہ سے اس قدر عاجز آ چکا تھا کہ اس نے بیٹی کیلئے دل کا آخری دروازہ بھی بند کر دیا تھا۔ وہ چاہتا تو اسے یونہی بھٹکنے کیلئے چھوڑ دیتا مگر اب اس نے اپنے دل میں نائلہ کیلئے کچھ گنجائش نکال لی تھی۔ پچھلے دنوں جب اس کی طبیعت بہت زیادہ خراب رہنے لگی تھی تو اس نے حالات و واقعات کے پیش نظر بہت اہم فیصلے کیے تھے۔ اپنی تمام منقولہ و غیر منقولہ جائیداد اس نے سلطانہ کے نام کر دی تھی۔ کاروں کا کاروبار فضیلہ کے نام کر دیا تھا۔ نائلہ کاروبار اور جائیداد کی منتقلی سے قطعی بے خبر تھی۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ گھریلو معاملات اور کاروباری امور میں ہمیشہ عدم دلچسپی کا مظاہرہ کرتی رہی تھی جب کہ فضیلہ ہر معاملے میں باپ کا ہاتھ بٹانے کی کوشش کرتی تھی۔

تاہم اب صورتحال ذرا تبدیل ہو گئی تھی۔ شیخ مقبول نے فیصلہ کیا تھا کہ حج سے واپسی پر وہ عاصم سے نائلہ کے معاملے پر تفصیلی بات کرے گا مگر تقدیر اس کے فیصلے پر مسکرا رہی تھی۔ انسان پتہ نہیں کیا کیا سوچتا ہے مگر ہوتا وہی ہے جو ہونا ہوتا ہے۔

شیخ مقبول کو حج سے واپسی نصیب نہیں ہوئی۔ دوران طواف بیت اللہ میں اس کی حرکت قلب جواب دے گئی۔ اس کی تو لاش بھی واپس نہ آ سکی۔ وہیں اجتماعی تدفین ہوئی۔

اپنی موت سے پہلے شیخ صاحب نے کاروبار اور جائیداد کے بارے میں جو خفیہ فیصلے کر رکھے تھے وہ زیادہ دیر تک پوشیدہ نہ رہ سکے۔ جب نائلہ کو پتہ چلا کہ اسے دودھ کی مکھی کی طرح نکال پھینکا گیا ہے تو وہ چراغ پا ہو گئی۔ اس نے سوتیلی ماں اور بہن کو بے نقط سنائیں اور اپنے ساتھ ہونے والی زیادتی کا ذمے دار انہیں ہی ٹھہرایا۔ نائلہ کے نام سے شیخ مقبول نے ایک لاکھ روپے کے ڈیفنس سیونگ سرٹیفکیٹس لے رکھے تھے۔ جب سلطانہ نے وہ سرٹیفکیٹس اسے دینا چاہے تو اس نے جھپٹ کر وہ سرٹیفکیٹس اپنی سوتیلی ماں کے ہاتھ سے چھین لئے پھر ان کے پرزے پرزے کرتے ہوئے اس کے منہ پر اچھال

دیا۔

”یہ بھی تم ہی رکھو میں کوئی بھک منگی نہیں ہوں۔“ نائلہ نے تنتناتے ہوئے کہا۔ ”مجھ پر رحم کھانے کی ضرورت نہیں ہے۔“

سلطانہ نے کہا۔ ”خدا گواہ ہے کہ ہمیں کچھ معلوم نہیں تھا کہ تمہارے ابا نے تمہارے لئے کچھ نہیں چھوڑا۔“

”تم جھوٹ بولتی ہو۔“ نائلہ نے غصے سے کہا۔ ”مال و جائیداد اس نے تمہارے نام کر دیا تم اس بات سے بھی بے خبر نہیں ہو کہ سارا بزنس تمہاری بیٹی کے نام ہو چکا ہے۔ مجھے جھوٹی تسلیاں دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ سوتیلے آخر سوتیلے ہی ہوتے ہیں۔ تم دونوں کے مکروہ چہرے میرے سامنے واضح ہو چکے ہیں۔“

”تم خواہ مخواہ غلط فہمی کا شکار ہو رہی ہو نائلہ۔“ فضیلہ نے کہا۔ ”ہم نے کبھی تمہارے لئے برا نہیں سوچا۔“

”بس بس‘ مجھے ایسی ہمدردی کی ضرورت نہیں ہے۔“ نائلہ نے ہاتھ ہوا میں لہراتے ہوئے کہا۔ ”میرا باپ اتنا برا نہیں تھا مگر تم دونوں کے ہاتھوں میں کھلونا بن گیا تھا۔ جس طرح میں بے گھر و بے آسرا ہوئی ہوں‘ خدا تمہیں بھی غارت کرے۔ کوڑی کوڑی کو محتاج ہو جاؤ تم دونوں۔“

”کیسی باتیں کرتی ہو بیٹی۔“ سلطانہ نے نائلہ کے رویئے کو نظرانداز کرتے ہوئے کہا۔ ”تم بے گھر و بے آسرا کیوں ہونے لگیں۔ کس کی مجال ہے جو تمہیں اس گھر سے نکالے۔ یہ گھر تمہارا بھی اتنا ہی ہے جتنا فضیلہ کا ہے۔ غصہ تھوک دو اور ٹھنڈے دل سے صورتحال پر غور کرو۔ ہم تمہارے دشمن تھوڑی ہیں۔“

نائلہ نے عجیب سے لہجے میں کہا۔ ”خوب--- بہت خوب۔ چپکے چپکے دشمنی بھی کر ڈالی اور دشمن بھی نہیں ہیں۔ میں ایسے لوگوں کو اپنا محسن کس طرح مان لوں جنہوں نے مجھے میرے حق وراثت سے محروم کر دیا۔“

سلطانہ نے اسے بازو سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچتے ہوئے کہا۔ ”ہماری نیت پر شک نہ کرو بیٹی۔ میرے لئے تم کسی بھی طرح فضیلہ سے کم نہیں ہو۔“

وہ ہاتھ جھٹک کر بولی۔ ”میں اب آپ لوگوں کی باتوں میں آنے والی نہیں ہوں۔“

”تم سمجھنے کی کوشش کرو---“

”اب سمجھنے کیلئے کیا بچا ہے۔“ وہ فضیلہ کی بات کو کاٹتے ہوئے بولی۔ ”سب کچھ آپ لوگوں کو مبارک ہو۔ میں بھی اپنا کچھ نہ کچھ انتظام کر ہی لوں گی۔“

”نادانی کی باتیں نہ کرو نائلہ۔“ سلطانہ نے قدرے نرم لہجے میں کہا۔ ”تم کہیں نہیں جاؤ گی۔“

”میں جاؤں گی اور ضرور جاؤں گی۔“

”تم اس وقت غصے میں ہو۔ میرا مشورہ ہے کہ اپنے کمرے میں جا کر آرام کرو۔ صبح اس موضوع پر بات کریں گے۔“ سلطانہ نے تسلی آمیز انداز میں کہا۔

نائلہ کوئی جواب دیئے بغیر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ تاہم وہ دل میں فیصلہ کر چکی تھی کہ اب اس گھر میں زیادہ دیر نہیں ٹکے گی۔

دوسرے روز اس نے عاصم سے ملاقات کی۔ یہ ملاقات آفس کے بجائے ایک ریستوران میں ہوئی تھی۔ شیخ مقبول کی موت کو لگ بھگ دو ماہ گزر چکے تھے۔ عاصم درانی تمام صورتحال سے بخوبی آگاہ ہو چکا تھا۔ اس کا منصوبہ خاک میں مل گیا تھا۔ جس کشتی پر سوار ہو کر اس نے منزل پر پہنچنا چاہا تھا‘ بیچ سمندر میں‘ اس کشتی میں اچانک ایک شگاف پیدا ہو گیا تھا۔ منزل کے حصول سے زیادہ اب اسے اپنی بقا کی فکر تھی۔ اس کے منصوبہ ساز ذہن نے فوراً ایک اور ترکیب سوچ لی۔ وہ رفتہ رفتہ نائلہ سے دور ہونے لگا‘ اسکے برعکس اس کی ساری توجہ اب سلطانہ کی خوشنودی حاصل کرنے میں لگی ہوئی تھی۔ اس مرتبہ وہ فضیلہ کو براستہ سلطانہ شکار کرنا چاہتا تھا۔ سلطانہ کی نظروں میں اپنی اہمیت کو ثابت کرنے کے لئے وہ رات دن ”شیخ موٹرز“ کی ترقی کیلئے محنت کر رہا تھا۔ اس نے کام کو اس طرح خود پر لاد رکھا تھا کہ اس سلسلے میں سلطانہ یا فضیلہ کو شیخ مقبول کی کمی کا احساس نہیں ہونے دیا تھا۔ نائلہ کی اب اس کی نظر میں کوئی وقعت نہیں تھی۔ وہ ایک پٹے ہوئے مہرے سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی تھی۔

”تم کچھ بدلے بدلے سے لگ رہے ہو۔“ نائلہ نے عاصم سے کہا۔ ”کافی دنوں سے میں محسوس کر رہی ہوں کہ تم مجھ پر توجہ نہیں دے رہے ہو؟“

وہ نظریں چراتے ہوئے بولا۔ ”تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔ ایسی تو کوئی بات نہیں

ہے۔"

"پھر کیا بات ہے؟"

اس نے بات بناتے ہوئے کہا۔ "شیخ صاحب کی وفات کے بعد آفس کا کام اس قدر بڑھ گیا ہے کہ۔۔۔"

"جہنم میں گیا آفس اور کام۔" وہ قطع کلامی کرتے ہوئے بولی۔ "بس اب تم یہ کام نہیں کرو گے۔"

"کیا مطلب؟" عاصم نے سوالیہ نظروں سے اس کی جانب دیکھا۔

"میں نے گھر چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔" نائلہ نے دو ٹوک لہجے میں کہا۔ "تم تو جانتے ہی ہو کہ ڈیڈی نے میرے ساتھ کتنی زیادتی کی ہے۔"

عاصم نے کہا۔ "مجھے سب معلوم ہے مگر آنٹی سلطانہ اور فضیلہ اتنی بری نہیں ہیں۔ تمہیں جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"تم اسے جذباتی ہونا کہہ رہے ہو۔" وہ غصے سے بولی۔ "اور ان سازشیوں کو اچھا کہہ رہے ہو۔ مجھے تم سے اس بات کی توقع نہیں تھی۔"

"میں نے کوئی غلط بات تو نہیں کی۔"

"تم ان کا نمک کھاتے ہو' اسی لئے تمہارے منہ میں ان ہی کی زبان بولتی ہے۔"

عاصم نے نائلہ کو غصے میں دیکھا تو سمجھ گیا کہ اس سے پیچھا چھڑانے کا یہ مناسب ترین موقع ہے۔ جواباً وہ بھی دہاڑتے ہوئے بولا۔ "تمہیں شرم آنی چاہئے ایسی باتیں کرتے ہوئے۔ تم میری توہین کر رہی ہو۔"

"اور تم تو میری عزت افزائی کر رہے ہو نا۔" وہ ترکی بہ ترکی بولی۔ "ان لوگوں کی وفاداری میں اپنی محبت کی بھی پرواہ نہیں ہے تمہیں۔"

"مجھے اپنی محبت کی پرواہ ہے اسی لئے تو کہہ رہا ہوں۔"

"کیا خاک پرواہ ہے؟"

"تمہارا دماغ خراب ہوا ہے تم اس وقت غصے میں ہو اس لئے تم سے عقل کی بات نہیں ہو سکتی۔"

دماغ تو نائلہ کا واقعی خراب ہو رہا تھا۔ اس پہ عاصم بھی خاطر خواہ اس کی حوصلہ

افزائی نہیں کر رہا تھا۔ اس سے ہمدردی جتانے کے بجائے اس کے دشمنوں کی حمایت کر رہا تھا۔ وہ کیسے برداشت کر سکتی تھی اور وہ بھی ایک ایسا شخص جسے وہ اپنا سب کچھ سمجھتی تھی۔ اسے تو مان تھا کہ وہ اس کے اشارہ ابرو پر سر تسلیم خم کر دے گا۔ اس نے عاصم سے دو ٹوک بات کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اگر نائلہ کو عاصم کی کھوکھلی محبت کا علم ہوتا تو وہ اس انداز میں کبھی بات نہ کرتی۔

"میں دودھ پیتی بچی نہیں ہوں اور نہ ہی اس وقت میں تمہارے پاس عقل سیکھنے آئی ہوں۔" نائلہ نے ترش لہجے میں کہا۔ "تم کل سے "شیخ موٹرز" کا رخ نہیں کرو گے اور نہ ہی ان دونوں سے کوئی تعلق واسطہ رکھو گے۔"

"بے وقوفی کی باتیں مت کرو۔"

"بس میں نے کہہ دیا ہے نا۔ سوچنے سمجھنے کا وقت گزر چکا ہے۔ میں ان لوگوں پر لعنت بھیج رہی ہوں۔ تم بھی ان سے الگ ہو جاؤ ہم دونوں مل کر اپنی زندگی خود اپنی محنت سے بنائیں گے۔ ہمیں کسی کی خیرات پر پلنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

عاصم نے کہا۔ "اتنا بڑا فیصلہ کرنے سے پہلے ایک مرتبہ پھر سوچ لو۔ تم اپنے ہاتھوں سے اپنے پاؤں پر کلہاڑی مار رہی ہو۔"

"مجھے کسی نقصان کی پرواہ نہیں ہے۔"

عاصم رفتہ رفتہ اسے اسی طرف لا رہا تھا جہاں پہنچ کر اس سے پیچھا چھڑانا آسان ہو جاتا۔ وہ اس کی عادت سے بخوبی واقف تھا۔ جب وہ کوئی اٹل فیصلہ کر لیتی تھی تو پھر کسی بھی قیمت پر پیچھے نہیں ہٹتی تھی۔ وہ بہت سنبھل سنبھل کر اپنے مہرے چل رہا تھا' بساط بتا رہی تھی کہ نائلہ کی شہ مات کا وقت آن پہنچا ہے۔

عاصم نے کہا۔ "تمہیں تو کسی نقصان کی پرواہ نہیں ہے مگر میں تمہیں برباد ہوتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا۔ مجھے تم سے بڑی ہمدردی ہے۔"

جانے یہ عاصم کے الفاظ کا اثر تھا یا اس کے لہجے کا کہ نائلہ چیخ کر بولی۔ "میں تھوکتی ہوں تمہاری ہمدردی پر مجھے تو غرور تھا کہ تم مجھ سے محبت کرتے ہو۔"

"تم میری بات کو غلط معنی پہنا رہی ہو۔ میرے خلوص کا مذاق اڑا رہی ہو۔"

وہ اس کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے بولی۔ "سب کو مجھ سے ہمدردی ہے۔ وہ

دونوں مجھ پر رحم کھا کر مجھے گھر میں رکھنے کو تیار ہیں۔ تمہیں بھی مجھ پر ترس آ رہا ہے۔ کاش میں نے تمہیں دل میں جگہ نہ دی ہوتی۔“ ایک لمحے کو رک کر وہ ڈرامائی انداز میں بولی۔ ”عاصم تم مجھے اچھی طرح جانتے ہو۔ میں اگر تمہیں دل میں بٹھا سکتی ہوں تو وہاں سے تمہیں نکالتے ہوئے بھی مجھے کسی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔ تمہیں معلوم ہے کہ میں ضد کی کتنی پکی ہوں۔ مجھے کبھی آزمائش میں مبتلا نہ کرنا ورنہ پچھتاؤ گے۔“

عاصم کے دل میں تو لڈو پھوٹ رہے تھے مگر اس نے اندرونی جذبات کو چہرے سے ظاہر نہیں ہونے دیا ورنہ بنا بنایا کھیل پل بھر میں بگڑ جاتا۔ ویسے اب اسے کسی بات کی ذرا بھی پرواہ نہیں تھی۔ وہ اپنے حصے کا کام ختم کر چکا تھا تاہم وہ آخری مرحلے تک کوئی بدمزگی نہیں چاہتا تھا۔

”تمہیں میری محبت کا یقین نہیں ہے کیا؟“ وہ شکایت آمیز نیم سوالیہ لہجے میں بولا۔

”جو آزمائش پر پوری نہ اترے وہ محبت ہی کیا ہے؟“

”تم نے مجھے سخت تکلیف پہنچائی ہے۔“

وہ طنزیہ لہجے میں بولی۔ ”میں نے سچی بات کی ہے اور--- سنا ہے سچ بہت کڑوا ہوتا ہے۔“

عاصم نے شاکی نظروں سے نائلہ کی جانب دیکھا اور چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپا لیا۔

نائلہ نے طنز کا ایک اور تیر برساتے ہوئے کہا۔ ”کیا ہوا‘ اب مجھ سے نظر ملانے کی تاب بھی نہیں ہے؟“

وہ چہرے پر سے ہاتھ ہٹاتے ہوئے گمبھیر لہجے میں گویا ہوا۔ ”نائلہ مجھے تم سے اس رویئے کی توقع نہیں تھی۔ محبت کی عمارت اعتماد کے ستونوں پر استوار ہوتی ہے۔ اعتماد‘ انسان کے عمل سے پیدا ہوتا ہے اور عمل کا دارومدار نیت پر ہوتا ہے۔ تم نے میری نیت پر شک کر کے میری محبت کی فلک بوس عمارت کو آج زمین بوس کر دیا ہے۔ اب میں یہاں ایک لمحہ بھی نہیں رک سکتا۔ آئی ایم ویری ڈپریسڈ۔“ پھر وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

اصولی طور پر تو اس موقع پر نائلہ کو سمجھ بوجھ سے کام لیتے ہوئے مصلحت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہئے تھا مگر ہوا اس کے برعکس۔ وہ جذبات سے مغلوب ہو کر عاقبت نا اندیشی کا مظاہرہ کر بیٹھی گویا عاصم جو چاہتا تھا‘ نائلہ نے ویسا ہی ردعمل ظاہر کیا۔ وہ

اپنی جگہ پر بیٹھے بیٹھے بولی۔

”جاتے ہو تو جاؤ مگر اتنی بات سنتے جاؤ کہ میں تمہیں سوچنے کیلئے ایک دن دیتی ہوں۔ میں کل صبح گھر پر تمہارا انتظار کروں گی۔ اگر تمہیں واقعی مجھ سے محبت ہے تو کل دفتر جانے کے بجائے میرے پاس چلے آنا۔ ہم ان لوگوں پر لعنت بھیج کر اپنی نئی زندگی کا آغاز نئے سرے سے کریں گے۔“ ایک لمحے کا توقف کر کے وہ عاصم کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سرسراتی آواز میں بولی۔ ”اور اگر تم نہ پہنچے تو میں سمجھ لوں گی کہ تمہاری محبت ایک ڈھونگ تھا‘ ایک دھوکا تھا‘ اس کے بعد تم مجھے کبھی اپنی شکل نہ دکھانا۔“

اپنی بات ختم کر کے نائلہ نے گردن جھکا دی۔ عاصم تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا ریستوران سے باہر نکل گیا۔ اس کا تیر نشانے پر بیٹھ چکا تھا۔

اس روز کے بعد سے ان کا سامنا نہیں ہوا۔ نائلہ شکستہ دل کے ساتھ اپنے ماموں کے یہاں گلشن اقبال میں اٹھ آئی تھی۔ فضیلہ اور سلطانہ نے ایک دو بار اسے واپس بلانے کی بھی کوشش کی مگر اس نے ان کی ایک نہ مانی بلکہ ایک مرتبہ تو انہیں بری طرح بے عزت کر کے گھر سے نکال دیا۔ اس کے بعد انہوں نے ادھر کا رخ نہ کیا۔

عاصم نے اپنی زندگی بیگم مقبول کی خدمت کیلئے وقف کر دی تھی۔ وہ سلطانہ کی آنکھ کا تارا بنا ہوا تھا۔ کاروبار شب و روز ترقی کی منزلیں تیز رفتاری سے طے کر رہا تھا۔ عاصم اپنی منزل سے دو گام دور تھا کہ بیگم مقبول کا انتقال ہو گیا۔ اس سانحے نے اس کی مشکل آسان کر دی۔ اس کٹھن مرحلے پر فضیلہ‘ عاصم کے کندھوں کا سہارا لینے پر مجبور ہو گئی۔ ایک سال کے اندر ندر وہ شادی کے بندھن میں بندھ چکے تھے۔ اب شیخ مقبول کی تمام دولت و جائیداد اور کاروبار کی بلا شرکت غیرے مالک و مختار صرف اور صرف فضیلہ تھی--- جو اپنے تمام جملہ حقوق بہ نام عاصم درانی تفویض کر چکی تھی۔ یہ عاصم کا خیال تھا جو کچھ ہی عرصے بعد خیال خام ثابت ہوا۔

شادی کے دو ماہ بعد ہی عاصم کو اندازہ ہو گیا کہ اسے کوئی سوا سیر مل گیا ہے۔ وہ فضیلہ کو تر نوالہ سمجھا تھا مگر وہ اس کے حلق کی ہڈی ثابت ہو رہی تھی۔ جسے نہ نگلتے چین تھا نہ اگلتے قرار۔ فضیلہ کے نزدیک عاصم کی حیثیت ایک انتہائی وفادار‘ قابل احترام ملازم سے زیادہ نہیں تھی۔ وہ فضیلہ کے ساتھ اس کے شوہر کی حیثیت سے ایک شان دار بنگلے

میں رہ تو رہا تھا مگر اس نے مالی تصرف کے جو خواب برسوں اپنی آنکھوں میں سجائے تھے، وہ اب چکنا چور ہو چکے تھے۔ مالیاتی امور سب فضیلہ کے ہاتھ میں تھے اور وہ اسے محض خرچہ پانی کیلئے ایک معقول رقم دیتی تھی جو عاصم کی نظر میں بھیک سے زیادہ کچھ نہیں تھی۔

پھر ایک روز فضیلہ اپنے بیڈ روم میں مردہ پائی گئی۔

○

یہ تھے وہ حالات و واقعات جن کے پیش نظر رمضانی صاحب نے مجھ سے ملاقات کی تھی۔ وہ مرحوم شیخ مقبول احمد کے بہت قریبی دوست تھے۔ اس حوالے سے مقتولہ فضیلہ کو وہ اپنی بیٹی ہی سمجھتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ میں فضیلہ کے قاتل کو قرار واقعی سزا دلواؤں۔ رمضانی صاحب کو یقین کامل تھا کہ فضیلہ کو اس کے شوہر عاصم ہی نے موت کے گھاٹ اتارا تھا۔ انہوں نے اپنے وثوق کے سلسلے میں جو دلائل دیئے تھے، ان سے میں قائل ہو گیا تھا۔ اس کے علاوہ بھی انہوں نے مجھے بہت کارآمد معلومات مہیا کی تھیں جن کی بنا پر میں نے یہ کیس لینے پر ہامی بھرلی تھی۔ ان حیرت انگیز معلومات کا ذکر عدالت کی کارروائی کے دوران میں مناسب موقع پر کیا جائے گا۔

میں نے وکالت نامہ نکال کر رمضانی صاحب کے سامنے رکھ دیا۔ "اسے ذرا پر کر دیں اور نیچے دستخط بھی کر دیں۔"

انہوں نے وکالت نامہ اور قلم میرے ہاتھ سے لے لیا اور مختلف کالموں کا اندراج کرنے لگے۔ فیس کے بارے میں انہوں نے مجھے بات کرنے کا موقع ہی نہیں دیا تھا۔ وکالت نامہ پر کرنے کے بعد انہوں نے ایک پھولا ہوا لفافہ جیب میں سے نکال کر میری جانب بڑھا دیا تھا۔

"یہ آپ کی خدمت میں ایک حقیر سا نذرانہ ہے۔" انہوں نے کہا۔ "یہ صرف آپ کیلئے ہے۔ اس کے علاوہ عدالتی اخراجات اور دیگر قانونی معاملات کے سلسلے میں بھی جو رقم خرچ ہو گی، وہ میں ادا کر دوں گا۔"

میں نے ان کا شکریہ ادا کیا پھر ان کے ذمے دو تین نہایت اہم کام لگا دیئے۔

"آپ دو تین روز میں مجھ سے دفتر میں آ کر ملیں۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "جب تک میں۔۔۔ کیس کی ابتدائی تیاری کر لیتا ہوں۔ اس وقت تک میں نے آپ کو جو کام سونپے ہیں وہ ضرور ہونا چاہئیں۔"

"آپ فکر ہی نہ کریں بیگ صاحب!" رمضانی صاحب نے کہا۔

اس کے بعد میں رمضانی صاحب سے رخصت کی اجازت لے کر وہاں سے چلا آیا۔

میں نے رمضانی صاحب سے جو معلومات حاصل کرنے کو کہا تھا اگر وہ اس میں کامیاب ہو جاتے تو کیس پر ہماری گرفت خاصی مضبوط ہو سکتی تھی۔ میں اپنی پوری تسلی کرنے کے بعد ہی مقدمہ دائر کرنا چاہتا تھا۔ اس سلسلے میں تھوڑی بہت بھاگ دوڑ مجھے بھی کرنا تھی۔ سب سے پہلے تو متعلقہ تھانے جا کر مبینہ قتل کے بارے میں اب تک ہونے والی تفتیش کے بارے میں واقفیت حاصل کرنا تھی۔

دوسرے روز عدالتی مصروفیات سے فارغ ہونے کے بعد میں اپنے آفس آیا، پھر واپسی میں گھر جاتے ہوئے میں تھانے پہنچ گیا۔ متعلقہ تھانے کا انچارج میرا جاننے والا تھا۔ اس سے مجھے جو معلومات حاصل ہوئیں وہ خاصی مایوس کن تھی۔ پولیس کے مطابق فضیلہ کا قتل ڈکیتی کی ایک واردات کے دوران میں ہوا تھا۔ دن دہاڑے کچھ مسلح ڈاکو بنگلے میں گھس آئے تھے۔ بنگلے کی مالکہ فضیلہ کی مزاحمت پر انہوں نے اسے گولی مار دی اور نقدی زیورات لے کر چلتے بنے۔ ان دنوں شہر میں اس قسم کی وارداتیں کچھ زیادہ ہی ہو رہی تھیں اس لئے پولیس نے بھی ذہن اور جسم کو تھکانے کی زحمت گوارا نہ کی اور مقتولہ کے شوہر کے ایمان پر نامعلوم ڈاکوؤں کے خلاف رپورٹ درج کر کے ان کی تلاش شروع کر دی۔

میں نے تھانہ انچارج سے پوچھا۔ "اور آپ کی تلاش ہنوز جاری ہے؟"

وہ میرے لہجے کے طنز کو سمجھ گیا، بولا۔ "بیگ صاحب! آپ تو جانتے ہیں کہ ہمارے پاس کوئی ایک مسئلہ نہیں ہوتا کہ تھانے کی ساری نفری اس مسئلے کو حل کرنے کیلئے لگا دیں پھر جب مدعی ہی ست ہو تو پولیس کیا کر سکتی ہے؟"

"کیا مطلب ہے آپ کا؟"

تھانہ انچارج نے بتایا۔ ”وہ جی‘ مقتولہ کا شوہر تو ایک مرتبہ بھی یہ پوچھنے نہیں آیا کہ اس کی بیوی کے قاتل گرفتار ہوئے یا نہیں۔“

اس کے جواب نے مجھے چونکا دیا تھا گویا وہ رمضانی صاحب کے موقف کی تصدیق کر رہا تھا۔ میں نے پوچھا۔ ”سنا ہے‘ ڈاکو جاتے جاتے بھاری مالیت کے طلائی زیورات اور کچھ نقدی بھی لے گئے ہیں؟“

”آپ نے ٹھیک سنا ہے۔“

”آپ کو واردات کی اطلاع کس نے دی تھی؟“

”مقتولہ کے شوہر عاصم درانی نے۔“ وہ روانی میں کہہ گیا پھر ذرا سنبھل کر بولا۔ ”سب ہم سے ہی پوچھتے جائیں گے یا اپنی آمد کا مقصد بھی بتائیں گے جناب؟“

”آپ خاصے سمجھ دار ہیں۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ آپ میری آمد کا مقصد یقیناً بھانپ گئے ہوں گے۔“

وہ زیرِ لب مسکراتے ہوئے بولا۔ ”اگر میں غلطی نہیں کر رہا ہوں تو آپ گڑے مردے اکھاڑنے کا ارادہ رکھتے ہیں؟“

”بھئی جب آپ مردوں کو یونہی ”شرافت“ سے گاڑ دیں گے تو پھر ہمیں ہی کچھ کرنا پڑے گا۔“

وہ معنی خیز انداز میں سرہلانے لگا۔ میں نے پوچھا۔ ”مقتولہ کا پوسٹ مارٹم تو ہوا ہو گا؟“

”یقیناً ہوا تھا۔“

”اس کی رپورٹ کیا بتاتی ہے؟“

وہ بولا۔ ”پوسٹ مارٹم کی رپورٹ بہت سادہ ہے۔ مقتولہ کی موت دوپہر دو اور تین بجے کے درمیان واقع ہوئی ہے۔ اس کے سینے سے اعشاریہ دو پانچ کے پسٹل کی دو گولیاں برآمد ہوئی تھیں۔ ایک گولی دل میں پیوست ہو گئی تھی جبکہ دوسری گولی نے بائیں پھیپھڑے کو مجروح کر دیا تھا۔“

عام طور پر پولیس والوں سے کوئی بات اگلوانا اور وہ بھی کسی وکیل کا‘ جوئے شیر لانے کے مترادف ہوتا ہے۔ پولیس والے‘ وکیلوں کو اپنا دشمن سمجھتے ہیں مگر یہاں معاملہ

بہت مختلف تھا۔ متعلقہ تھانہ انچارج میرا دیرینہ شناسا تھا اور ہمارے درمیان خاصی بے تکلفی پائی جاتی تھی۔

”قاتل کو کیفرِ کردار تک پہنچانا چاہتا ہوں۔“ میں نے عام سے لہجے میں کہا۔

”کوئی اشارہ تو دیں۔“

”مدعی سست گواہ چست۔“

”آئی سی۔“ اس نے ایک طویل سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ ”مگر سوچ سمجھ کر اس کیس میں ہاتھ ڈالئے گا۔ مجھے کامیابی کے امکانات بہت کم نظر آ رہے ہیں۔“

میں اس سے ہاتھ ملانے کے بعد تھانے سے نکل آیا۔

چار روز کے بعد رمضانی صاحب نے میری مطلوبہ معلومات مجھے فراہم کر دیں۔

”اور کچھ؟“ اپنی بات مکمل کرنے کے بعد انہوں نے پوچھا۔

”فی الحال یہی کافی ہے۔“ میں نے کہا۔ ”اگر اور کسی چیز کی ضرورت محسوس ہوئی تو آپ کو ضرور ـــ زحمت دوں گا۔“

”آپ کب تک مقدمہ دائر کر دیں گے؟“

میں نے حساب لگانے کے بعد کہا۔ ”ایک دو روز میں مگر آپ کو بہت محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ عاصم کو کسی بھی طرح اس معاملے کی بھنک نہیں پڑنا چاہئے۔ ورنہ وہ محتاط ہو جائے گا۔“

”آپ بے فکر ہو جائیں۔ میں آپ کی ہدایات پر سختی سے عمل کروں گا۔“ رمضانی صاحب نے کہا پھر شکریہ ادا کرنے کے بعد رخصت ہو گئے۔

◆

میں نے پوری تیاری کے بعد مقدمہ دائر کر دیا۔ عدالت نے ملزم عاصم درانی کے وارنٹ گرفتاری جاری کر دیئے اور متعلقہ تھانے کو ہدایت کی کہ وہ جلد از جلد ملزم کو عدالت میں پیش کرے۔

تیسرے روز ملزم عاصم درانی آہنی زیور پہنے عدالت کے کمرے میں موجود تھا۔ تفتیشی افسر ایک اے ایس آئی تھا۔ اس نے ملزم کو جج کے روبرو پیش کر کے سات روز کا

ون اردو ڈاٹ کام

ریمانڈ حاصل کرلیا۔ میرے لئے یہ سات روز بڑی اہمیت کے حامل تھے۔ عاصم قانون کی گرفت میں آچکا تھا۔ اس کی طرف سے میں بے فکر ہوگیا تھا۔ اس دوران میں، میں نے دوسرے کام بخوبی نمٹا لئے۔

پولیس نے اپنی تفتیش مکمل کرنے کے بعد عدالت میں چالان پیش کردیا۔

پولیس نے جائے واردات پر جو رپورٹ تیار کی تھی، اسی میں کچھ ردوبدل کر کے چالان پیش کیا تھا۔ پولیس کے بیان کے مطابق نہ تو آلہ قتل برآمد ہوا تھا، اور نہ ہی ملزم نے اس قتل کا اقرار کیا تھا۔ پولیس نے اپنی رپورٹ میں وہی موقف اختیار کیا تھا اور نفیلہ کے مبینہ قتل کو ڈاکوؤں کی کارفرمائی قرار دیا تھا۔ اس رپورٹ میں یقین دہانی کرائی گئی تھی کہ مذکورہ نامعلوم ڈاکوؤں کی گرفتاری کے لئے پولیس باقاعدگی سے چھاپے مار رہی ہے۔

مقدمے کی ابتدائی کارروائی مکمل ہونے کے بعد عدالت نے فرد جرم عائد کردی اور باقاعدہ سماعت کیلئے تاریخ دے دی۔

آئندہ پیشی پر ملزم عاصم درانی نے صحت جرم سے انکار کردیا۔ ایک بات کی وضاحت کرتا ہوں۔ کہ عام طور پر فوج داری مقدمات میں استغاثہ کی طرف سے مقدمے کی پیروی سرکاری وکیل کرتا ہے مگر یہ کوئی فارمولا نہیں ہے۔ مدعی چاہے تو اپنی مرضی سے مقدمے کی پیروی کیلئے پرائیویٹ وکیل کی خدمات بھی حاصل کرسکتا ہے۔ اس لئے عموماً پرائیویٹ وکیل سرکار کا تاثر کچھ زیادہ اچھا نہیں ہے اس لئے عموماً پرائیویٹ وکیل ہی کو ترجیح دی جاتی ہے البتہ جو لوگ پرائیویٹ وکیلوں کی بھاری فیسیں ادا کرنے۔۔ کی استطاعت نہیں رکھتے وہ سرکاری وکیل پر ہی تکیہ کرنے کیلئے مجبور ہوتے ہیں۔ اس کیس میں، میں وکیل استغاثہ تھا۔ عاصم نے اپنے لئے وکیل صفائی کا انتظام کرلیا تھا۔

جج کی ہدایت پر ملزم عاصم درانی ملزموں کے کٹہرے میں آکر کھڑا ہوا۔ اس نے سچ بولنے کا حلف اٹھایا پھر فرد جرم کی تردید کرتے ہوئے بیان دیا۔ ”وقوعہ کے روز حسب معمول اپنے ایک دوست کے ساتھ لنچ کیلئے مجھے دفتر سے باہر جانا پڑا۔ میں لنچ سے واپس آیا تو میری سیکریٹری نے بتایا کہ کسی خاتون نے فون کرکے اطلاع دی تھی کہ میرے گھر میں مسلح ڈاکو گھس آئے ہیں اور فائرنگ کی آواز آرہی ہے۔ یہ اطلاع ملتے ہی میں فوراً گھر روانہ ہوگیا مگر مجھے وہاں پہنچنے میں خاصی تاخیر ہوچکی تھی۔ ڈاکو اس سے پہلے ہی اپنا کام کرکے جاچکے تھے۔ بیڈ روم میں نفیلہ کی لاش پڑی تھی اور زیورات اور نقدی وغیرہ سب غائب تھا۔ اس کے بعد میں نے فوراً پولیس کو اطلاع کردی۔“

وہ اپنا بیان ختم کرچکا تو وکیل صفائی نے اس کے پاس جاکر ایک دو رسمی سوالات کئے۔

”عاصم صاحب! کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ فون پر آپ کو ڈکیتی کی اطلاع دینے والی خاتون کون تھی؟“

وہ پراعتماد لہجے میں بولا۔ ”فون میری سیکریٹری کنول نے سنا تھا۔ میں اس وقت لنچ پر تھا۔۔ دفتر سے باہر۔“

”آپ نے اپنے بیان میں بتایا ہے کہ اطلاع دینے والی عورت نے کہا تھا کہ اس نے ڈاکوؤں کو آپ کے گھر میں گھستے ہوئے دیکھا ہے اور گولیاں چلنے کی آواز بھی سنی ہے؟“ وکیل صفائی نے پوچھا۔ ”اس کا مطلب ہے کہ فون کرنے والی عورت آپ کے گھر کے قریب ہی رہتی ہے۔“

”بظاہر تو ایسا ہی لگتا ہے۔“

”آپ نے اپنے اڑوس پڑوس سے معلوم کیا تھا؟“

”جی ہاں۔“ وہ اثبات میں سرہلاتے ہوئے بولا۔ ”میں نے بھی سب سے پوچھا تھا اور پولیس والوں نے بھی خاصی پوچھ گچھ کی تھی مگر سب نے اس فون سے لاعلمی کا اظہار کیا تھا۔“

”عاصم صاحب!“ وکیل نے سوال کیا۔ ”آپ نے ابھی معزز عدالت کو بتایا ہے کہ جب آپ وقوعہ کے روز لنچ سے واپس آئے تو آپ کو اس واردات کی اطلاع ملی۔ آپ کو کچھ اندازہ ہے کہ آپ کی واپسی کتنے بجے ہوئی تھی؟“

وہ جلدی سے بولا۔ ”مجھے اچھی طرح یاد ہے، اس وقت ساڑھے تین کا وقت ہوا تھا۔“

وکیل صفائی نے طنزیہ انداز میں میری جانب دیکھا پھر اگلا سوال کیا۔ ”عاصم صاحب! آپ کی رہائش کس علاقے میں ہے؟“

”نارتھ ناظم آباد میں۔“

”اور آپ کا دفتر؟“

عاصم نے جواب دیا۔ ”خالد بن ولید روڈ پر۔“

”عموماً آپ کو دفتر سے گھر پہنچنے میں کتنا وقت لگتا ہے؟“

”تقریباً نصف گھنٹہ۔“

وکیل صفائی نے کہا۔ ”یعنی وقوعہ کے روز جب آپ گھر پہنچے تو تقریباً چار بج رہے ہوں گے؟“

”جی ہاں، آپ کہہ سکتے ہیں۔“ عاصم نے کچھ سوچنے کے بعد کہا۔ ”میں اطلاع ملتے ہی دفتر سے روانہ ہو گیا تھا۔“

”ہیئر از پوائنٹ یور آنر۔“ وکیل صفائی جج کی جانب مڑتے ہوئے بولا۔ ”پوسٹ مارٹم کی رپورٹ بتاتی ہے کہ مقتولہ فضیلہ کی موت دو اور تین بجے کے دوران میں واقع ہوئی ہے۔ یہی وہ وقت ہے جب میرا موکل اپنے ایک معزز دوست کے ساتھ لنچ میں مصروف تھا۔ پھر جب وہ گھر پہنچا تو اس کی بیوی کو موت سے ہمکنار ہوئے کم ازکم ایک گھنٹہ اور زیادہ سے زیادہ دو گھنٹے گزر چکے تھے۔ اس سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ یہ قتل اس نے نہیں کیا۔ وہ بے گناہ ہے، اسے کسی گہری سازش کے تحت پھانسنے کی کوشش کی گئی ہے۔ میری معزز عدالت سے استدعا ہے کہ میرے موکل کی درخواست ضمانت قبول کی جائے۔“

میں نے اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ ”جناب عالی، ابھی تو اس مقدمے کی سماعت شروع ہوئی ہے۔ جیسے جیسے کارروائی آگے بڑھے گی، نئے نئے انکشافات سامنے آئیں گے۔ ابھی تو استغاثہ کے گواہوں کے بیان بھی نہیں ہوئے پھر ملزم کی جائے وقوعہ سے غیر حاضری بھی ثابت نہیں ہوئی۔ اس دوران میں اگر وہ کسی دوست کے ساتھ لنچ میں مصروف تھا تو یہ بات عدالت میں ثابت کرنا پڑے گی۔ عدالت ہر بات کا ثبوت مانگتی ہے۔ یور آنر، سردست ملزم کی ضمانت قبول کرنا انصاف کے اصولوں کے منافی ہو گا۔“

وکیل صفائی نے کہا۔ ”اگر ابھی تک یہ ثابت نہیں ہوا کہ ملزم بے گناہ نہیں ہے تو یہ بھی ثابت نہیں ہوا کہ ملزم گناہ گار ہے۔“

”بجا فرمایا میرے دوست۔“ میں نے وکیل صفائی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اس بات کا فیصلہ کرنا تو معزز عدالت کا کام ہے۔ ہم دونوں تو اپنے موقف کی حمایت میں دلائل ہی دے سکتے ہیں۔“

اس کے ساتھ ہی عدالت کا وقت ختم ہو گیا۔

جج نے میری جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ ”وکیل صاحب! آپ آئندہ پیشی پر استغاثہ کے گواہوں کو بھگتا لیں۔“

”جناب عالی، میں نے استغاثہ کے دو گواہوں کا ذکر کیا ہے لیکن میرے خیال میں صرف ایک ہی سے کام چل جائے گا۔ آئندہ پیشی پر میں فی الحال۔۔ اپنے موکل اور استغاثہ کے سب سے اہم و معتبر گواہ ڈاکٹر رمضانی کو پیش کرنا چاہتا ہوں۔ اگر ضرورت پڑی تو دوسرے کو زحمت دینا پڑے گی۔“

”جیسی آپ کی مرضی۔“ جج نے سرسری لہجے میں کہا اور عدالت برخاست کرنے کا اعلان کر دیا۔

ملزم عاصم درانی کو جوڈیشل ریمانڈ پر جیل بھیج دیا گیا۔ آئندہ تاریخ پندرہ روز بعد کی تھی۔

○

منظر اسی عدالت کا تھا اور گواہوں کے کٹہرے میں میرا موکل ڈاکٹر رمضانی کھڑا تھا۔

ڈاکٹر رمضانی نے حلف اٹھانے کے بعد ایک لمبا چوڑا بیان دیا جس میں سے زیادہ تر باتیں وہی تھیں جو اس کہانی کے ابتدائی صفحات میں، میں لکھ چکا ہوں۔ مقتولہ فضیلہ اور ملزم عاصم درانی کا تفصیلی پس منظر بیان کرنے کے بعد ڈاکٹر رمضانی نے ملزم کی ”کردار نگاری“ کرتے ہوئے بتایا۔ ”یور آنر، ملزم ایک انتہائی مکار، عیار اور چالاک شخص ہے۔ وہ ایک لالچی مگر متحمل مزاج منصوبہ ساز ہے۔ اس نے میرے دوست کے مال و جائیداد پر قبضہ کرنے کیلئے پہلے اس کی بڑی بیٹی نائلہ پر جال ڈالا لیکن جب یہ حقیقت کھلی کہ شیخ

مقبول احمد نے نائلہ کو حق وراثت سے محروم کر دیا ہے اور اپنی زندگی ہی میں وہ اپنا سب کچھ اپنی بیوی اور چھوٹی بیٹی کے نام کر چکا ہے تو ملزم نے نائلہ کی جانب سے آنکھیں پھیر لیں۔ نائلہ پہلے ہی اپنے باپ' سوتیلی ماں اور بہن کی طرف سے لاتعداد بدگمانیوں کا شکار تھی' ملزم کی طوطا چشمی نے اسے اس قدر دل برداشتہ کر دیا کہ وہ گھر ہی چھوڑ کر چلی گئی۔ قصہ مختصر ملزم فضیلہ کو شکار کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ ماں کی وفات کے بعد فضیلہ اس دنیا میں تنہا رہ گئی تھی اسے اپنے قریب ہمدرد اور پرخلوص شانہ نظر آیا تو وہ ملزم کا سہارا لینے پر مجبور ہو گئی۔ شادی کے بعد جب ملزم کی لالچی فطرت کھل کر سامنے آئی اور اس کے طور طریقوں سے صاف ظاہر ہونے لگا کہ وہ دولت کا بھوکا ہے اور اسی مقصد کیلئے اس نے مقتولہ فضیلہ سے شادی کی ہے تو فضیلہ محتاط ہو گئی۔ اس سلسلے میں اس نے ایک دوبار مجھ سے فون پر بات بھی کی تھی اور میں نے اسے مناسب مشورہ بھی دے دیا تھا۔ وقوعہ سے ایک روز قبل بھی میری مقتولہ سے فون پر بات ہوئی تھی اور اس نے بتایا تھا کہ گزشتہ رات میاں بیوی کے درمیان شدید قسم کا جھگڑا ہو چکا تھا۔ ملزم مقتولہ سے کوئی بھاری رقم مانگ رہا تھا مگر مقتولہ اس کیلئے تیار نہیں تھی۔ طیش کے عالم میں ملزم نے اسے قتل کی دھمکی بھی دی تھی۔ اس کے اگلے روز ہی فضیلہ اپنے بیڈ روم میں مردہ پائی گئی۔"

رمضانی صاحب کا بیان ختم ہوا تو وکیل صفائی جرح کیلئے اس کے کٹہرے کے پاس آ گیا۔

"رمضانی صاحب۔" اس نے جرح کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔ "آپ اس کیس کے مدعی ہیں اور استغاثہ کے ایک اہم گواہ بھی۔ آپ معزز عدالت کو بتانا پسند کریں گے کہ آپ کا مقتولہ سے کیا رشتہ تھا؟"

"وہ میرے دوست کی بیٹی تھی اور مجھے اپنی بیٹی سے زیادہ عزیز تھی۔"

وکیل صفائی نے اعتراض اٹھایا۔ "رمضانی صاحب! مقتولہ کو اس دنیا سے رخصت ہوئے تقریباً دو ماہ گزر چکے ہیں۔ آپ کو بہت دیر سے مقدمے بازی کا خیال آیا۔ اس تاخیر کی کوئی خاص وجہ؟"

"جسے آپ تاخیر سمجھ رہے ہیں' میں اسے دانشمندی کہوں گا۔"

"میں سمجھا نہیں۔"

جج نے ڈاکٹر رمضانی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "ڈاکٹر صاحب! آپ اپنی بات کی وضاحت کریں۔"

"یور آنر۔" ڈاکٹر رمضانی نے جج کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ "میں اس معاشرے کا ایک امن پسند اور اصول پرست فرد ہوں پھر جس شعبے سے میرا تعلق ہے وہاں ہر کام قاعدے قرینے سے کیا جاتا ہے۔" ایک لمحے کے توقف کے بعد اس نے کہا۔ "جناب عالی' وقوعہ کے دوسرے روز ہی مجھے اس سانحے کا پتہ چل گیا تھا۔ میں متعلقہ تھانے جا کر پولیس افسر سے بھی ملا تھا۔ انہوں نے مجھے یقین دہانی کرائی تھی کہ وہ بہت جلد فضیلہ کے قاتل کو ڈھونڈ نکالیں گے۔"

"بہت خوب۔" وکیل صفائی نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ "ڈاکٹر صاحب! آپ بھی کمال کرتے ہیں۔"

ڈاکٹر رمضانی نے الجھن آمیز نظروں سے اس کی جانب دیکھا' وکیل صفائی نے کہا۔ "ابھی آپ نے معزز عدالت کے سامنے بیان دیتے ہوئے میرے موکل کو مورد الزام ٹھہرایا ہے اور اس بات پر زور دیا ہے کہ میرا موکل ہی اپنی بیوی کا قاتل ہے۔ کیا یہ بات پولیس والوں کو نہیں بتا سکتے تھے جو نامعلوم ڈاکوؤں کی تلاش میں شہر کی خاک چھانتے پھر رہے تھے؟"

"میں نے پولیس کو اس حقیقت سے آگاہ کر دیا تھا۔" ڈاکٹر رمضانی نے پرسکون لہجے میں جواب دیا۔

"پھر پولیس نے میرے موکل کو گرفتار کیوں نہیں کیا؟"

"میرا کام قاتل کی نشاندہی کرنا تھا' میں پولیس کو اس کی گرفتاری پر مجبور نہیں کر سکتا تھا۔"

وکیل صفائی نے طنزیہ انداز میں کہا۔ "اس کے بعد آپ ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گئے۔ ہیں نا۔"

"آبجیکشن یور آنر۔" میں نے اپنی جگہ سے اٹھ کر احتجاجی لہجے میں کہا۔ "میرے فاضل دوست کو اپنے لہجے پر کنٹرول کرنا چاہئے۔ وہ کسی مجرم پر نہیں بلکہ معاشرے کے انتہائی محترم پیشے سے وابستہ ایک معزز شخص پر جرح کر رہے ہیں۔"

جج نے میرے اعتراض کو درست تسلیم کرتے ہوئے وکیل صفائی کو ہدایت کی کہ وہ اخلاق و شائستگی کا دامن تھام کر رکھے۔

"آئی ایم رئیلی ویری سوری یور آنر۔" وکیل صفائی نے سر جھکا کر مودب انداز میں کہا۔ پھر روئے سخن ڈاکٹر رمضانی کی جانب موڑتے ہوئے سوال کیا۔ "ڈاکٹر صاحب! جب آپ نے دیکھا تھا کہ پولیس آپ کی بات پر کان نہیں دھر رہی اور آپ کے عزیز از جان دوست کی چہیتی بیٹی کا قاتل آزادانہ دندناتا پھر رہا ہے تو آپ کو فوری طور پر عدالت سے رجوع کرنا چاہئے تھا مگر آپ نے ایسی کوئی کوشش نہیں کی۔"

یہ بات آپ کیسے کہہ سکتے ہیں؟" ڈاکٹر رمضانی نے الٹا سوال کر دیا۔ "یہ میری کوشش کا ہی نتیجہ ہے کہ نفیلہ کا قاتل اس وقت ہتھکڑی پہنے ملزموں کے کٹہرے میں نظر آ رہا ہے۔"

"میرا مطلب تاخیر سے تھا۔ آپ کو عدالت سے رجوع کرنے کا بہت دیر سے خیال آیا؟"

ڈاکٹر رمضانی نے برہمی سے وکیل کی جانب دیکھا پھر پوچھا۔ "اگر تاخیر سے عدالت کا دروازہ کھٹکھٹایا جائے تو اس جرم پر کون سی دفعہ عائد ہوتی ہے؟"

اس جواب نے وکیل مخالف کو بوکھلا دیا' میں نے فوراً اعتراض کر دیا۔ "یور آنر' وکیل صفائی خواہ مخواہ بات کو طول دے رہے ہیں اور غیر ضروری سوالات کر کے عدالت کا قیمتی وقت برباد کر رہے ہیں۔"

جج نے وکیل کی جانب دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "آپ گواہ سے اور کچھ پوچھنا چاہتے ہیں؟"

"یس یور آنر۔" وکیل صفائی نے کہا پھر ڈاکٹر رمضانی سے سوال کیا۔

"ڈاکٹر صلاحب! کیا آپ نے میرے موکل کو اپنی بیوی کو قتل کرتے ہوئے دیکھا تھا؟"

ڈاکٹر کے بجائے میں نے کہا۔ "میرے فاضل دوست' وٹنس اور آئی وٹنس میں کچھ تو فرق ہوتا ہے۔ میرا خیال ہے' آپ نے کیس کو اچھی طرح اسٹڈی نہیں کیا۔ ڈاکٹر صاحب اس کیس میں گواہ کی حیثیت سے بیان دے رہے ہیں' عینی شاہد کی حیثیت سے

نہیں۔"

"ڈاکٹر صاحب۔" وکیل صفائی نے ڈاکٹر رمضانی کی جانب مڑتے ہوئے کہا۔ "آپ نے اپنے بیان میں بتایا ہے کہ وقوعہ سے ایک روز قبل مقتولہ کا اپنے شوہر یعنی میرے موکل ملزم عاصم درانی سے شدید قسم کا جھگڑا ہوا تھا۔ بقول آپ کے' جھگڑا کسی رقم کے مطالبے پر ہوا تھا اور میرے موکل نے مقتولہ کو قتل کی دھمکی بھی دی تھی؟"

"جی ہاں' میں نے یہی بیان دیا ہے۔"

"آپ ۔۔ مرحوم شیخ مقبول کے عزیز ترین دوست ہونے کے دعویدار ہیں؟"

"دریں چہ شک۔"

وکیل صفائی نے کہا۔ "ایسی صورت میں آپ کا فرض بنتا تھا کہ آپ دونوں میاں بیوی میں مصالحت کیلئے کوئی راہ نکالتے۔ ایسی صورت میں جب کہ آپ کے بیان کے مطابق' میرا موکل مقتولہ کو قتل کی دھمکی بھی دے چکا تھا۔ اس سلسلے میں آپ نے کوئی کوشش کی تھی؟"

"میں نے نفیلہ سے وعدہ کیا تھا کہ مناسب وقت پر اس کے شوہر کو سمجھاؤں گا۔"

"پھر آپ نے اپنا وعدہ پورا کیا؟"

"اس کی نوبت ہی نہیں آئی۔" ڈاکٹر رمضانی نے جواب دیا۔ "دوسرے روز وہ قتل کر دی گئی۔"

وکیل صفائی نے طنزیہ انداز میں کہا۔ "اور آپ کا خیال ہے کہ اسے میرے موکل عاصم درانی نے قتل کیا ہے؟"

"خیال نہیں بلکہ مجھے یقین ہے۔"

"اس یقین کو آپ عدالت میں ثابت کر سکتے ہیں؟"

"یہ کام میرے وکیل کا ہے۔" ڈاکٹر رمضانی نے پراعتماد لہجے میں جواب دیا۔ "ان کی موجودگی میں مجھے کچھ بولنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"جناب عالی' مجھے اور کچھ نہیں پوچھنا۔" وکیل صفائی نے کہا۔ اور اپنی سیٹ پر جا کر بیٹھ گیا۔

اس کے بعد ملزم عاصم درانی کٹہرے میں آ کر کھڑا ہوا اور میں نے اپنی جرح کا آغاز کیا۔ میرے اور وکیل مخالف کے درمیان یہ بات پہلے ہی طے ہو گئی تھی کہ آج کی سماعت کیلئے جتنا بھی وقت ملے گا وہ ہم آدھا آدھا بانٹ لیں گے۔ وہ استغاثہ کے گواہ ڈاکٹر رمضانی پر جرح کرے گا اور میں ملزم کو اپنے سوالوں میں تولوں گا۔ وکیل صفائی اپنا وقت استعمال کر چکا تھا' اب میری باری تھی۔

“عاصم درانی صاحب۔” میں نے کٹہرے کی ریلنگ کو تھامتے ہوئے ملزم کی آنکھوں میں جھانکا۔ “اگر میں آپ کو وسیم درانی کہوں تو آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں؟”

“جی---” اس نے گڑبڑا کر مجھے دیکھا۔ “میرا--- نام تو عاصم درانی ہے۔”

“میں نے کب کہا کہ آپ عاصم درانی نہیں ہیں۔” میں بدستور اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔ “آپ پریشان کیوں ہو گئے؟”

“نہیں تو' ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔” وہ قدرے سنبھل کر بولا۔

میں نے پوچھا۔ “آپ نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا؟”

“میں عاصم درانی ہوں' آپ مجھے وسیم درانی کہہ کر کیوں مخاطب کرنا چاہتے ہیں؟”

“ناراض کیوں ہوتے ہیں جناب۔” میں نے زیرلب مسکراتے ہوئے کہا۔ “آپ عاصم درانی ہی ہیں' ظاہر ہے وسیم درانی کیسے ہو سکتے ہیں؟”

وکیل صفائی میری جرح کے انداز سے خاصا برہم نظر آ رہا تھا پھر عاصم بھی میرے سوال سن کر خوف زدہ ہو گیا تھا۔ اگرچہ اس نے خود کو خاصی حد تک سنبھال لیا تھا مگر جج ایک لمحے کیلئے اس کے چہرے پر ابھر آنے والے تفکر کو بھانپ چکا تھا۔

میں نے جرح جاری رکھتے ہوئے پوچھا۔ “عاصم درانی صاحب' آپ کی رہائش کس علاقے میں ہے؟”

“سینٹرل جیل میں۔” وہ جلے کٹے لہجے میں بولا۔

میں نے اس کے لہجے کی پرواہ کئے بغیر سوال کیا۔ “میرا مطلب ہے' اس ”مہمان نوازی“ سے پہلے آپ کا قیام کہاں تھا؟”

وہ ناگواری سے بولا۔ “نارتھ میں۔”

“نارتھ کراچی یا نارتھ ناظم آباد۔”

“نارتھ ناظم آباد میں۔”

“اس سے پہلے؟”

“جناب عالی' مجھے سخت اعتراض ہے۔” وکیل صفائی نے فوراً اٹھ کر کہا۔ “وکیل استغاثہ ان بچگانہ سوالات سے آخر کیا ثابت کرنا چاہتے ہیں؟”

میں نے جج کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ “یور آنر! میں جو کچھ ثابت کرنا چاہتا ہوں اس کا ذکر عرضی دعویٰ میں تفصیلاً درج ہے پھر بھی میں اپنے فاضل دوست کی معلومات کیلئے عرض کرتا چلوں کہ میں ملزم کو مجرم ثابت کرنے کیلئے یہ ساری تگ و دو کر رہا ہوں۔ اگر معزز عدالت کو میری اس کوشش پر کوئی اعتراض ہو تو---”

وکیل صفائی نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔ “مگر بار بار پوچھنا کہ آپ کہاں رہتے ہیں--”

“میں نے بار بار یہ سوال نہیں دہرایا۔” میں نے جواباً اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ “لگتا ہے' آپ کی یادداشت بہت کمزور ہے۔”

“آرڈر پلیز۔” جج نے ہماری تکرار میں مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ “باہمی بحث میں وقت ضائع نہ کیا جائے۔” پھر مجھے ہدایت کی “بیگ صاحب' پلیز پروسیڈ۔”

“تھینک یو یور آنر۔” میں نے سر جھکا کر پھر ملزم سے سوال کیا۔ “عاصم صاحب' آپ نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا؟”

“آپ کے سوال کا موجودہ کیس سے کیا تعلق ہے؟”

جج نے اسے سرزنش کی۔ “آپ خواہ مخواہ بحث نہ کریں اور وکیل صاحب جو پوچھ رہے ہیں' وہ بتائیں۔”

وہ مجھے گھورتے ہوئے بولا۔ “نارتھ ناظم آباد سے پہلے میں غریب آباد میں رہتا تھا۔”

میں نے اگلا سوال کیا۔ “غریب آباد میں ایک لڑکی فوزیہ بھی ہوا کرتی تھی؟”

اس کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا۔ “میں کسی فوزیہ نامی لڑکی سے واقف نہیں ہوں۔”

“درست فرمایا آپ نے۔” میں نے پُرخیال لہجے میں کہا۔ “وہ فوزیہ وسیم درانی کی

کزن تھی بلکہ منگیتر کہا جائے تو زیادہ مناسب ہو گا۔ آپ بھلا اس فوزیہ سے کیسے واقف ہو سکتے ہیں۔ آپ تو عاصم درانی ہیں-- ہیں نا؟"

وہ خاصا نروس دکھائی دے رہا تھا۔ جج بھی اب میری باتوں میں دلچسپی لینے لگا تھا۔ یہ سب رمضانی صاحب کی فراہم کردہ معلومات کا کرشمہ تھا۔ جس سے میں خاطر خواہ فائدہ اٹھا رہا تھا۔ ملزم کا اصل نام واقعی وسیم تھا اور فوزیہ نامی لڑکی سے اس کی منگنی ہو چکی تھی مگر کسی دولت مند گھرانے میں شادی کے خواب نے اسے بچپن کی اس منگنی کو توڑنے پر مجبور کر دیا تھا۔ بعد ازاں اس نے اپنا نام وسیم درانی سے عاصم درانی کر لیا تھا تاہم ان واقعات کا موجودہ مقدمے سے دور کا بھی تعلق نہیں تھا۔ میں نے محض اسے الجھانے کیلئے یہ قصہ پارینہ چھیڑا تھا۔ اس طرح وہ نفسیاتی دباؤ میں آجاتا اور ساری چوکڑی بھول کر میرے سوالات کا فر فر جواب دینے لگتا۔ میں اپنے مقصد میں خاصی حد تک کامیاب رہا تھا۔ وہ کٹہرے میں کھڑا بار بار پہلو بدل رہا تھا۔

میں نے جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے سوال کیا۔ "عاصم صاحب' وقوعہ کے روز آپ اپنے کسی دوست کے ساتھ لنچ کرنے آفس سے باہر گئے تھے۔ آپ معزز عدالت کو بتانا پسند کریں گے کہ آپ نے مذکورہ لنچ کس ہوٹل میں کیا تھا؟"

"شیزان میں۔"

"اپنے دوست کا نام بتایئے؟"

اس نے غیر اختیاری طور پر اپنے وکیل کی جانب دیکھا۔ اس کے انداز سے بے قراری عیاں تھی۔ میں نے فوراً کہا۔ "لنچ کرنے آپ گئے تھے عاصم صاحب' اپنے وکیل کی طرف کیا دیکھ رہے ہیں۔"

اس نے میری جانب متوجہ ہوتے ہوئے جواب دیا۔ "اس روز میرے ساتھ کامران مرزا لنچ پر گئے تھے۔"

"عاصم درانی صاحب' آپ نے اپنے بیان میں بتایا ہے کہ واردات کی اطلاع کسی خاتون نے فون پر دی تھی۔ وہ فون کال آپ کی سیکریٹری نے سنی تھی کیونکہ آپ تو آفس میں تھے ہی نہیں۔ اطلاع فراہم کرنے والی اس گمنام خاتون نے کن الفاظ میں اطلاع دی تھی؟"

"یہ بات میں کیسے بتا سکتا ہوں؟" وہ جلدی سے بولا۔

"آپ کی سیکریٹری تو بتا سکتی ہے؟"

"وہ بے چاری بھی کیا بتائے گی۔ وہ اطلاع ہی ایسی تھی کہ اس نے الفاظ پر غور کہاں کیا ہو گا پھر اب تو اس واقعے کو بھی کافی عرصہ گزر چکا ہے۔"

میں نے کہا۔ "میرا یہ تجربہ ہے کہ سیکریٹری کی یادداشت عموماً بہت اچھی ہوتی ہے۔ ممکن ہے' اسے اب بھی وہ الفاظ من و عن یاد ہوں؟"

"اس سلسلے میں' میں بھلا کیا کہہ سکتا ہوں۔"

میں دیکھ چکا تھا کہ جج بار بار دیوار گیر کلاک کی جانب نگاہیں اٹھا رہا تھا۔ میں نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "یور آنر' اب تک کی جرح سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ ملزم عاصم درانی کے بیان کی تصدیق صرف دو افراد یعنی کامران مرزا اور اس کی سیکریٹری کنول کر سکتے ہیں۔ لہٰذا میری معزز عدالت سے استدعا ہے کہ مذکورہ دونوں افراد کو پابند گواہ کی حیثیت سے بذریعہ سمن عدالت میں بلایا جائے۔ مجھے حیرت اس بات پر ہے کہ صفائی کے گواہوں میں ان کے نام نظر نہیں آ رہے۔"

جج نے وکیل مخالف سے پوچھا۔ "آپ آئندہ پیشی پر کامران مرزا اور کنول کو گواہی کیلئے کورٹ میں لا سکتے ہیں یا ان کے نام سمن جاری کئے جائیں؟"

وکیل صفائی نے تھوڑی دیر عاصم درانی سے کچھ کھسر پھسر کی پھر جج کو یقین دہانی کرائی کہ اگلی پیشی پر وہ دونوں گواہوں کو پیش کر دے گا۔

"کورٹ از ایڈ جارنڈ۔" جج نے عدالت برخاست کرنے کا اعلان کر دیا۔

آئندہ پیشی ایک ہفتے بعد کی تھی۔

* * *

ہم عدالت سے باہر آئے تو رمضانی صاحب نے کہا۔ "بیگ صاحب' کیا خیال ہے۔ عدالتی کارروائی کچھ سست نہیں ہو رہی؟"

"آپ کو پہلے کبھی عدالت میں آنے کا اتفاق ہوا ہے؟"

"نہیں' یہ میرا پہلا تجربہ ہے۔"

میں نے اپنی گاڑی کی جانب بڑھتے ہوئے کہا۔ “جبھی آپ اس انداز میں سوچ رہے ہیں۔”

“تو آپ کے خیال میں---؟”

انہوں نے جملہ ادھورا چھوڑ کر میری طرف دیکھا‘ میں نے ان کی بات کا مطلب سمجھتے ہوئے کہا۔ “جی ہاں‘ میرے خیال میں عدالتی کارروائی کی رفتار تسلی بخش ہے۔ اب تک کی سماعت سے مطمئن ہوں۔”

“عبدالشکور کو کب پیش کرنے کا ارادہ ہے؟”

“ایک دو پیشی کے بعد‘ کسی مناسب موقع پر۔” میں نے جواب دیا۔ “آپ نے اس کو ساری صورتحال سمجھا تو دی تھی نا؟”

“جی ہاں‘ اس نے رازداری کا وعدہ کیا تھا۔”

عبدالشکور میرے دوسرے گواہ کا نام تھا جو اس واردات کے بعض واقعات کا عینی شاہد بھی تھا۔ ایسے واقعات جو بظاہر غیراہم نظر آتے تھے مگران کا سلسلہ آگے چل کر بہت اہمیت اختیار کر جاتا تھا۔ میں نے جو کام رمضانی صاحب کو سونپے تھے یہ بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی تھی۔ عبدالشکور‘ رمضانی صاحب ہی کی دریافت تھا۔

ہم ایک ساتھ چلتے ہوئے پارکنگ ایریا کی طرف آ گئے پھر اپنی اپنی گاڑی میں بیٹھ کر رخصت ہو گئے۔

اگلی پیشی پر وکیل صفائی نے ناسازی طبع کا سرٹیفکیٹ پیش کر کے دوسری تاریخ لے لی۔ نئی تاریخ پر بھی کوئی کارروائی نہ ہو سکی کیونکہ اس روز جج غیرحاضر تھا‘ دوسرے روز جج نے پیش کار سے روزانہ مصروفیات کی تفصیل جاننے کے بعد دس دن کی تاریخ دے دی۔

متعلقہ تاریخ کو میں ذرا جلدی ہی عدالت میں پہنچ گیا تھا۔ میں نے پہلے حاضری لگائی پھر پیش کار کی مٹھی گرم کر کے اپنے کیس کا نمبر پہلا لگوا لیا۔ اس وقت تک مخالف پارٹی عدالت نہیں پہنچی تھی۔ عام طور پر سیشن کورٹ کی عدالتوں میں روزانہ اتنے کیس زیر سماعت ہوتے ہیں کہ اگر آپ کا نمبر شروع میں نہ ہو تو پھر باری کی توقع عبث ہے۔ پیش کار اس سلسلے میں خاصہ اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ عام سا نظر آنے والا وہ کارندہ

درحقیقت بہت بااختیار ہوتا ہے۔ جن لوگوں کا عدالتی معاملات سے واسطہ پڑتا رہتا ہے‘ وہ پیش کار کی قوت سے بخوبی آگاہ ہیں۔

تھوڑی دیر میں جیل کی گاڑی میں عاصم درانی بھی پہنچ گیا۔ دس منٹ بعد وکیل صفائی بھی وہاں موجود تھا۔ جیسے ہی جج اپنی کرسی پر جلوہ افروز ہوا‘ ہمارے کیس کی آواز پڑ گئی۔

جج کی اجازت سے وکیل صفائی نے ملزم عاصم درانی کے دوست کامران مرزا کو پیش کیا‘ اس نے کٹہرے میں آ کر سچ بولنے کا حلف اٹھایا پھر مختصر سا بیان دیا۔ اس کے بیان میں کوئی ایسی قابل ذکر بات نہیں تھی جو بیان کی جائے۔ اس نے جیسے ہی بولنا شروع کیا‘ میں سمجھ گیا کہ وہ وکیل صفائی کی زبان بول رہا تھا۔ اسے خاص طور پر وہ بیان رٹوایا گیا تھا۔

کامران مرزا نے بہترین تراش خراش کا سفاری سوٹ زیب تن کر رکھا تھا جو اس کی شخصیت سے میل نہیں کھاتا تھا۔ میں اسے دیکھتے ہی کھٹک گیا تھا۔ مجھے کسی گڑبڑ کا فوراً احساس ہو گیا تھا۔ بہرحال میں نے اپنی جرح کا آغاز کرتے ہوئے سوال کیا۔

“آپ کا نام کیا ہے؟”

“کامران مرجا۔” اس نے مختصر سا جواب دیا۔

اس کا جواب سن کر مجھے اندازہ ہو گیا کہ نقل بمطابق اصل بنانے کی بھونڈی کوشش کی گئی ہے۔ وہ اپنی زبان اور لہجے سے مار کھا رہا تھا مگر یہ کوئی ایسی بات بھی نہیں تھی کہ وہ عاصم درانی کا دوست ہو ہی نہیں سکتا تھا۔

میں نے اگلا سوال کیا۔ “آپ عاصم درانی کو کب سے جانتے ہیں؟”

وہ کھٹ سے بولا۔ “جیادہ پرانی جان پہچان نہیں ہے۔ نئی نئی دوستی ہوئی ہے۔”

“کامران صاحب‘ آپ نے بیان دیا ہے کہ وقوعہ کے روز آپ ملزم کے ساتھ لنچ کرنے کسی ہوٹل میں گئے تھے؟”

“میں نے یہی کہا تھا۔”

“کیا آپ ملزم کے دفتر میں گئے تھے؟ میرا مطلب ہے‘ آپ دونوں ایک ساتھ لنچ کرنے نکلے تھے؟”

اس نے ہراساں نظروں سے وکیل صفائی کی جانب دیکھا۔ شاید اس سوال کا جواب

اسے نہیں پڑھایا گیا تھا' میں نے واضح طور پر دیکھا کہ وکیل صفائی نے اپنی گردن کو منفی انداز میں خفیف سی جنبش دی تھی۔ میرے لئے اتنا ہی اشارہ کافی تھا۔ مجھے یقین ہو گیا تھا کہ کٹہرے میں کھڑا ہوا شخص کرائے کا گواہ تھا۔ مجھے اپنی جانب متوجہ پا کر اس نے کہا۔

"میں عاصم صاحب کے ساتھ نہیں گیا تھا بلکہ ہم دونوں الگ الگ گئے تھے۔"

"کہاں الگ الگ گئے تھے؟"

"یہ اپنے دفتر سے آئے تھے اور میں اپنی دکان سے۔"

"کامران صاحب' آپ کس چیز کی دکان کرتے ہیں؟"

وہ جلدی سے بولا۔ "میرا ٹائروں کا کاروبار ہے۔ پلازا کے پاس۔"

میں نے اچانک سوال کیا۔ "آپ نے کس ہوٹل میں لنچ کیا تھا؟"

"شیزان میں۔"

میں نے دانستہ اسے پریشان کرنے کی کوشش کی۔ "یہ ہوٹل کس ملک میں واقع ہے۔ میں نے تو یہ نام پہلے کبھی نہیں سنا۔"

وکیل صفائی فوراً اس کی مدد کو دوڑے۔ "دراصل کامران صاحب "شیزان" کہنا چاہتے ہیں۔ وہ "ز" کو "ج" بولتے ہیں جیسے وہ خود کو کامران مرجا کہتے ہیں۔"

"تھینک یو مائی ڈیئر کونسلر۔" میں نے توصیفی نظروں سے وکیل صفائی کی طرف دیکھا پھر کٹہرے میں کھڑے ہوئے کامران مرزا سے سوال کیا۔ "کامران صاحب' وقوعہ سے پہلے بھی کبھی آپ اس ہوٹل میں گئے ہیں؟"

"جی ہاں' کئی بار جا چکا ہوں۔" وہ فخریہ لہجے میں بولا۔

"یہ ہوٹل شہر میں کہاں واقع ہے؟"

"ایک پہاڑی پر۔"

"اس پہاڑی کا کوئی نام تو ہو گا؟"

وہ تامل کرتے ہوئے بولا۔ "پہاڑی تو بس پہاڑی ہی ہوتی ہے۔"

میں نے محسوس کیا' وہ میرے سوالوں سے خاصا پریشان ہو رہا ہے۔ جج بھی اس کی حالت سے محظوظ ہو رہا تھا۔

میں نے پوچھا۔ "کامران صاحب' آپ نے وقوعہ کے روز ملزم عاصم درانی کے ساتھ لنچ میں کیا اڑایا تھا؟"

"جی' میں نے کچھ نہیں اڑایا تھا۔" وہ تعجب سے بولا۔ پھر امداد طلب نظروں سے اپنے وکیل کی جانب دیکھا۔

مجھے ہنسی آ گئی۔ وکیل صفائی نے اس کی مدد کی۔ "وکیل صاحب پوچھ رہے ہیں کہ اس روز آپ نے کیا کھایا تھا؟"

اس نے بتایا۔ "ہم نے تلی نہاری کھائی تھی اور دودھ پتی بھی پی تھی۔"

جج نے غصیلی نظروں سے اس کی جانب دیکھا۔ وہ جج کے غصے کا مطلب نہیں سمجھ سکا تھا البتہ میں نے دیکھا وکیل صفائی-- بغلیں جھانک رہا تھا۔ گواہ کامران مرجا نے تو لٹیا ہی ڈبو دی تھی۔ شیزان کا شمار اس زمانے میں اعلیٰ درجے کے ہوٹلوں میں ہوتا تھا (آج کل کا پتہ نہیں) وہاں کی ڈشیں بھی مخصوص تھیں۔ کامران کے جھوٹ کا پول کھل چکا تھا مگر میں اسے اتنی آسانی سے نہیں چھوڑ سکتا تھا۔

وہ جج کے تیور دیکھ کر اور پھر اپنے وکیل کی کھسیاہٹ سے بھانپ چکا تھا کہ اس سے کوئی بڑی غلطی سرزد ہو چکی ہے مگر بات اس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ اس لئے خاصا پریشان نظر آ رہا تھا۔ میں نے مسکراتے ہوئے دوستانہ انداز میں سوال کیا۔ "کامران صاحب' کھانے کا بل کس نے ادا کیا تھا؟"

"میں نے۔" اس نے نہایت مختصر جواب پر اکتفا کیا۔

"کتنا؟"

"پچیس روپے۔"

اس کے جواب پر وکیل صفائی دوسری جانب دیکھنے لگا۔ میں نے تیز لہجے میں کامران مرزا سے پوچھا۔ "آپ لوگ شیزان میں کتنا وقت ٹھہرے تھے؟"

"بس کھانا کھانے کے بعد چلے آئے تھے۔"

"میں نے وقت پوچھا ہے۔" میں نے کہا۔ "اچھی طرح سوچ سمجھ کر جواب دیں۔"

"کوئی آدھا گھنٹہ۔"

اب مزید کوئی سوال پوچھنے کی گنجائش ہی نہیں تھی۔ اس درجے کے ہوٹلوں میں تو

آدھا گھنٹہ کھانا آنے۔۔ میں ہی لگ جاتا ہے۔ کامران کے جھوٹ کی قلعی کھل چکی تھی لیکن اس بے چارے کو ابھی تک صحیح اندازہ نہیں تھا کہ اس کے ساتھ کیا واقعہ پیش آچکا ہے۔

”ڈیٹس آل یور آنر۔“ میں نے جج کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ اور اپنی سیٹ پر آکر بیٹھ گیا۔

جج نے طنزیہ لہجے میں، کٹہرے میں کھڑے ہوئے گواہ کامران مرزا سے کہا۔ ”جھوٹی گواہی دیتے ہوئے تمہیں ذرا بھی خوف نہیں آیا۔“ پھر عدالت کے برآمدے میں ٹہلتے ہوئے ایک پولیس اہلکار کو بلا کر کامران مرزا کو اس کے حوالے کر دیا۔

مجھے یقین تھا کہ وہ پولیس اہل کار سو پچاس لے کر اسے چھوڑ دے گا۔ میرے حساب سے تو کامران مرزا کو یہ سودا خاصا مہنگا پڑ گیا تھا۔ اتنے پیسے تو اسے جھوٹی گواہی دینے کیلئے بھی نہیں ملے ہوں گے جتنے دے کر وہ گلو خلاصی کروائے گا۔ بہرحال اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں۔“

جج کا موڈ خراب ہو چکا تھا۔ وہ اٹھ کر اپنے چیمبر میں چلا گیا۔ پندرہ منٹ بعد وہ واپس اپنی کرسی پر بیٹھا تو اس کا موڈ خاصا بحال ہو چکا تھا۔۔۔ مگر اس نے عدالتی کارروائی کو موخر کر کے ہمیں نئی تاریخ دے دی۔

وکیل صفائی نے اٹھ کر کہا۔ ”جناب عالی! میرے موکل کی سیکریٹری کنول اس وقت عدالت میں موجود ہے۔ اس کا بیان بھی ابھی ہونا ہے۔“

”آج کے لئے ایک گواہ کا بیان کافی ہے۔“ جج نے بے رخی سے کہا اور عدالت برخاست کر کے اپنی سیٹ سے اٹھ گیا۔

* * *

ہر گزرتی سماعت کے ساتھ اس کیس پر میری گرفت مضبوط تر ہوتی جا رہی تھی۔ مجھے امید ہو چلی تھی کہ اب یہ کیس زیادہ عرصے نہیں چلے گا اور دو چار پیشیوں کے بعد ہمارے حق میں فیصلہ ہو جائے گا۔ رمضانی صاحب میری کارکردگی سے مطمئن تھے۔

آئندہ پیشی پر سب سے پہلے ملزم کی سیکریٹری کنول کا بیان ہوا۔ میں نے جج سے

خصوصی درخواست کی کہ بوجوہ، میں کنول پر جرح ملزم کی موجودگی میں نہیں کرنا چاہتا۔ جج نے وجوہات جاننا چاہیں تو میں نے یہ کہہ کر اس مطمئن کر دیا کہ قبل از وقت ان وجوہات کا منظر عام پر آنا آج کی عدالتی کارروائی کو متاثر کر سکتا ہے۔ جج نے مجھے میرے حسب منشا جرح کی اجازت دے دی۔ آج عبدالشکور بھی عدالت کے کمرے میں موجود تھا۔

کنول پچیس چھبیس سال کی ایک اسمارٹ لڑکی تھی۔ اس کے بال بوائے کٹ ترشے ہوئے تھے۔ کانوں میں طلائی بالیاں جھول رہی تھیں۔ اس نے ہلکا سا میک اپ کر رکھا تھا حالانکہ اسے اس کی ضرورت نہیں تھی۔ بلاشبہ وہ ایک خوبصورت لڑکی تھی۔ اس نے موسم کی مناسبت سے ہلکا پھول دار لباس زیب تن کر رکھا تھا۔ وہ نہایت ہی مختصر بیان دے چکی تو میں نے سلسلہ سوالات کا آغاز کیا۔

”مجھے بہت دکھ ہوا کہ آپ کی لگی لگائی نوکری جاتی رہی۔“ میں نے جذباتی لہجے میں سوال کیا۔ ”آج کل آپ کیا کر رہی ہیں؟“

وہ میرے غیر متوقع سوال سے ذرا بھی الجھن کا شکار نہیں ہوئی، خوش دلی سے بولی۔ ”کرنا کیا ہے وکیل صاحب، بس اخبارات دیکھے جا رہے ہیں۔ درخواستیں ٹائپ ہو رہی ہیں اور بھیجی جا رہی ہیں۔“

میں نے پوچھا۔ ”آپ کو شیخ موٹرز سے کتنی تنخواہ ملتی تھی؟“

”تین ہزار۔“

”اوہ، یہ تو بہت کم ہے۔“

وہ شگفتہ لہجے میں بولی۔ ”نہ ہونے سے تو بہتر ہے۔“

میں نے ہم دردانہ لہجے میں کہا۔ ”آپ جیسی ذہین لڑکی کی اتنی کم تنخواہ تو زیادتی والی بات ہے۔“

”آپ نے کیسے اندازہ لگایا کہ میں ذہین ہوں؟“

”آبجیکشن یور آنر۔“ وکیل صفائی اچانک ہماری گفتگو کے بیچ کود پڑا۔ ”جناب عالی، یہ کیا ہو رہا ہے عدالت کے کمرے میں۔ میرے فاضل دوست گواہ پر جرح کر رہے ہیں کہ مشترکہ باہمی امور پر تبادلہ خیال کیا جا رہا ہے۔ وکیل صاحب کو عدالت کا قیمتی وقت برباد کرنے سے روکا جائے۔“

جج نے وکیل کے اعتراض کو درست تسلیم کرتے ہوئے مجھ سے پوچھا۔ ''بیگ صاحب' یہ آپ کس نوعیت کی جرح کر رہے ہیں؟''

میں نے پراعتاد لہجے میں کہا۔ ''یور آنر جرح تو جرح ہوتی ہے۔ جب گواہ کو کوئی اعتراض نہیں ہے اور وہ میرے سوالوں کے جواب بہ خوشی دے رہا ہے تو میرے فاضل دوست کو کیوں خواہ مخواہ پریشانی ہو رہی ہے۔ میں نہایت ہی اہم ترین سوالات کر رہا ہوں۔ معزز عدالت سے میری التجا ہے کہ گواہ کنول صاحبہ کے ہر جواب کو من و عن ریکارڈ پر لایا جائے۔''

جج نے میری مرضی کی جرح کی اجازت دے دی۔ میں نے کنول کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا۔ ''کنول صاحبہ' میں دن رات انسانوں کو پڑھتا ہوں۔ یہ میرا مشغلہ بھی ہے اور میرے پیشے کا تقاضا بھی۔ میں آپ سے شرط لگانے کو تیار ہوں کہ آپ نہایت ہی ذہین لڑکی ہیں۔''

اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک نمودار ہوئی' چہک کر بولی۔ ''ممکن ہے' آپ کا قیافہ درست ہو مگر مجھے تو اپنے اندر ذہانت والی کوئی بات نظر نہیں آتی۔''

''آپ کسر نفسی سے کام لے رہی ہیں۔''

''آپ کی ذرہ نوازی ہے۔'' اس نے عام سے لہجے میں کہا۔

''میرے آفس میں ایک پوسٹ خالی ہے۔'' میں نے سلسلہ کلام کو بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''اسٹارٹنگ سیلری پانچ ہزار ہو گی مگر ایک شرط ہے۔''

اس نے سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھا۔ پھر بولی۔ ''وہ کیا؟''

''اس پوسٹ کے لئے اچھی یادداشت کا ہونا بہت ضروری ہے۔''

''میری یادداشت بہت مضبوط ہے۔'' وہ پرجوش لہجے میں بولی۔ ''مجھے چھوٹی عمر کے واقعات پوری تفصیل کے ساتھ یاد ہیں۔ جس چیز کو میں ایک مرتبہ دیکھ لوں' وہ میرے ذہن میں نقش ہو کر رہ جاتی ہے۔''

''بہت خوب۔'' میں نے اس کی صلاحیتوں کو سراہتے ہوئے کہا۔ ''پھر تو آپ کو یاد ہو گا کہ جس روز آپ کے سابق باس اپنے کسی دوست کے ساتھ لنچ پر آفس سے باہر گئے ہوئے تھے اس روز آپ نے ایک فون کال ریسیو کی تھی اور---''

''جی ہاں' یہ تو کل کی سی بات ہے۔''

''کنول صاحبہ! ذرا سوچ کر بتائیں فون کرنے والی نے کیا اطلاع دی تھی؟''

اس نے ملزم عاصم کے بیان کے مطابق تصدیق کر دی۔ اس کا مطلب تھا' واقعی کسی نے فون کے ذریعے واردات کی اطلاع دی تھی مگر وہ کون تھی' یہ معلوم ہونا ابھی باقی تھا۔ میں نے کنول سے پوچھا۔

''کنول صاحبہ! چند لمحوں کیلئے یہ تصور کر لیں کہ آپ اس وقت میرے آفس میں جاب کے سلسلے میں انٹرویو دینے آئی ہیں اور میں آپ کی یادداشت کو پرکھ رہا ہوں۔ ہر سوال کا جواب خوب سوچ سمجھ کر دیجئے گا۔'' میں نے خاص طور پر محسوس کیا کہ جج میرے انداز جرح میں دلچسپی لے رہا تھا۔

''میں پوری طرح تیار ہوں' آپ سوالات کیجئے۔'' کنول کے لہجے سے اعتماد جھلک رہا تھا اور چہرے پر سنجیدگی طاری تھی۔

''واردات کی اطلاع دینے والی خاتون کی آواز آپ نے پہلے بھی کہیں سنی تھی؟''

''جی نہیں۔'' وہ قطعیت سے بولی۔ ''نہ اس سے پہلے اور نہ اس کے بعد۔''

میں نے پوچھا۔ ''آج آپ نے ناشتے میں کیا لیا تھا؟''

''دو سلائس' ایک کپ چائے--- اس سے آدھا گھنٹہ قبل ایک پلیٹ سلاد۔''

''پچھلے بدھ کو آپ نے رات کو کھانے میں کیا کھایا تھا؟''

''چکن بریانی۔''

''وقوعہ کے روز آپ نے کون سا لباس پہن رکھا تھا؟''

''چوڑی دار پائجامہ اور بھوپالی کرتہ۔''

میں نے پوچھا۔ ''اس روز ملزم عاصم درانی نے کیا پہنا ہوا تھا؟''

اس نے میری توقع سے زیادہ جلدی جواب دیا۔ ''ٹو پیس' ٹھنڈا سوٹ۔ انگوری کلر کا۔''

''جب ملزم عاصم لنچ سے واپس آیا تھا تو کیا اس وقت بھی اس کے جسم پر وہی انگوری سوٹ تھا؟''

''نہیں۔'' وہ دو ٹوک لہجے میں بولی۔ ''مجھے اچھی طرح یاد ہے' اس وقت انہوں

نے آفوائٹ سفاری سوٹ پہنا ہوا تھا۔"

"تھینک یو' آپ انٹرویو میں پاس ہو گئی ہیں مس کنول۔" میں نے جیب سے وزیٹنگ کارڈ نکال کر اسے دیتے ہوئے کہا۔ "جب اس مقدمے کا فیصلہ ہو جائے تو آپ کسی بھی وقت جوائن کر سکتی ہیں۔"

وکیل صفائی عجیب سی نظروں سے کبھی مجھے اور کبھی اپنے گواہ کو دیکھ رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں نے کنول سے جو ڈرامائی گفتگو کی تھی' اس سے میرا مقصد کیا تھا اور میں اسے کس کے حق میں اور کس کے خلاف استعمال کرنا چاہتا تھا۔ میں نے وکیل مخالف کی جھنجلاہٹ اور پریشانی کو نظرانداز کرتے ہوئے جج کو مخاطب کیا۔

"یور آنر' اب ملزم کو عدالت کے کمرے میں بلایا جا سکتا ہے۔"

جج کی ہدایت پر عاصم درانی کو اندر لا کر ملزموں کے کٹہرے میں کھڑا کر دیا گیا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے میرے اور کنول کے درمیان کیا سوال و جواب ہو چکے ہیں اس لئے وہ خاصا مطمئن نظر آ رہا تھا۔ میں نے جج سے اجازت لی اور جرح کیلئے کٹہرے کے پاس چلا گیا۔

"عاصم درانی صاحب!" میں نے کہا۔ "آپ نے معزز عدالت کو بتایا تھا کہ جس وقت آپ کی بیوی کی موت واقعہ ہوئی اس وقت آپ اپنے ایک دوست کامران مرزا کے ساتھ شیزان میں لنچ تناول کر رہے تھے پھر آپ نے اپنے بیان کے ثبوت کے طور پر کامران مرزا کو گواہی کیلئے عدالت میں بھی پیش کیا اور جو نتیجہ برآمد ہوا' وہ بھی آپ کے سامنے ہے۔ آپ عدالت کو بتانا پسند کریں گے کہ آپ نے ایسا کیوں کیا؟"

وہ قدرے شرمندہ لہجے میں بولا۔ "مجھ سے غلطی ہو گئی تھی۔"

"کیا غلطی ہو گئی تھی؟" میں نے پوچھا۔ "کامران مرزا کے ساتھ لنچ کر کے آپ نے غلطی کی تھی یا جعلی گواہ پیش کر کے۔ ذرا اپنی بات کی وضاحت کریں؟"

"میں غلط بیانی پر سخت نادم ہوں۔" وہ جج کی جانب دیکھتے ہوئے بولا۔ "دراصل میں اس روز اکیلا ہی لنچ پر گیا تھا مگر چوں کہ عدالت میں بیان دے چکا تھا کہ کامران مرزا کے ساتھ لنچ پر گیا تھا اس لئے میری ہدایت پر میرے وکیل کو جعلی گواہ پیش کرنا پڑا۔"

میں نے جج کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "جناب عالی' ملزم کے نئے پینترے کو نوٹ کیا جائے۔"

پھر عاصم درانی سے پوچھا۔ "ابھی ابھی آپ نے فاضل عدالت کو بتایا کہ وقوعہ کے روز آپ اکیلے ہی لنچ کرنے گئے تھے مگر آپ کی سیکریٹری اس بات کی گواہ ہے کہ مذکورہ روز دفتر سے نکلتے وقت آپ نے اسے بھی یہی بتایا تھا کہ کسی دوست کے ساتھ لنچ کرنے شیزان جا رہے ہیں؟"

وہ بری طرح سٹپٹا گیا۔ میں آہستہ آہستہ جال سمیٹ رہا تھا۔ میں نے دیکھا' اس کے چہرے پر خوف کے سائے لہرانے لگے تھے۔ چند لمحوں کے توقف کے بعد اس نے کہا۔

"مجھے یاد نہیں ہے کہ میں نے اپنی سیکریٹری سے ایسی کوئی بات کہی تھی۔"

اس کے لہجے سے واضح ہو رہا تھا کہ وہ صریحاً" جھوٹ بول رہا تھا۔ میں نے دیکھا۔ جج نے بھی اس کے لہجے کا کھوکھلا پن صاف محسوس کر لیا تھا۔

میں نے کہا۔ "عاصم صاحب' آپ کو تو یاد نہیں مگر یہ بات آپ کی سیکریٹری کو اچھی طرح یاد ہے۔"

"میں اس سلسلے میں کیا کر سکتا ہوں۔"

عاصم کی مایوسی کو بھانپتے ہوئے اس کا وکیل ایک مددگار کی حیثیت سے آگے بڑھا۔

"یور آنر' اس بات سے کیا فرق پڑتا ہے کہ میرے موکل نے اپنی سیکریٹری کو کیا بتایا تھا اور کیا نہیں بتایا تھا؟ وہ اپنی سیکریٹری کو رپورٹ کرنے کا پابند تو نہیں ہے۔"

میں نے اپنا رخ وکیل صاحب کی جانب کرتے ہوئے کہا۔ "اس بات سے بہت فرق پڑتا ہے میرے محترم دوست!" پھر جج کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "جناب عالی! یہ بات عدالت کے ریکارڈ پر آ چکی ہے کہ ملزم جرح کے دوران میں کئی مرتبہ دروغ گوئی سے کام لے چکا ہے۔ ابھی میں اپنے سوالات سے اس کے مزید کئی جھوٹ منظر عام پر لانا چاہتا ہوں۔ میری فاضل عدالت سے درخواست ہے کہ وہ وکیل صفائی کو حکم دے کہ وہ مقدمے کی کارروائی میں رکاوٹ ڈالنے کی کوشش نہ کریں۔ اس سے ان کا کچھ بھلا نہیں ہو گا۔ صرف معزز عدالت کا وقت ہی ضائع ہو گا۔"

جج نے وکیل صفائی کو مداخلت سے پرہیز کی تلقین کر کے مجھ سے کہا۔ "آپ اپنی جرح جاری رکھیں بیگ صاحب۔"

میں نے کٹہرے میں کھڑے معصوم صورت مگر بدصورت عاصم درانی سے پوچھا۔ ”آپ نے اپنے بیان میں ایک جگہ بتایا تھا کہ آپ وقوعہ کے روز دو بجے دفتر سے نکلے تھے اور آپ کی واپسی تقریباً ڈیڑھ گھنٹے بعد یعنی ساڑھے تین بجے واپسی ہوئی تھی؟“

”جی ہاں' میں نے یہی بیان دیا تھا۔“

میں نے اچانک پوچھا۔ ”آپ نے اس روز کون سا لباس پہن رکھا تھا؟“

اس نے بوکھلا کر میری جانب دیکھا پھر لکنت زدہ لہجے میں بولا۔ ”اس۔۔ اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟“

جج نے اسے ڈانٹ پلائی۔ ”مسٹر عاصم آپ سوال نہ کریں۔ آپ سے جو کچھ پوچھا جا رہا ہے' اس کا جواب دیں۔“

وہ گھبراہٹ آمیز انداز میں بولا۔ ”میں نے اس روز۔۔ میں نے۔۔۔“

صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ کچھ کہنا چاہ رہا تھا مگر تذبذب کا شکار تھا۔ میں نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ ”اچھی طرح سوچ کر بتائیں۔ آپ کے جواب کی بڑی اہمیت ہے۔“

اس نے خشمگیں نظروں سے اپنی سیکریٹری کی جانب دیکھا۔ وہ کنول کے بیان سے بے خبر تھا۔ اس لئے کچھ زیادہ ہی الجھا ہوا تھا۔ جج نے اسے گھورتے ہوئے سخت لہجے میں کہا۔ ”مسٹر عاصم' تمہارے کئی جھوٹ ریکارڈ پر آ چکے ہیں۔ اگر تم نے مزید جھوٹ بول کر عدالت کا وقت ضائع کرنے کی کوشش کی تو تمہارے ساتھ سخت ترین سلوک کیا جائے گا۔“

وہ مریل سی آواز میں گویا ہوا۔ ”میں نے اس روز لائٹ گرین کلر کا سوٹ پہنا ہوا تھا۔“

”سوٹ کی وضاحت کریں؟“

”کیا مطلب؟“

میں نے اسے مطلب سمجھاتے ہوئے کہا۔ ”عاصم درانی صاحب' ہمارے ملک میں مختلف قسم کے سوٹ پہنے جاتے ہیں۔ مثلاً شلوار سوٹ' سفاری سوٹ' پینٹ کوٹ سوٹ۔۔۔“

وہ میری بات مکمل ہونے سے پہلے ہی بول اٹھا۔ ”میں نے ٹو پیس پینٹ کوٹ پہن

رکھا تھا۔“

میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ ”جب آپ لنچ سے واپس آئے تو آپ کے بدن پر آف وائٹ سفاری سوٹ تھا۔“

اس کے چہرے پر سرسوں کھل اٹھی۔ وہ چیخ سے مشابہ آواز میں بولا۔ ”یہ جھوٹ ہے۔“

”یہ سچ ہے مسٹر عاصم۔“ میں نے بھی جواباً اونچی آواز میں کہا۔

”آپ کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔“ وہ آپے سے باہر ہونے لگا۔ ”آپ نے خواب میں دیکھ لیا ہو گا۔“

میں نے اس کے بد اخلاق لہجے کا برا منائے بغیر کہا۔ ”عاصم صاحب' میں نے کوئی خواب نہیں دیکھا بلکہ یہ بات آپ کی سیکریٹری نے معزز عدالت کو بتائی ہے۔“

اس کا غصہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ اس نے پہلے خونخوار نظروں سے کنول کو گھورا پھر نسبتاً ہموار لہجے میں بولا۔ ”کنول کو کوئی غلط فہمی ہو گئی ہو گی۔ میں وقوعہ کے روز پورا دن ایک ہی سوٹ میں رہا تھا۔“

میں نے سوال کیا۔ ”کنول کو آپ سے کیا دشمنی ہو سکتی ہے؟“

”کوئی نہیں۔“

”پھر وہ جھوٹ کیوں بولنے لگی؟“

وہ روکھے لہجے میں بولا۔ ”یہ معلوم کرنا آپ کا کام ہے۔“

”چلیں ہم ہی معلوم کر لیتے ہیں۔“ میں نے ذومعنی انداز میں کہا۔ ”آپ یہ بتائیں کہ وقوعہ کے روز تین سوا تین بجے کہاں تھے؟“

وکیل صفائی نے اپنی فیس حلال کرنے کیلئے آخری زور مارا۔ اس نے جج کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”جناب عالی' میرے فاضل دوست میرے موکل کے ساتھ سخت زیادتی کر رہے ہیں۔ اپنے بے تکے سوالات سے اسے بار بار ٹارچر کر رہے ہیں۔ جب سے اس مقدمے کی سماعت شروع ہوئی ہے اس وقت سے اب تک بیسیوں بار یہ بات دہرائی جا چکی ہے کہ میرا موکل وقوعہ کے روز دوپہر دو بجے سے ساڑھے تین بجے تک لنچ میں مصروف تھا۔ اسی دوران میں اس کے گھر میں مسلح ڈاکوؤں نے۔۔۔“

جج نے ہاتھ کے اشارے سے اسے منع کرتے ہوئے کہا۔ "اب اس تفصیل کی ضرورت نہیں ہے" پھر مجھ سے کہا۔ "بیگ صاحب آپ بھی غیر ضروری سوالات سے پرہیز کریں اور ٹو دی پوائنٹ جرح کریں۔"

"رائٹ یو آر یور آنر!" میں نے مودب لہجے میں کہا۔ "بیسیویں بار کے دہرائے ہوئے اس سوال کو جھٹلانے کیلئے میرے پاس ٹھوس ثبوت موجود ہے۔ میں فاضل عدالت سے استدعا کرتا ہوں کہ مجھے آخری بار یہ سوال پوچھنے کا موقع دیا جائے۔"

جج نے اجازت دے دی۔ میں نے کٹہرے میں کھڑے عاصم درانی سے پوچھا۔ "کیا آپ معزز عدالت کو بتائیں گے کہ وقوعہ کے روز آپ دوپہر کے تین سوا تین بجے کہاں تھے؟"

وہ بے دھڑک بولا۔ "میں اس وقت شیزان میں تھا۔"

"آپ اسموکنگ کرتے ہیں؟"

اس نے اثبات میں جواب دیا' میں نے پوچھا۔ "آپ کا برانڈ؟"

"ٹرپل فائیو۔"

"یعنی پانچ سو پچپن؟"

وہ بیزاری سے بولا۔ "ٹرپل فائیو کا مطلب پانچ سو پچپن ہی ہوتا ہے' ویسے آپ جو چاہیں مطلب نکال لیں۔ آپ وکیل ہیں۔ ایسے کاموں میں خاصی مہارت رکھتے ہیں۔"

میں نے اس کے لہجے کے طنز کو نظرانداز کرتے ہوئے پوچھا۔ "آپ عبدالشکور نامی کسی شخص کو جانتے ہیں؟"

"کون عبدالشکور؟"

"لکی کولڈ اسپاٹ تو آپ کیلئے اجنبی نہیں ہو گا؟"

وہ کچھ دیر سوچنے کے بعد بولا۔ "ہاں یاد آیا۔ یہ میرے گھر کے قریب ہی ہے۔ اسٹریٹ کے کارنر' مین روڈ کے نزدیک۔"

"ٹھیک فرمایا۔" میں نے کہا۔ "عبدالشکور لکی کولڈ اسپاٹ کا مالک ہے۔"

"تو میں کیا کروں؟"

"آپ کچھ نہ کریں۔" میں نے خفیف مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "مسٹر عبدالشکور کا دعویٰ ہے کہ وقوعہ کے روز آپ نے دوپہر تین اور سوا تین بجے کے درمیان اس کی دکان سے ٹرپل فائیو سگریٹ کا ایک پیکٹ خریدا تھا۔"

وہ روا روی میں کہہ گیا۔ "تو اس میں پریشانی کی کیا بات ہے۔ میں تو اکثر اس کی دکان سے سگریٹ خریدتا رہتا ہوں۔ ہاں البتہ مجھے یہ معلوم نہ تھا کہ اس کا نام عبدالشکور ہے۔"

"اکثر وہاں سے سگریٹ خریدنے کی بات اور ہے مسٹر عاصم درانی۔" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سرسراتی آواز میں کہا۔ "وقوعہ کے روز مذکورہ وقت پر آپ کا جائے واردات کے نزدیک پایا جانا غیر معمولی بات ہے۔ خصوصاً ایسی صورت میں کہ جب آپ اسی وقت کے دوران میں شیزان میں لنچ کر رہے تھے۔"

اسے فوراً اپنی غلطی کا احساس ہو گیا' بات بناتے ہوئے بولا۔ "ہو سکتا ہے عبدالشکور کو مغالطہ ہوا ہو۔ میں چوں کہ اکثر اس سے سگریٹ لیتا رہتا ہوں اس لئے اس نے فرض کر لیا کہ وقوعہ کے روز بھی میں نے اس سے ٹرپل فائیو کا پیکٹ خریدا تھا۔"

"بات فرض کرنے کی نہیں ہے مسٹر عاصم!" میں نے بدستور سخت لہجے میں کہا۔ "عبدالشکور کو اچھی طرح یاد ہے کہ اس روز آپ بہت جلدی میں تھے اور آپ نے بقایا پیسے بھی نہیں لئے تھے۔ سو کا نوٹ دے کر گاڑی آگے بڑھا دی۔ اس وقت آپ اپنے بنگلے سے نکل کر آئے تھے۔ عبدالشکور نے بھی آپ کو آواز دینا مناسب نہیں سمجھا اور سوچا جب آپ رات کو اس کی دکان کے پاس سے گزر کر گھر جائیں گے تو وہ بقایا پیسے آپ کو دے دے گا لیکن پھر اسی روز وہاں پولیس پہنچ گئی۔ وہ اتنا بڑا واقعہ تھا کہ عبدالشکور کو مغالطہ ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ آپ معزز عدالت کو بتائیں گے کہ جس وقت آپ کی بیوی کو قتل کیا گیا اس وقت آپ جائے وقوعہ پر کیا کر رہے تھے؟"

اچانک ایسی صورتحال پیدا ہو گئی کہ عدالت کے کمرے میں موجود ہر شخص پوری توجہ سے ملزم عاصم درانی کو دیکھ رہا تھا اور اس کے جواب کا منتظر تھا۔ اس موقع پر وکیل صفائی خاصا مایوس نظر آ رہا تھا۔

عاصم کی آواز کسی گہرے کنوئیں سے آتی ہوئی محسوس ہوئی۔ "میری تو سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ میں شیزان میں--"

"آپ ایک ہی بات دہرائے جائیں گے کہ وکیل صاحب کے سوال کا درست جواب بھی دیں گے۔" جج نے اسے ٹوک دیا۔

میں نے کہا۔ "عبدالشکور کا کہنا ہے کہ آپ اس وقت آف وائٹ سفاری سوٹ پہنے ہوئے تھے؟"

وہ برسوں کا بیمار نظر آنے لگا۔ جج نے وکیل صفائی سے پوچھا۔ "آپ اس سلسلے میں کچھ کہنا چاہتے ہیں؟"

وہ مایوسی سے سر ہلا کر بولا۔ "میں اپنے موکل سے تنہائی میں بات کرنا چاہتا ہوں۔"

جج نے مجھ سے استفسار کیا۔ "وکیل صاحب آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں ہے؟"

"مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے جناب عالی۔" میں نے کہا۔ "یہ موکل اور وکیل کا قانونی حق ہے۔ وہ آپس میں کسی بھی وقت صلاح و مشورہ کر سکتے ہیں مگر اس سلسلے میں میری چھوٹی سی ایک درخواست ہے۔"

"وہ کیا بیگ صاحب؟"

میں نے کہا۔ "اس وقت عدالت کے کمرے میں گواہ عبدالشکور بہ نفس نفیس موجود ہے۔" میرے اس انکشاف پر ملزم عاصم درانی نے گردن گھما کر کمرے میں موجود افراد پر نگاہ دوڑائی پھر اس کی نظر عبدالشکور پر جا کر ٹھہر گئی۔ اس سے پہلے شاید وہ پریشانی میں اس طرف توجہ نہیں دے سکا تھا۔

جج نے سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھا تو میں نے کہا۔ "میں چاہتا ہوں کہ ملزم اور وکیل صفائی کی خفیہ ملاقات سے پہلے گواہ عبدالشکور کا بیان لے لیا جائے کیونکہ یہ غریب آدمی اپنا کام دھندا چھوڑ کر صبح سے ہمارے ساتھ خوار ہو رہا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اسے فارغ کر دیا جائے۔"

میری درخواست معقول تھی۔ جج نے فوراً عبدالشکور کا بیان ریکارڈ کروا لیا۔ اس نے تمام باتوں کی تصدیق کر دی جو میں نے جرح کے دوران میں ملزم پر منکشف کی تھیں۔ اس کا بیان ختم ہوا تو جج نے وکیل صفائی سے پوچھا۔

"آپ گواہ پر جرح کرنا چاہتے ہیں؟"

وکیل صفائی نے جواب دیا۔ "پہلے میں ملزم عاصم درانی سے تنہائی میں ملاقات کرنا چاہتا ہوں۔"

اس کے ساتھ ہی عدالت کا وقت ختم ہو گیا۔ جج نے پیش کار کو ہدایت کر دی کہ آئندہ روز ہمارے کیس کا نمبر شروع میں رکھے اور ایک روز بعد پیشی کی تاریخ دے دی۔

"چلیں وکیل صاحب، آپ کا مسئلہ تو حل ہو گیا۔" میں نے وکیل مخالف کی جانب دیکھتے ہوئے پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "آپ کو اپنے موکل سے راز و نیاز کرنے کیلئے پورا دن مل گیا ہے۔ اب یہ جیل والوں کی مہربانی پر منحصر ہے کہ وہ آپ کو کتنا وقت دیتے ہیں۔"

اس نے کوئی جواب نہیں دیا اور اپنی فائلیں سنبھالتے ہوئے ملزم عاصم درانی کے پیچھے پیچھے عدالت کے کمرے سے باہر نکل گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد جب ہم برآمدے میں آئے تو میں نے جیل کی گاڑی کے قریب وکیل اور موکل دونوں کو آپس میں باتیں کرتے ہوئے دیکھا۔ میں ان کے قریب سے گزر کر اپنی گاڑی کی جانب بڑھ گیا۔

رمضانی صاحب نے کہا۔ "بیگ صاحب، آپ تو اپنے دفتر جائیں گے۔"

"ظاہر ہے۔" میں نے جواب دیا۔ "ویسے بھی عدالت کا وقت ختم ہو چکا ہے۔ یہاں کیا کام؟"

"کل کا کیا پروگرام ہے؟ میرا مطلب ہے، اس کے علاوہ تو آپ کا کوئی اور کیس زیر سماعت نہیں ہے؟"

میں نے کہا۔ "ایک دیوانی کیس کی کل تاریخ ہے مگر میں صبح آتے ہی بعد کی کوئی تاریخ لے لوں گا۔ آپ فکر نہ کریں۔ یہ کیس زیادہ اہم ہے اور پھر یہ اپنے اختتامی مراحل میں بھی داخل ہو چکا ہے۔"

"ٹھیک ہے، آپ دفتر جائیں، میں عبدالشکور کو چھوڑتا ہوا گھر چلا جاؤں گا۔"

میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "عبدالشکور کا خاص خیال رکھئے گا رمضانی

صاحب۔ فی زمانہ سچی گواہی دینے والے لوگ ناپید ہوتے جا رہے ہیں۔ آپ نے اپنی آنکھوں سے مرجا صاحب کا حال بھی دیکھ لیا۔ عبدالشکور جیسے افراد کی ہم سب کو حوصلہ افزائی کرنا چاہئے۔"

"مجھے اس بات کا خیال ہے۔" رمضانی صاحب نے کہا پھر مجھ سے ہاتھ ملا کر وہاں سے رخصت ہو گئے۔

میں نے اپنے دفتر کا رخ کیا۔

○

آئندہ روز عدالت میں خاصا رش تھا مگر وکیل صفائی کے چہرے پر بارہ بج رہے تھے۔ مجھے اس کی حالت دیکھ کر افسوس بھی ہوا مگر میں اس کی خاطر کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ مجھے سچ کا ساتھ دیتے ہوئے اپنے موکل کی وکالت کرتے ہوئے قانون کی سربلندی قائم رکھنا تھی۔ میں اپنے فرض سے مجبور تھا اور اپنے پیشے کے تقاضوں کو پورا کرنا چاہتا تھا۔

عدالتی کارروائی کا آغاز ہوا۔ سب سے پہلے وکیل صفائی نے گواہ عبدالشکور سے دو چار رسمی سوالات کئے پھر کسی ہارے ہوئے جواری کی طرح اپنی سیٹ پر آ کر بیٹھ گیا۔

میں نے اپنی جگہ سے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ "یور آنر‘ تمام حالات و واقعات معزز عدالت کے علم میں ہیں۔ ملزم کی ذات قدم قدم پر مشکوک ہو چکی ہے۔ اس نے کئی مرتبہ دروغ گوئی کا سہارا لے کر قانون کی نظروں میں دھول جھونکنے کی کوشش کی ہے جس سے فاضل عدالت کا قیمتی وقت بھی ضائع ہوا ہے اور مقدمے کی کارروائی میں بھی دشواریاں پیدا ہوئی ہیں۔"

میں نے ایک لمحے کو رک کر سانس لیا پھر اپنے دلائل جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "جناب عالی‘ اب یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہو چکی ہے کہ مقتولہ فضیلہ کا قاتل اس کا شوہر ہی ہے۔ جب اس نے دیکھا کہ گھی سیدھی انگلی سے نہیں نکل رہا تو اس نے انگلی ٹیڑھی کرنے کا فیصلہ کر لیا۔"

وکیل صفائی نے ایک کمزور سا اعتراض اٹھایا۔ "آبجیکشن یور آنر‘ میں وکیل استغاثہ کی اس دلیل کو نہیں مانتا کہ میرے موکل نے اپنی بیوی کی دولت و جائیداد حاصل کرنے کیلئے اس کے خون میں ہاتھ رنگ ڈالے۔ وہ مقتولہ کا مجازی خدا تھا‘ اس کی ہر چیز کا مالک و مختار تھا۔ اسے بھلا اتنا سنگین قدم اٹھانے کی کیا ضرورت تھی؟"

میں نے کہا۔ "یور آنر‘ ملزم عاصم درانی قانونی اور شرعی طور پر مقتولہ کا شوہر ضرور تھا مگر اس کی دولت و جائیداد پر اسے تصرف حاصل نہیں تھا۔ بنگلہ‘ گاڑی‘ کاروں کا شو روم اور تمام بینک بیلنس مقتولہ کے نام تھا جو چیزیں اس کی والدہ سلطانہ کے نام تھیں‘ اس کی وفات کے بعد خود بہ خود۔۔ مقتولہ کی ملکیت میں آ گئی تھیں۔ ملزم کی حیثیت فضیلہ کی نظروں میں ایک گھر داماد سے زیادہ کچھ نہیں تھی جس کے بارے میں دھوبی کے کتے کی مثال عموماً دی جاتی ہے جو نہ گھر کا ہوتا ہے اور نہ گھاٹ کا۔"

میں نے ذرا سا توقف کیا پھر اپنا بیان جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "یور آنر‘ مقتولہ فضیلہ شادی کے فوراً بعد ہی ملزم کی لالچی طبیعت کو سمجھ گئی تھی اور اس کے عزائم کو بھی اس نے بھانپ لیا تھا۔ اس لئے وہ ایک لمحے کیلئے بھی اس پر اعتبار کرنے کو تیار نہیں تھی۔ دوسری جانب جب ملزم نے اپنا کھیل بگڑتے دیکھا تو غصے میں آگ بگولا ہو گیا۔ اس نے اپنا مقصد حاصل کرنے کیلئے اس خاندان کی خدمت میں شب و روز ایک کر دیئے تھے۔ اسے اپنی محنت پر پانی پھرتا ہوا نظر آ رہا تھا چنانچہ اس نے اپنے راستے کی رکاوٹ کو دور کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ فضیلہ اگر اس کے راستے سے ہٹ جاتی تو ملزم کے دل کی مراد پوری ہو سکتی تھی۔

"ملزم نے بڑی ہوشیاری سے منصوبہ سازی کی تھی اور مسلح ڈکیتی کا ایک کامیاب ڈرامہ رچایا تھا۔ وہ دفتر سے دو بجے لنچ کا کہہ کر اٹھا۔ سیدھا اپنے گھر پہنچا‘ بیوی کو شوٹ کیا۔ جب اسے یقین ہو گیا کہ وہ مر چکی ہے تو اس نے بیڈ روم میں کچھ اس قسم کی افراتفری پھیلا دی کہ وہ مسلح ڈاکوؤں کی کارستانی نظر آئے پھر فضیلہ کے بیڈ روم میں سے طلائی زیورات اور نقدی بھی غائب کر دی تا کہ اس ڈرامے میں

حقیقت کا رنگ بھرا جا سکے۔ اس دوران میں اس نے دیکھا کہ اس کا لباس بھی خون آلود ہو چکا ہے۔ اس نے نہایت اطمینان سے انگوری رنگ کا سوٹ اتار کر آف وائٹ سفاری سوٹ پہن لیا۔ پھر دفتر کی جانب روانہ ہو گیا۔ اسٹریٹ کے کونے پر واقع لکی کولڈ اسپاٹ سے اس نے سگریٹ کا پیکٹ خریدا اور ساڑھے تین بجے دفتر پہنچ گیا۔

"اس کے بعد جو کچھ ہوا' وہ سب کے سامنے ہے۔"

میرا طویل بیان ختم ہوا تو جج نے سوال کیا۔ "آلہ قتل' زیورات' نقدی اور خون آلود سوٹ کہاں گئے؟ پولیس کے چالان میں اس کا کہیں ذکر نہیں ہے۔"

"مذکورہ چیزیں برآمد کرنا میرے فرائض میں شامل نہیں ہے یور آنر!" میں نے نہایت ہی ادب سے کہا۔ "ملزم جوڈیشل ریمانڈ پر جیل کسٹڈی میں ہے۔ پولیس چاہے تو کیا کچھ نہیں ہو سکتا۔"

جج نے متعلقہ عدالتی عملے کو ہدایت دی کہ وہ ملزم کے بنگلے اور دفتر کے ایک ایک کونے کی تلاش کا انتظام کرے اور غیر معینہ مدت کیلئے عدالت برخاست کر دی۔

تیسرے روز پوشیدہ چیزوں کی تلاش کے ماہرین کی ایک ٹیم نے اعشاریہ دو پانچ کا سلم ماڈل پسٹل' نقدی ساٹھ ہزار روپے' لائٹ گرین کلر کا ٹو پیس ٹھنڈے کپڑے کا خون آلود سوٹ اور طلائی زیورات کا کھوج لگا لیا۔ تمام چیزوں کو سیلوفین تھیلی میں نہایت مہارت سے محفوظ کر کے بنگلے کے اندر گراؤنڈ واٹر ٹینک میں پھینک دیا گیا تھا۔

سلم ماڈل چھپے پسٹل کو کیمیائی تجزیے کیلئے دوسرے روز لیبارٹری بھیج دیا گیا۔

لیبارٹری رپورٹ سراسر ملزم عاصم درانی کے خلاف جاتی تھی۔ پسٹل پر پائے جانے والے انگلیوں کے نشانات ملزم کے فنگر پرنٹس سے میچ کر گئے تھے۔ کیمیائی تجزیے سے یہ بات ثابت ہو گئی تھی کہ جن گولیوں سے مقتولہ فضیلہ کی موت واقع ہوئی تھی وہ اسی پسٹل سے چلائی گئی تھیں۔ ان حالات و شواہد کی روشنی میں دنیا کی کوئی قوت عاصم درانی کو پھانسی کے پھندے سے نہیں بچا سکتی تھی۔

اگلی پیشی پر جج نے تمام چیزیں ملزم کو دکھاتے ہوئے پوچھا۔ "تم اپنی صفائی میں کچھ کہنا چاہتے ہو؟"

عاصم درانی کیلئے فرار کے تمام راستے مسدود ہو چکے تھے۔ اپنے جرم کے اعتراف کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ اس نے اقبال جرم کر لیا۔

جج نے پوچھا۔ "وہ پراسرار خفیہ فون تم نے کس سے کروایا تھا؟"

اس نے کوئی جواب نہیں دیا' گردن جھکائے خاموش کھڑا رہا۔ کئی بار کے استفسار کے بعد بھی جب اس نے زبان نہیں کھولی تو جج نے دو روز بعد فیصلے کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کر دی۔

اب اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا کہ وہ خفیہ اطلاع کس عورت نے دی تھی۔ ملزم اپنے جرم کا اقبال بھری عدالت میں جج کے روبرو کر چکا تھا۔ اب وہ محض ملزم نہیں رہا تھا بلکہ مجرم ثابت ہو چکا تھا۔ آئندہ پیشی پر عدالت نے اسے پچیس سال کی سزائے قید سنا دی۔

اردو ڈاٹ کام